در شہرِ دوستداراں
(یادنامۂ کراچی)
انیس اشفاق

انیس اشفاق

سرورق : نور یاب نکہت
پہلی اشاعت : ۲۰۱۶ء
ناشر : انیس اشفاق
قیمت : ۴۰۰ روپے
تعداد : ۴۰۰
جائے فروخت : ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
دانش محل لکھنؤ

DAR SHAHR-E-DOSTDARAN
(Yaadnama-e-Karachi)
By
Anis Ashfaq

'گل زمین' ۴/۱۵۸، وپل کھنڈ۔ گومتی نگر۔ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۰
رابطہ: 09451310098
ای میل: s.anisashfaq@gmail.com

یارانِ پاک شعاراں
کے نام

یہ کتاب
فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔
اس کتاب کے مندرجات سے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

دوردستاں را بہ احساں یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند

It is good to have an end to journey.
but it is the journey that matters
in the end

Ursula K. Leguin
The Left hand of darkness 1969

فہرست

کون ہے مجھ میں جو کھینچے لیے جاتا ہے مجھے

(۱)

پچاس کے دہے کے آخری سالوں کا ایک مہینہ اور اس مہینے کا کوئی دن۔ ٹھیک ٹھیک یاد اس لیے نہیں کہ عمر اس وقت میری پانچ یا چھ سال کی تھی۔ پرانے لکھنؤ کا ایک بہت بڑا مکان جس میں دالان تھے، صحنچیاں تھیں، بڑے بڑے کمرے تھے، ایک کشادہ صحن تھا اور ایک طرف ایک بہت بڑا امام باڑہ۔ اس بہت بڑے مکان کا مالک طب کے پیشے میں اپنی مہارت کے لیے دور دور تک مشہور تھا۔ قدیم لکھنؤ کی شاہ راہ پر واقع اس مکان میں لکھنؤ کے بڑے شاعر، ادیب اور طبیب روز جمع ہوتے لیکن ایک دن.........اس بہت بڑے، بہت قدیمی اور بہت مشہور مکان کے بہت بڑے پھاٹک کے آگے محلّے کے لوگوں نے کئی تانگے کھڑے دیکھے۔ پھر دیکھا کہ مکان کے اندر سے بڑے بڑے صندوق لا کر ان تانگوں پر رکھے جا رہے ہیں اور اس کے بعد یہ بھی دیکھا کہ مکین اس مکان کے اپنے عزیزوں سے بغل گیر ہو کر بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ان تانگوں پر بیٹھ رہے ہیں۔ اندر اس مکان کے میں اپنی ماں کی انگلی پکڑے اسے روتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ وہ کبھی کسی سے گلے مل کر اپنے آنسو پونچھ رہی ہے اور کبھی کسی کو سینے سے لگا کر زیرِ لب کچھ پڑھ رہی ہے۔ ایک کشتی میں بہت سے امام ضامن رکھے ہیں جنہیں تانگے پر بیٹھنے

والوں کے بازوؤں پر باندھا جا رہا ہے۔ جب سارے لوگ تانگوں پر بیٹھ چکے اور تانگے سڑک پر آ کر ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور جب اس بہت بڑے مکان کا پھاٹک بند کر دیا گیا، تب میں نے آنسو بہاتی ہوئی اپنی ماں سے پوچھا:

''سب کہاں گئے؟''

وہ بولی: ''پاکستان۔''

''یہ کہاں ہے؟''

''یہاں سے بہت دور۔''

یہ کہہ کر اس نے میرے منہ پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کر دیا۔

....

وہ مکان زمانہ ہوا اپنی شکل بدل چکا ہے اور اس کے مالک نے دور کے شہر کراچی میں اپنا گھر بنا لیا ہے۔ ایک دن اپنے بنائے ہوئے گھر میں اس نے اسی شہر میں بسے ہوئے اس بہت بڑے شاعر کو بلایا جو اُس کے دل کے بہت قریب تھا اور لکھنؤ سے ملی ہوئی آموں کی بستی سے اس دور کے شہر میں یادوں کی برات اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میز بان اپنے گھر کے دروازے پر جب اُس مہمان سے ہم آغوش ہوا تو اُس شاعر نے کان میں اُس کے ایسی بات کہی کہ وہ بہت دیر تک ہنستا رہا اور ہنستے ہنستے اُسی شاعر کی بانہوں میں اس کا دم نکل گیا۔

بانہوں میں دم توڑنے والے اس آدمی کا نام تھا: حکیم صاحب عالم۔

اور مر جانے والے کے کان میں کچھ کہنے والا شخص تھا: شبیر حسن خاں جوش۔

(۲)

ساٹھ کے دہے کا آٹھواں سال۔ مہینہ اور دن اس برس کا بھی مجھے یاد نہیں۔ منظر وہی دس برس پہلے کا۔ اُسی مکان سے قریب کا ایک مکان۔ وہی تانگے، وہی صندوق، وہی امام ضامن، وہی بھیگی ہوئی آنکھیں۔ اب میں بڑا ہو چکا ہوں۔ اس بار گھر سے نکلنے والوں کی بات میں نے اپنی ماں سے نہیں پوچھی۔ اب مجھے معلوم ہے یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ پہلے کی طرح اس بار بھی ماں کی آنکھیں نم ہیں۔

میں اسٹیشن پر ہوں۔ جانے والوں کا سامان ریل کے ڈبّوں میں رکھوا رہا ہوں۔ گاڑی رینگ رہی ہے۔ ڈبّوں سے باہر کھڑے لوگ نم آنکھوں سے ہاتھ ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ میں گھر آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا ہوں۔ آنکھیں میری بغیر جھپکے چھت کو گھور رہی ہیں۔ پورے گھر میں سناٹا ہے۔ سب یوں بیٹھے ہیں جیسے گویائی سے محروم ہوں۔ گھر کو سنبھالے رہنے والی ایک بوڑھی گراں گوش خاتون جو گھر چھوڑ کر جانے والوں کی عزیز ہیں نہ خادمہ، میرے بستر کے قریب کھڑی ہیں، پوچھ رہی ہیں:

''سب کہاں گئے؟''

''پاکستان۔'' میں نے بہت اونچی آواز میں کہا۔

بہت دیر بعد انہوں نے لب کھولے، پوچھا:

''کب آئیں گے؟''

''جب آپ اس دنیا میں نہیں ہوں گی۔'' میں نے کہا اور چپ ہو گیا۔

●

صبح کا سورج اپنی روشنی چاروں طرف پھیلا چکا ہے۔ ستمبر کی دھوپ پوری طرح کھلی ہوئی ہے۔ ایک کتاب میرے ہاتھ میں ہے۔ ورق الٹ الٹ کر میں اسے دیکھ رہا ہوں اور اپنے گھر میں لگے درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرندوں کا شور سن رہا ہوں۔ مجھے یہ شور اچھا لگ رہا ہے۔ میرے درختوں کی ان شاخوں پر دور دور سے پرندے آکر بیٹھتے ہیں۔ کچھ پرندوں نے ان شاخوں پر اپنے آشیانے بنا لیے ہیں۔ کچھ اور پرندے کبھی کبھی ان آشیانوں کو اجاڑ دیتے ہیں لیکن پہلے والے پرندے انہیں جگہوں پر پھر اپنے ٹھکانے بنا لیتے ہیں اور یوں میرے درختوں کی شاخیں ہمیشہ آباد رہتی ہیں۔ اسی لیے میں نے ان درختوں کو جن میں پوری طرح پھل آتے ہیں نہ پھول، کبھی نہیں کٹوایا۔ پرندوں کا شور بڑھتا جا رہا ہے۔ اسی شور میں میری جیب میں رکھے ہوئے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی ہے۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ یہ بھی روز کے آنے والے ہما شما کے فونوں میں سے کسی کا فون ہوگا، موبائل کا بٹن دبا کر بے دلی سے ہیلو کہتے ہوئے جب اسے کان سے لگایا تو اُدھر سے آواز آئی:

''آداب آداب، حضور، سرکار۔ میرے آقا میرے مولا۔ خاکسار فراست۔

(میرے پینتالیس برس پرانے دوست کا یہ بہت جانا پہچانا طرزِ تخاطب ہے)

لیجیے بات کیجیے۔''

''جی انیس صاحب۔ سلام علیکم۔ میں احمد شاہ بول رہا ہوں۔'' اُدھر سے آواز آئی۔

''وعلیکم السلام۔''

''کانفرنس کا دعوت نامہ آپ کو بھیج دیا گیا ہے، سفر کی تیاری کریں۔''

اس آواز کے مخصوص آہنگ سے آزاد ہوتے ہی میں نے کہا:

''جی انشاءاللہ۔ ضرور۔''

''نام بہت سنا ہے آپ کا۔ آیئے تو ملاقات ہو۔''

''انشاءاللہ۔''

اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد فون اُدھر سے رکھ دیا گیا۔

شام ہوتے ہوتے احمد شاہ کے شہر سے ایک اور فون آیا۔ یہ میرے ہی شہر کی ایک خاتون زیبا علوی تھیں جن کا تعلق لکھنؤ کے ایک ذی شرف خانوادے سے ہے۔ انہوں نے پوچھا:

''آپ کو دعوت نامہ ملا؟''

''جی دن میں فون آیا تھا احمد شاہ صاحب کا، بھیج دیا ہے۔''

''بس تو پھر تیاری کریں۔ ہم سب یہاں آپ کے منتظر ہیں۔''

●

ویزا حاصل کرنے کے لیے وقت بہت کم ہے۔ بیچ میں کئی چھٹیاں پڑ رہی ہیں۔ میں نے گھبرا کر پروفیسر شمیم حنفی کو جو پاکستان کی ادبی تقریبوں میں برابر مدعو کیے جاتے ہیں، فون ملایا اور اپنی پریشانی بتائی۔

''گھبرائیے نہیں۔ میں ایک نمبر دے رہا ہوں۔ منظور علی میمن کا۔ یہ پاکستانی سفارت خانے میں اہم عہدے پر فائز ہیں۔ بہت اچھے آدمی ہیں، ان سے بات کیجیے۔''

میں نے دیے ہوئے نمبر پر فون ملایا۔

''کون صاحب؟'' اُدھر سے آواز آئی۔

میں نے اپنا تعارف کرایا۔ سفر کا مقصد بتا کر اپنی پریشانی بتائی۔

''جی مجھے معلوم ہے۔ پریشان نہ ہوں پروفیسر صاحب۔ ۹/(اکتوبر) تاریخ کو تشریف لائیں۔ ریسپشن پر جو شخص بیٹھا ہو، اسے میرا نام بتا دیں۔''

یہ سن کر دل کو اطمینان ہوا اور خوشی بھی اور حیرت اس بات پر ہوئی کہ وہ سفارتخانہ جس کے دروازے پاکستان جانے والوں پر بہ وجوہ آسانی سے نہیں کھلتے، وہاں کا ایک شخص ایسے خلوص اور اتنی مہربانی سے پیش آ رہا ہے۔

زندانِ محبت

میں حسبِ ہدایت ۹/اکتوبر کو صبح صبح پاکستانی سفارتخانے پہنچ گیا۔ پروفیسر قاضی افضال کو جو پہلے بھی اس کانفرنس میں شریک ہو چکے تھے اور اس برس پھر انہیں مدعو کیا گیا تھا، میں اپنے دہلی جانے کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ وہ بھی اسی تاریخ کو دہلی پہنچ رہے

تھے۔ میں نے دہلی پہنچتے ہی قاضی صاحب کوفون کیا۔ جواب ملا بس پہنچنے ہی والا ہوں۔ کچھ دیر بعد قاضی صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ آموجود ہوئے۔ ہم نے سفارت خانے کے اصل دروازے سے متصل ملاقات والے کمرے کی کھڑکی پر پہنچ کر اپنے نام بتائے۔ سننے والے نے احتراماً ہماری طرف دیکھا، دروازہ کھلوایا اور اندر بلا کر اس کمرے میں بڑے احترام سے ہمیں بٹھایا۔ وہاں کچھ اور مہمان بھی تھے۔ اس شخص نے جس نے ہمیں اندر بلا کر بٹھایا تھا، ہمیں بٹھانے کے بعد بڑے شائستہ لہجے میں کہا: ''آپ بیٹھیں، منظور صاحب ایک میٹنگ میں ہیں، جیسے ہی فرصت پائیں گے آپ کو اندر بلائیں گے۔''

ہم وہاں بیٹھ کر وقت گزاری کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد ایک دراز قد اور تنومند شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی فرانسیسی طرز کی ڈاڑھی اور سر کے بال دونوں سفید تھے۔ اپنی بھاری بھرکم شخصیت اور اپنی پاٹ دار آواز کے ساتھ اس شخص نے قاضی صاحب اور مجھ سے علیک سلیک کی۔ جواب دے کر ہم نے اسے دیکھنا شروع کیا اور دیکھا کہ چہرے پر اس کے ناگواری ہے۔ پھر میں نے اسے پہچانا اور بڑے تپاک سے اس سے ہاتھ ملایا۔ لفظ اس کے منہ سے نکلے تو اس کے لہجے سے قاضی صاحب نے بھی اسے پہچانا اور بولے:

''بھائی عبید۔ یہ کیا؟''

''جی۔ خضاب لگانا چھوڑ دیا ہے اور وزن بھی کچھ بڑھ گیا۔ اسی لیے شاید آپ لوگوں نے فوراً نہیں پہچانا۔'' میں نے سوچا: اسی فوری طور پر نہ پہچان پانے کی وجہ سے عبید کے چہرے پر ناگواری تھی۔ عبید کچھ دیر بیٹھے۔ پھر ویزا کی درخواست کے ساتھ اپنا پاسپورٹ اس شخص کو جس نے ہمیں بٹھایا تھا دے کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ میں شام تک آکر لے لوں گا۔

میں، قاضی صاحب اور ان کی اہلیہ اُس کمرے میں بیٹھے رہے، اور باتوں میں وقت گزارتے رہے۔ پھر اندر سے ہمارا بلاوا آیا۔ ہمیں آکر لے جانے والے لوگ سفارت خانے کی اندرونی عمارت کے ایک بہت بڑے اور خوش نما کمرے میں ہمیں بٹھا کر بولے:

''منظور صاحب ذرا مصروف ہیں، تھوڑی دیر میں آرہے ہیں۔''

قیمتی اور خوش رنگ صوفوں پر دراز ہو کر ہم نے پھر اِدھر اُدھر کی بات شروع کر دی۔

کچھ دیر بعد ایک خوش لباس شخص کمرے میں داخل ہوا اور بڑے تپاک سے ہماری طرف بڑھتے ہوئے کہا:

''السلام علیکم، منظور میمن۔''

ہم تینوں نے سلام کا جواب دے کر اپنا اپنا تعارف کرایا۔

''تشریف رکھیں۔ آپ علی گڑھ سے اور آپ لکھنؤ سے؟''

''جی''

''میں علی گڑھ بھی جا چکا ہوں اور لکھنؤ بھی۔ اور ایک پرانی کتاب کی تلاش میں جو اٹھارویں صدی کے بزرگ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی سے متعلق ہے، ندوۃ العلماء کا کتب خانہ بھی دیکھا ہے۔'' یہ بتا کر بولے:

''یہ ہمارے ہی خاندان کے بزرگ ہیں اور انہوں نے کلامِ پاک کے ۳۳ ویں پارے کا سندھی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔'' پھر ندوے کے کتاب خانے اور عملے کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

''بہت عمدہ کتب خانہ ہے۔ بڑی نایاب اور قیمتی کتابیں ہیں وہاں۔ جو مجھے چاہیے تھا وہ ان لوگوں نے خوشی خوشی فراہم کیا۔ بہت مہمان نواز لوگ ہیں۔''

پھر علی گڑھ اور لکھنؤ کی تعریفیں شروع کیں، علی گڑھ میں قیام کی باتیں بتائیں پھر اپنا سلسلۂ نسب اور اپنی جائے ولادت کا ذکر کیا۔ اسی درمیان چائے آ گئی۔ ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ ایک پیاری سی بچی کمرے میں داخل ہوئی۔

''یہ میری بیٹی ہے، سمیہ۔'' منظور صاحب نے کہا۔

ہم نے مسکراتے ہوئے مشفقانہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ دیر تک یہاں وہاں کی باتوں کے بعد ہماری درخواستیں اور پاسپورٹ لے کر منظور صاحب نے انہیں اپنے ماتحت کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ''ضابطے کی کارروائی میں کچھ دیر لگتی ہے۔ آپ گھوم پھر کر آئیں۔ دو تین گھنٹے لگیں گے۔ سہ پہر تک لے لیں اور ہاں یہیں پاس میں ایک بینک ہے۔ ریسپشن پر جو شخص بیٹھا ہے وہ آپ کو سب بتا دے گا۔'' یہ بتا کر بولے: ''وہاں ویزا کی فیس جمع

کر دیں اور اس کی رسید دے کر پاسپورٹ حاصل کر لیں۔''

ہم منظور علی میمن سے ہاتھ ملا کر باہر نکلے تو ہمیں محسوس ہی نہیں ہوا کہ ہم سفارت خانے میں ہیں۔ ہمیں یہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ ہم نے جس شخص سے اتنی دیر تک باتیں کی ہیں، جس کے ساتھ چائے پی ہے، جس کی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا ہے وہ اس سفارت خانے کا کوئی اہم عہدہ دار ہے۔ ہم تو جیسے اپنے گھر میں بیٹھے کسی قریبی عزیز سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ بڑی سادہ لوحی سے اپنی باتیں بتا رہا تھا اور ہم بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اس کی بات ختم ہوتی تو ہماری زبانوں پر لکھنؤ اور علی گڑھ کے قصے آ جاتے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے زمینوں نے سمٹ کر فاصلے مٹا دیے ہوں۔

سفارت خانے سے باہر نکل کر ہم سیدھے اس بینک پہنچے جہاں ہمیں ویزا فیس جمع کرنا تھی۔ فیس کی رسیدیں حاصل کرنے کے بعد قاضی صاحب نے جامعہ جانے کا پروگرام بنایا جہاں اُن کی اہلیہ کو اپنے عزیزوں سے ملنا تھا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد کسی کاغذ کی ضرورت پڑنے پر قاضی صاحب کو اپنا بیگ یاد آیا تو پتہ چلا کہ ضروری کاغذات اور روپیوں سے بھرا یہ بیگ تو وہیں بینک میں چھوٹ گیا۔ قاضی صاحب پریشان ہوئے اور اس سے زیادہ ان کی اہلیہ۔

''ارے آپ بھی.........'' قاضی صاحب کی اہلیہ کے لہجے میں غصہ اور ناگواری دونوں شامل تھے۔ اس کا اظہار شاید اور زیادہ ہوتا لیکن میری موجودگی قاضی صاحب کو سخہائے سخت وست سننے سے بچا لے گئی۔ گھر اور شوہر کو سنبھالے رہنے والی زوجۂ زودنگر سے اُس کا یہ حقِ سرزنش کوئی نہیں چھین سکتا۔ پریدہ رنگ چہرۂ قاضی کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ یہ مصرعہ پڑھوں:

ع دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی

لیکن یہ موقع اس کے پڑھنے کا نہیں تھا۔ قاضی صاحب کا ڈرائیور رفتار بڑھا کر راستوں کو مختصر کرتا ہوا جب اُس بینک میں پہنچا تو وہ قیمتی بیگ وہیں رکھا ہوا ملا جہاں بیٹھ کر ہم نے کاغذوں کی خانہ پری کی تھی۔ میاں بیوی دونوں کی جان میں جان آئی لیکن یہ بات انہوں نے بینک کے عملے کو نہیں بتائی۔ بینک سے باہر نکل کر قاضی افضال کے اس نوع کے اور بھی قصے ہمیں سننے کو ملے اور اسی وقت ہمیں خیال آیا کہ وہ جوان کی تحریروں میں دقیق اور عقل آمیز

باتیں ہوتی ہیں وہ شاید اسی گم خیالی کا عطیہ ہیں۔

اب قاضی صاحب نے طے کیا کہ اُن کی اہلیہ جامعہ جائیں اور ہم لوگ یہیں ٹھہریں۔ سو ہم وہیں رکے اور ہم نے اُسی علاقے کے ایک اچھے سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا، باتیں کیں اور سہ پہر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ میں دوبارہ سفارت خانے کے دروازے پر جا پہنچے۔ یہاں پھر ہمیں اُسی ملاقات والے کمرے میں بٹھایا گیا جہاں ہم پہلے بیٹھے تھے۔ ہمارے پہنچتے ہی عبید صدیقی بھی آ گئے۔ کچھ دیر بعد ویزا لگے ہوئے پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیے گئے۔ ہم نے انہیں کھول کر دیکھا اور ویزا کی مہر کے ساتھ اس مہر کو بہ نگاہِ خاص دیکھا جس کے ذریعے کراچی میں ہمیں اپنی آمد کے درج کرانے سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ ان مہروں کو دیکھنے کے بعد مجھے یقین آ گیا کہ اب کراچی کی سرزمین پر اترنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ مہریں دیکھتے دیکھتے مجھے وہ مکان یاد آنے لگے جن کے مکین برسوں پہلے تانگوں پر اپنے صندوق رکھ کر میرے شہر سے چلے گئے تھے۔ مجھے اپنی ماں یاد آنے لگی جو دونوں مکانوں کے رہنے والوں سے گلے ملتے وقت بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ مجھے فراست یاد آیا جو ہمیں بتائے بغیر لکھنؤ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میری آنکھوں میں راجو اور پپو کی صورتیں گھومنے لگیں جو میرے بچپن کے دوست تھے اور پرانے ہوتے ہوئے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر ہم سے پتنگیں لڑاتے تھے۔ لیکن ایک دن ان کی چھتیں سونی ہو گئیں اور ان کے دالانوں میں نئی صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ برسوں بعد شاید یہ ۷۸ء کی بات ہے، کراچی یونیورسٹی میں اس وقت جب طلبہ کے الکشن میں دو گروہ آمنے سامنے آ گئے اور جھگڑا بڑھا تو صلح پسند پپو مصالحت کرانے پہنچ گیا اور وہ قرولی جو ایک حریف نے دوسرے حریف پر حملہ کرنے کے لیے نکالی تھی، پپو کے بیچ میں آ جانے کی وجہ سے اس کے پیٹ میں اتر گئی اور چھریرے بدن والے پپو نے وہیں دم توڑ دیا۔ اسی یاد آنے میں مجھے یاد آیا کہ کیسے ایک دن پپو اپنے گھر کی دیوار پھاند کر میری چھت پر گری ہوئی پتنگ لے گیا تھا۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا تھا لیکن میرے لپکتے لپکتے وہ دیوار پھاند چکا تھا اور میں نے بہت چیخ کر کہا تھا: ''پپو کے بچے، چھوڑوں گا نہیں تجھے۔'' اور آج اسی پپو نے یہ دنیا چھوڑ دی تھی۔ خبر سن کر میں بہت دیر تک چپ رہا تھا۔ پپو کے سنہرے گھنگریالے بال، اُس کے چہرے کے بہت

نازک سے خطوط، اس کا گورا رنگ۔ سب کچھ مجھے بہت دیر تک یاد آتا رہا۔ مجھے وینا باجی اور نسیم بجّو یاد آئیں جن کے مکان کے اوپری حصے میں اپنا مکان چھن جانے کے بعد ہم آکر رہ رہے تھے۔ قرۃ العین حیدر کا نام پہلی بار میں نے انہیں دونوں بہنوں کی زبانی سنا تھا۔ انہیں دونوں سے لے لے کر میں نے اردو کی بہت سی مشہور کتابیں پڑھی تھیں۔ یہ دونوں لکھنؤ میں لڑکیوں کی مشہور درسگاہ ''کرامت گرلس کالج'' کی رونق تھیں۔ ہر ثقافتی اور ادبی تقریب کی جان۔ دونوں کے ہاتھ میں ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب رہتی۔ ابنِ صفی کے ادبی صفات میں نے پہلی بار انہیں کی زبانی سنے تھے۔ برسوں بعد جب مقبول عام ادب کے تعلق سے ابنِ صفی کی اہمیت پر گفتگو کا آغاز ہوا تو یہ دونوں بہنیں مجھے بہت یاد آئیں۔ ابنِ صفی کی ناولوں کے بہت سے مکالمے ان دونوں کو ازبر تھے۔ اور ''جہنم کے شعلے'' کا وہ مکالمہ تو نسیم باجی بار بار دہرایا کرتیں جس میں ناول کے آخر میں خانم فریدی کی طرف پہلی بار محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھتی ہے:

''میں تمہیں کس نام سے پکاروں۔''

''میرا اسسٹنٹ مجھے کرنل ہارڈ اِسٹون کہتا ہے۔''

نسیم باجی لکھتی نہیں تھیں، صرف پڑھتی تھیں اگر لکھتی ہوتیں تو ابنِ صفی کے فن کی بہت سی باریکیاں سامنے آتیں۔ مجھے یاد آیا کہ تعطّل کے ایک طویل وقفے کے بعد جب ابنِ صفی کا ناول ''ڈیڑھ متوالے'' آیا تو اس کی لوٹ مچ گئی۔ نسیم باجی مجھ سے بار بار کہتیں کہیں سے لے کر آؤ۔ اور تب میں نے انہیں وہ ناول اپنی ایک عزیزہ شمّے (شمیم) باجی سے اس شرط پر لا کر دیا تھا کہ پڑھ کر فوراً واپس کر دیں۔ شمّے باجی کرامت میں اردو پڑھاتی تھیں اور اسی زمانے میں جب 'ڈیڑھ متوالے' آئی تھی ان کی شادی فٹ بال کے ایک اچھے کھلاڑی رئیسو سے ہوگئی اور دونوں لکھنؤ چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ ان سب کو سینتالیس برس ہوگئے پاکستان گئے ہوئے۔ اپنا آبائی مکان چھن جانے کے بعد نسیم باجی کے جس مکان میں ہم آکر رہے تھے اسی میں فراست ہم سے ملنے آیا کرتا تھا۔ وہیں ماں نے اس وقت جب اس نے فراست کے لیے بہت عمدہ کھانا پکایا تھا، فراست کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا: ''کیسا ذہین لڑکا ہے۔'' اسی مکان سے نسیم باجی کے بڑے بھائی جنہیں ہم لوگ حسن بھائی کہتے تھے، بڑی بڑی پتنگیں اڑا کر اس وقت پیچ

لڑاتے جب وہ بہت چھوٹی دکھائی دینے لگتیں۔ یہیں اصل مکینوں کے چلے جانے کے بعد رعنا اور آصف اپنے خاندان کے ساتھ آ کر رہی تھیں۔ تیز طرّار، آزادہ رو، بیباک اور پر تپاک۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں کیرم کھیلا کرتا اور کیرم کھیلتے وقت آصف کی آنکھوں میں دیکھ لیا کرتا۔ سیاہ اور نشیلی آنکھیں۔ لیکن آصف نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔ اس کی نگاہ گوٹوں پر جمی رہتی اور وہ انہیں پاکٹ میں ڈالنے کے لیے اسٹرائکر کے زاویے بدلتی رہتی۔ پھر کھیل موقوف ہوا، پہلے انہوں نے یہ گھر چھوڑا پھر یہ شہر۔ اُن کا اکلوتا بھائی سعید جس نے حسن بھائی کے بعد اس مکان کی چھت کو پتنگوں اور چرخیوں سے آباد رکھا، انہیں کے ساتھ چلا گیا۔ پہلے کراچی کی سرزمین پر قدم رکھا پھر آگے کی دنیاؤں میں نکل گیا۔

پاسپورٹ میرے ہاتھ میں تھا اور یہ ساری صورتیں میری آنکھوں میں۔ میں گزرے ہوئے زمانے کی اس دنیا سے اُس وقت نکلا جب قاضی صاحب کی اہلیہ اپنے عزیزوں سے مل کر خود فراموشی کے عالم میں رہنے والے اپنے شوہر کو لینے آ گئیں۔ وہ دونوں علی گڑھ چلے گئے اور میں عبید صدیقی کو الوداع کہہ کر دہلی میں اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا۔

●

کراچی سے بھیجے ہوئے ٹکٹ کے مطابق مجھے ۱۳؍اکتوبر کو جہاز پر بیٹھنا تھا لیکن میں لکھنؤ سے ۸؍اکتوبر ہی کو رختِ سفر باندھ کر اس لیے نکل پڑا کہ مجھے ۹؍تاریخ کو پاکستانی سفارت خانے پہنچنا تھا۔ تین دن میں نے دہلی میں گزارے۔ ان تین دنوں میں میں نے بہت سوچ سوچ کر کراچی میں اپنے ملنے والوں کے لیے کچھ حقیر سے تحفے لیے۔ ان تحفوں کی خریداری میں بار بار مجھے خیال آتا کہ جو کچھ لے رہا ہوں وہ دینے والوں کو پسند بھی آئے گا۔ ان ملنے والوں نے لکھنؤ کی جن خاص چیزوں کی فرمائش کی تھی وہ سب میں نے لکھنؤ میں لے لی تھیں لیکن بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو صرف دہلی میں مل سکتی تھیں۔ دہلی میں رکے رہنے والے یہ تین دن مجھے بہت برے اور بہت بڑے معلوم ہو رہے تھے۔ میں رہ رہ کر اپنے آپ سے پوچھتا کیا واقعی میں کراچی جا رہا ہوں۔ وہ کراچی جہاں میرے شہر کے بہت سے محلّوں کے بہت سے لوگ بسے ہوئے ہیں۔ ان میں میرے عزیز بھی ہیں، دوست بھی اور ملاقاتی بھی۔

برسوں بعد میں ان سب کو دیکھوں گا۔ بڑھتی ہوئی عمروں کے ساتھ ان کی صورتیں بدل چکی ہوں گی۔ یہاں سے جا کر وہاں بس جانے والوں میں بہت کم لوگ کبھی کبھی لکھنؤ آئے بھی تو اُن میں سے بہت کم کو بہت کم وقت کے لیے دیکھا اور اس بہت کم وقت میں بہت کچھ سنا اور اس بہت کچھ سننے میں دل پر بہت کچھ گزری۔ کسی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ نہیں رہا، کسی کے ذکر میں پتہ چلا کہ وہ کسی بہت دور کے ملک میں جا بسا اور کوئی ملکوں ملکوں گھوم کر کراچی واپس آ گیا۔ ان کبھی کبھی آنے والوں کی زبانوں پر میرا شہر چھوڑ کر جانے والے ان ماہ رخوں اور پری پیکروں کا ذکر بھی آ نکلتا جن کی غزالی آنکھیں دیکھنے کے لیے ہم بھری دوپہروں میں گلی کوچوں میں گھومتے رہتے۔ انہیں میں ایک آہوئے خوش چشم سے کچھ روز ہماری راہ و رسم بھی رہی لیکن اس سے پہلے کہ ہم جادۂ عشق پر کچھ دور ساتھ چلتے وہ کسی اور جادے پر جا نکلا۔ اب کبھی کبھی جب اُس کی آنکھیں یادوں کے دریچوں میں روشن ہوتی ہیں تو بھری دوپہر میں وہ کوچے اور وہ گلیاں جو بہت بدل چکی ہیں، یاد آنے لگتی ہیں۔ اب اُدھر سے گزرتے ہوئے کسی ایک مقام پر ٹھہر کر سوچتے ہیں: ''یہیں کہیں پر تھا اس کا گھر''۔ آنے والوں نے بتایا کہ گھر اُس کا اُس شہر میں آباد ہو چکا ہے اور غزال اُس کے اُس کے آنگن میں چوکڑیاں بھرتے ہیں۔ میں ان سب کے بارے میں سوچتا رہا اور یہ بھی سوچتا رہا کہ وہاں پہنچ کر کیا ان سب کو دیکھ سکوں گا۔ وہاں بسے ہوئے میرے شہر کے لوگوں میں سے بہت سے مجھے پہچان لیں گے اور بہت سے نہیں پہچان سکیں گے۔ جو نہیں پہچان سکیں گے انہیں میں بتاؤں گا میں کون ہوں اور تب وہ اچھل کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیں گے۔ بہت سے اُن لوگوں کو جو ماں کے بہت قریبی عزیزوں میں تھے اور ہر وقت ماں کے پاس آیا جایا کرتے تھے، یہ نہیں بتاؤں گا کہ ماں جو اب اس دنیا میں نہیں ہے، یہ دنیا کیسے چھوڑ گئی۔ سوچتے سوچتے میں نے یہ بھی سوچا کہ جو لوگ مجھے کچھ کچھ پہچان لیں گے انہیں اپنے آنے کی اطلاع دیے بغیر ان کے دروازے پر جا کر دستک دوں گا اور جب دروازہ کھلے گا تو پوچھوں گا بتائیے میں کون ہوں؟ اور جب وہ میرے شہر اور میری گلی اور میرے محلّے کا حوالہ پا کر مجھے پہچان لیں گے اور والہانہ مجھے اپنے سینے سے لگائیں گے تو میں خوشی سے جھوم اٹھوں گا۔

طیر گاہِ دہلی میں گفت وگشت

تین دن، تین بہت لمبے دن کسی طرح گزر گئے۔ ان تین دنوں میں اُدھر سے فراست اوران کی بیوی نسیم نازش کےفون آتے رہے۔ یہاں سے چلنےاوروہاں پہنچنے کا وقت معلوم کیا جاتا رہا۔ میرا ایک اور دیرینہ دوست شعیب بھی یہی باتیں معلوم کرتا رہا۔ جتنا میں یہاں سے جانے کو بیقرار تھا اسی قدر وہ میری وہاں آمد کے منتظر تھے۔ مجھے ایک بجے دہلی سے اڑنے والے پی۔آئی۔اے کے جہاز پر بیٹھنا تھا اور پاکستانی وقت کے حساب سے کراچی ڈھائی بجے پہنچنا تھا۔ لیکن ۱۲را کتوبر کی رات کسی نے بتایا کہ اڑان میں چھ گھنٹے کی تاخیر ہے۔ جس جہاز سے ہمیں کراچی پہنچنا ہے وہ دہلی دیر سے آئے گا۔ ہم نے ایرپورٹ فون ملایا تو جواب اطمینان بخش نہیں ملا۔ عبید صدیقی تاخیر والی خبرکوصحیح بتا چکے تھے لیکن بچھڑے ہوئے لوگوں سے ملنے کی بے چینی نے ٹکٹ پر لکھے ہوئے وقت سے دو گھنٹے پہلے مجھے ہوائی اڈے پہنچا دیا۔ وہاں پہنچے تو پی۔آئی۔اے کے اطلاعاتی کاؤنٹر پر کوئی نہیں تھا۔ اورکوئی اور بھی یہ بتانے والا نہیں تھا کہ جہاز کراچی سے کب آئے گا اور کب یہاں سے اڑے گا۔ جہاز کے تاخیر سے آنے کی اطلاع میں نے قاضی صاحب کو دے دی تھی لیکن میری ہی طرح انہیں بھی ایرپورٹ پہنچنے کی گھبراہٹ تھی بلکہ اپنے مزاج کے باعث مجھ سے زیادہ۔ سو کچھ دیر بعد وہ بھی ہوائی اڈے آپہنچے۔ میں پاکستانی کاؤنٹر کے سامنے والی نشست پر بیٹھ کر اڑانوں کی اطلاعات دینے والی اُن برقی پٹیوں کو دیکھتا رہا جومختلف اڑانوں کی پوزیشن بتارہی تھیں۔ ان میں PK273 کی اڑان والی پٹی کے وہ خانے خالی تھے جن میں آنے اور جانے کا وقت لکھا ہوتا ہے۔ اُدھر سے فراست اور شعیب کے بار بار فون آرہے تھے۔ فراست پوچھ رہے تھے:

''میرے آقا، میرے مولا۔ ہماری زمین پر کس وقت قدم رنجاں ہورہے ہیں؟''

''اڑان میں تاخیر ہے۔ ذرا وہاں سے معلوم کیجئے۔''

''ابھی ....ابھی معلوم کرتا ہوں۔''

فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اُدھر سے شعیب نے بتایا:

''اطلاع صحیح ہے، چھ گھنٹے کی دیر ہے۔''

اسی بیچ دہلی ہوائے اڈے کے عملے کے ایک شخص نے آ کر ہندی اور انگریزی میں بتایا:

''کراچی جانے والے مسافروں کو بتایا جاتا ہے کہ کراچی سے ملنے والی اطلاع کے مطابق فلائٹ نمبر PK273 کے یہاں پہنچنے میں چھ گھنٹے کی دیر ہے۔ یہ اطلاع ہمیں کراچی سے ملی ہے اور اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے۔''

تب مجھے اور ان باشندگانِ کراچی کو جو دہلی اور لکھنؤ اپنے عزیزوں سے ملنے آئے تھے اس تاخیر کا یقین آ گیا اور تب اپنے اپنے سامانوں سے لگ کر ہم سب آرام سے بیٹھ گئے اور اُن برقی پٹیوں کی طرف دیکھنا بند کر دیا جو بار بار اپنے مندرجات بدل رہی تھیں۔

''کراچی جا رہے ہیں؟'' اپنے سامان سے لگی ہوئی میرے برابر بیٹھی ایک گورے رنگ کی خاتون نے مجھ سے پوچھا۔

''جی۔ اور کہاں جاؤں گا۔ اڑان تو وہیں تک کی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور آپ؟''

''کراچی۔ اڑان تو وہیں تک کی ہے اور کہاں جاؤں گی۔'' انہوں نے میرا جملہ مجھے لوٹا دیا۔

''ہندستانی ہیں یا....''

''ہندستانی۔ لکھنؤ کا۔''

''لکھنؤ کے؟'' انہوں نے حیرت اور خوشی کے ساتھ مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرے کہنے پر انہیں یقین نہ آ رہا ہو۔

''جی۔''

''میر جعفر عبداللہ کو جانتے ہیں؟''

''بہت اچھی طرح، دوست ہیں میرے۔''

''اور میرے عزیز ہیں۔ لکھنؤ سے آ رہی ہوں۔ شیش محل میں قیام تھا میرا۔ کچھ عزیز وزیر گنج اور گولہ گنج میں بھی ہیں۔''

''لکھنؤ کی ہیں؟'' میں نے پوچھا

''جی۔ زمانہ ہوا اُس شہر کو چھوڑے ہوئے۔ بیاہ کر گئی تھی کراچی، بہت پہلے۔''
انہوں نے خالص لکھنوی لہجے میں کہا۔
''ملنے آئی تھیں، عزیزوں سے؟''
''عزیزوں سے ملنے بھی آئی تھی اور جو عزیز نہیں رہے ان کا پرسہ بھی دینے۔ نہ کسی کے چالیسویں میں شریک ہو سکی نہ برسی میں۔''
''کیوں؟''
''ویزا، نہ آپ کی طرف سے آسانی سے ملتا ہے نہ ہماری طرف سے۔''
''مگر مجھے تو آسانی سے مل گیا۔''
''ملنے جارہے ہیں اپنے عزیزوں سے؟''
''نہیں۔ ایک کانفرنس میں شرکت کرنے۔ لیکن سچ پوچھیے تو عزیزوں سے ملنے کا اشتیاق زیادہ ہے۔''
''کہاں رہتے ہیں آپ کے عزیز؟''
''کراچی میں ہر طرف۔ دیکھیے سب سے مل بھی پاتا ہوں یا نہیں۔''
''فاصلے بہت ہیں۔ بہت بڑا شہر ہے۔ پہلی بار جارہے ہیں؟''
''جی پہلی بار۔ سب کو دیکھے ہوئے برسوں ہو گئے۔ اُن میں سے بہت اس دنیا سے اٹھ گئے۔'' میں نے کہا: ''خبریں ان کی آتی رہیں، ہم افسوس کرتے رہے۔ کچھ کے ایصالِ ثواب کی مجلسیں بھی کیں۔''
''میرے ساتھ بھی یہی ہے۔ جس پرانے عزیز کو پوچھا، پتہ چلا نہیں رہا۔ بہت سوں کی قبروں پر جا جا کے فاتحہ پڑھا۔''
اُن کی یہ بات سن کر میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا:

جو لوگ چلتے پھرتے یاں چھوڑ کر گئے تھے
دیکھا نہ اب کے ان کو آئے جو ہم سفر سے
میرؔ

''جی کیا کہا آپ نے؟''

''کچھ نہیں مجھے بھی.....دیکھیے کس کس کے نہ رہنے کی خبر ملتی ہے۔''

''کراچی میں کہاں دولت خانہ ہے آپ کا۔'' میں نے پوچھا۔

''نارتھ ناظم آباد، پتہ لکھ لیجیے۔ فرصت ملے تو ایک وقت کی دال روٹی ہمارے ساتھ کھائیے۔''

''حاضر ہوں گا انشاء اللہ۔'' یہ کہہ کر میں نے اُن کا پورا پتہ ڈائری میں لکھا۔ پتہ لکھ چکا تو وہ بولیں: ''سیّد محمد علی نام ہے میرے شوہر کا۔''

''وہ بھی لکھنؤ کے ہیں؟''

''جی۔ وہ لوگ پہلے چلے گئے تھے ہم لوگ ان کے بعد۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے ان سے پوچھا: ''چائے کافی کچھ لاؤں آپ کے لیے۔''

''جی نہیں۔ شکریہ۔''

''آپ ذرا میرے سامان پر نگاہ رکھیں۔ میں کچھ پاکستانی کرنسی لے لوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا کیجئے گا۔'' وہ بولیں۔ ''وہیں بدلیے گا فائدے میں رہیں گے۔''

میں نے ان کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا تو انہوں نے زور دے کر کہا:

''یہاں آپ نقصان میں رہیں گے، وہاں زیادہ فائدہ ہے۔''

میں اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ قاضی افضال میرے برابر بیٹھے ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہیں چلے جاتے پھر آ کر بیٹھ جاتے اور پھر اسی کتاب کے ورق الٹنے لگتے۔ ایک بزرگ جو میرے بائیں طرف کچھ ہٹ کر بیٹھے تھے، کناڈا سے لکھنؤ آئے تھے اور اُڑان میں تاخیر ہونے پر بہت ناراض تھے اور اس سے زیادہ اس بات پر کہ تاخیر کی ٹھیک ٹھیک اطلاع دینے والا کوئی نہیں ہے۔

''آخر پاکستانی اسٹاف کے لوگ ہیں کہاں؟'' انہوں نے بہت غصے سے کہا اور میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اس تاخیر کا گنہگار میں ہی ہوں۔

''یہاں آنے والے جہاز میں کوئی تکنیکی خرابی ہوگئی ہوگی۔'' میں نے کہا۔
ہمارے برابر بیٹھا ہوا ایک تیسرا شخص جو کراچی کا رہنے والا تھا، بولا:
''کسی نے وہاں سے فون پر بتایا ہے کہ ایرپورٹ کے عملے کی ہڑتال چل رہی ہے اس لیے اڑانوں میں تاخیر ہورہی ہے۔'' یہ سن کر وہ بزرگ بولے:
''بتایئے اسّی روپے کی ایک کافی مل رہی ہے اور کھانے کی چیزیں تو اور بھی مہنگی ہیں۔ چھ گھنٹے میں تو جیب خالی ہوجائے گی۔''
''کراچی کے رہنے والے ہیں؟'' میں نے اُن سے پوچھا۔
''نہیں کناڈا کا۔ شہریت کناڈا کی ہے باشندہ لکھنؤ کا ہوں۔''
''وہاں جناب کا دولت خانہ؟''
''مولوی گنج۔ اصطبل چار باغ۔''
''اور آپ ... کہاں رہتے ہیں لکھنؤ میں؟'' پاکستانی خاتون سے ہونے والی گفتگو سے انہیں معلوم ہوچکا تھا کہ میں لکھنؤ کا ہوں۔
''نخاس، بزازہ۔ میں نے اپنے آبائی محلّے کا نام لیا۔''
''کیا کرتے ہیں؟''
''ٹیچر ہوں۔ پڑھاتا تھا لکھنؤ یونیورسٹی میں۔ اب ریٹائر ہوچکا ہوں۔''
اُن بزرگ کے برابر بیٹھی ہوئی ایک خوش لباس اور نِکھ سِکھ سے درست خاتون جن کے چہرے کی کشش عمر ڈھل جانے کے باوجود کم نہیں ہوئی تھی، یہ جملہ سن کر بولیں:
''لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے؟''
''جی۔''
''وہیں میرے ایک عزیز بھی پڑھاتے تھے۔ نجم الحسن صدیقی۔ انگلش ڈپارٹمنٹ میں۔''
''جی جی۔ لیکن کسی سے ملتے نہیں تھے۔ آئے پڑھایا اور چلے گئے۔''
''وہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھے۔''
''آپ بھی لکھنؤ کی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی۔ساری تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔پاکستان بہت بعد میں گئی جب وہاں شادی ہوئی۔''
انہوں نے کہا۔پھر بتایا:''بی۔اے آئی۔ٹی سے کیا۔ایم۔اے آپ کی یونیورسٹی سے۔
انگریزی میں۔خواجہ جمیل الدین ہیڈ تھے اس وقت۔اور بھی بہت اچھے اچھے استاد تھے۔
''اب تو سب.....''میں کہتے کہتے رکا۔
وہ سمجھ گئیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔پھر انہوں نے آئی۔ٹی کالج کی باتیں بتانا شروع
کردیں۔جب بہت سارے قصیدے اس کالج کے پڑھ چکیں تو میں نے کہا:''اب وہ بھی......''
''پہلے جیسا نہیں ہے.....سب طرف یہی حال ہے۔''انہوں نے کہا۔پھر بڑے فخر
سے مجھے بتایا:
''قرۃ العین حیدر اسی کالج کی پڑھی ہوئی تھیں۔آپ جانتے ہیں انہیں۔بہت بڑی
رائٹر تھیں۔''
''جانتا ہوں کچھ کچھ۔''
''ذرا گھوم پھر کر معلوم کیجیے کوئی تازہ اطلاع آئی۔''کناڈا والے بزرگ ہماری باتوں
کے بیچ بولے۔
''آئی ہوتی تو یہاں آکر کوئی ضرور بتاتا۔''میں نے کہا اور کہہ کر جب اپنے داہنی
طرف دیکھا تو قاضی صاحب کی جگہ خالی تھی۔وہ پھر کسی طرف نکل گئے تھے۔کچھ دیر بعد
خوشبیر سنگھ شاد تین نوجوانوں کے ساتھ نظر آئے۔مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑی تیزی سے
بڑھے، تپاک سے ملے اور اُن تین نوجوانوں کے بارے میں بتایا:''یہ سب میرے ساتھ
مشاعرہ پڑھنے کراچی جارہے ہیں۔''ان میں سے ایک ابھیشیک شکلا سے میں واقف تھا۔لکھنؤ
میں ہندی والوں کی نشستوں میں ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔اور ایک دن جب انہوں نے
مجھ سے کچھ جدید شاعروں کے مجموعے طلب کیے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔معلوم ہوا کہ اردو
شاعری سے بڑا شغف ہے، اردو سیکھ رہے ہیں اور بڑے شاعروں کے بہت سے شعر بھی یاد
ہیں۔پھر کسی نے بتایا کہ باقاعدہ شعر کہنے لگے ہیں اور مشاعرے پڑھنا شروع کردیے ہیں۔
بتانے والے نے یہ بھی بتایا کہ اگر مشاعروں کے چنگل سے بچ نکلے تو اچھے شعر نکال لیں گے۔

دوسرے دو شاعروں سے میں واقف نہیں تھا۔ ان میں سے ایک کے بارے میں قاضی افضال نے بتایا کہ وہ علی گڑھ میں ان کا شاگرد رہ چکا ہے۔ خوشبیر سنگھ شاد ان تینوں کو مجھ سے ملا کر آگے نکل گئے اور کہیں اور جا کر بیٹھ گئے۔ سہ پہر کے بعد عبید صدیقی بہت عمدہ لباس میں اپنے بہت قیمتی سوٹ کیس کے ساتھ نظر آئے۔ قریب پہنچے تو میں نے اُن سے کہا:

''آپ نے ٹھیک کیا، صحیح وقت پر آئے۔''

''میں نے آپ سے کہا تھا چھ گھنٹے لیٹ ہے۔'' انہوں نے کہا۔ پھر بولے:

''میں نے آرٹس کاؤنسل روزینہ کو فون کر کے تصدیق کر لی تھی۔ آپ نہیں مانے، چلے آئے۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عبید نے ایک خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''لیجیے یہ خاتون تو آ گئیں۔ اس کا مطلب کہ فلائٹ اب اور زیادہ لیٹ نہیں ہوگی۔''

''کون ہیں یہ؟''

''پی۔ آئی۔ اے کی ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے انہیں دیکھ رہا ہوں، اسی لیے پہچانتا ہوں۔ اب کاؤنٹر پر بھی چہل پہل شروع ہوگی۔''

سیاہ و سفید ساری میں ملبوس وہ خاتون کبھی نظر آتیں، کبھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتیں جب نظر آتیں اور ہم میں سے کوئی اُن سے پوچھتا کیا پوزیشن ہے تو بتاتیں جتنا آپ کو معلوم ہے اتنا ہی مجھے بھی۔ قاضی افضال گھوم پھر کر آ گئے تھے۔ ہم تینوں میں اب صرف عبید بول رہے تھے۔ پچھلی کانفرنسوں کی باتیں بتا رہے تھے۔ کہاں ٹھہرے تھے، کس کس سے ملے تھے کیا کیا ہوا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی بتا رہے تھے کہ پچھلی بار میں اس لیے نہیں گیا کہ مجھے پولیس رپورٹ سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا تھا۔ بتاتے بتاتے غصے سے بولے: ''میں نے صاف صاف کہہ دیا جب تک پولیس رپورٹنگ سے چھوٹ نہیں دی جائے گی، میں نہیں جاؤں گا۔''

وہ بولتے رہے ہم سنتے رہے۔ عبید تیور والے آدمی ہیں۔ بات کرتے وقت لہجے میں جان بوجھ کر دھمک پیدا کرتے ہیں۔ سننے والا سہم جاتا ہے۔ برہم تو بہت ہوتے ہیں لیکن دل کو دیر تک میلا نہیں رکھتے۔ اُن کی بلند آوازی کے دوران ایک آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی:

''PK273 کے مسافر رپورٹنگ کے لیے تیار رہوں۔''

یہ پکار سن کر سارے مسافروں کے چہرے کھِل اٹھے اور سب کے سب اپنے سامانوں کے ساتھ اس طرف چل پڑے جدھر سے پکار آئی تھی۔ مسافر اس وقت بہت نہیں تھے۔ قطاریں لگنا شروع ہوئیں، بورڈنگ کارڈ ملنے لگے اور ہم وہ سامان جسے جہاز میں لیجانے کی اجازت تھی، لے کر اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں ہمیں تلاش و تفتیش کے مراحل سے گزرنا تھا۔ قطار میں کھڑے دو۔ چار لوگوں کے بعد میری باری آئی۔ جیبیں جھاڑی گئیں، سر سے پاؤں تک تفتیشی آلے کو حرکت میں لایا گیا۔ پھر دوسری طرف پڑتال کرنے والی مشین سے گزارا جانے والا میرا سامان کھولا گیا اور ٹین کا ایک بند ڈبہ نکال کر مجھ سے پوچھا گیا:

''اس میں کیا ہے؟''

''بنگالی رس گلے۔''

''اسے کھولیے۔''

''کھولوں گا تو لے کیسے جاؤں گا۔''

''اسے کھولنا پڑے گا۔''

''آپ اسے ہر طرح سے دیکھ لیجیے۔ مطمئن نہ ہوں تو اس کا اندراج کر لیجیے۔ میری تفصیل لکھ لیجیے۔ معزز شہری ہوں، یونیورسٹی میں استاد ہوں۔''

میں نے ایک سانس میں سب کچھ بتا ڈالا۔

ڈبہ دیکھنے والے نے مجھے تیز نگاہوں سے دیکھا۔ ڈبہ کان کے قریب لے جا کر اسے ہلایا۔ میری طرف پھر دیکھا اور دیر تک دیکھنے کے بعد پوچھا:

''پڑھاتے ہیں؟''

''بتایا تو۔''

اس نے رجسٹر میں ڈبے کا اندراج کیا۔ میرا نام، پتہ اور پاسپورٹ کا نمبر لکھا اور نہ چاہتے ہوئے اس ڈبے کو مجھے دیتے ہوئے بولا:

''اس کا لے جانا ضروری ہے۔''

''بہت، ناتھو کے ہیں، وہاں ایسے نہیں ملتے۔''

''ٹھیک ہے لے جائیے۔''

میں وہ ڈبہ اپنے چھوٹے سے بیگ میں رکھ کر اس دروازے کے سامنے والی نشستوں پر جا کر بیٹھ گیا جس سے گزر کر جہاز میں جا کر بیٹھنا تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایرپورٹ کے دور تک پھیلے ہوئے علاقے میں ہر طرف روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ جہاز آ رہے تھے، جا رہے تھے۔ میں شیشے کی موٹی دیواروں کے اس طرف سے یہ سب دیکھ رہا تھا اور قاضی افضال کی آنکھیں ایرپورٹ سے خریدے ہوئے انگریزی کے ایک رسالے پر جمی ہوئی تھیں۔ عبید کہیں اور بیٹھے جھپکیاں لے رہے تھے۔ لکھنؤ کے باشندے بے چین ہو ہو کر کبھی کرسی سے اٹھتے کبھی بیٹھ جاتے۔

''اب اور دیر نہ ہو۔'' میرے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''نہیں ہو گی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں صاحب ابھی جہاز وہاں سے چلا ہی نہیں ہے۔''

''کیسے معلوم؟''

''کسی نے ابھی بتایا ہے۔''

میں لکھنؤ والی ان خاتون کی طرف سے جو شیش محل میں ٹھہری تھیں، گزرا تو انہوں نے کہا: ''آیئے گا ضرور ہمارے یہاں۔''

''ضرور آؤں گا۔''

وقت گزرتا گیا۔ بالآخر اعلان ہوا: ''جہاز اتر چکا ہے آدھے گھنٹے بعد اڑان بھرے گا۔'' ہم نے سنا اور سن کر خوش ہوئے۔ آدھے گھنٹے بعد آواز آئی: ''جہاز میں بیٹھنے کے لیے تیار ہوں۔'' ہم سب ایک قطار میں کھڑے ہوئے۔ جب میری باری آئی تو مجھے اس لیے روک لیا گیا کہ میرے بیگ میں لگے ٹیگ پر سامان کی تلاشی کے بعد لگائی جانے والی مہر نہیں لگی تھی۔ یہ مہر دراصل ڈبے پر ہونے والی تکرار کے سبب لگنے سے رہ گئی تھی۔

''اِس طرف آیئے۔'' ایک بجے کٹے نوجوان انسپکٹر نے مجھے ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

''بیگ کھولیے اپنا۔''

میں نے بیگ کھولا۔ اس نے وہی ڈبہ جس پر تکرار ہوئی تھی نکالا اور وہی پوچھا جو پہلے پوچھا گیا تھا:

''اس میں کیا ہے؟''

''رس گلے۔ بنگالی۔''

''اسے کھولیے۔''

''نہیں کھولوں گا نہیں۔ یا اسے لے جاؤں گا یا یہیں چھوڑ جاؤں گا۔''

''کیوں نہیں کھولیں گے؟''

''پھر لے کیسے جاؤں گا۔ راستے بھر شیرہ ٹپکتا رہے گا۔''

''رس گلے ہیں اس میں؟''

''بتا چکا ہوں اور اس پر لکھا ہوا بھی ہے اور اس کا اندراج پہلے والے لوگ کر چکے ہیں۔فون کر کے معلوم کر لیجیے۔''

اس نے فون ملایا۔تصدیق کی۔ پھر بھی اسے اطمینان نہیں ہوا۔ وہ ڈبے کو الٹ پلٹ کر اور ہلا ڈلا کر دیکھتا رہا۔

''آپ کی شادی ہو چکی ہے۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

یہ غیر متوقع سوال سن کر وہ چکرایا۔ قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''نہیں، یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

''شادی ہو جاتی تو آپ کو سالی کی اہمیت معلوم ہوتی۔''

اس بار پھر اُس نے غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھا، پوچھا:

''سالی کے لیے لے جا رہے ہیں؟''

''نہیں بھابھی کے لیے۔'' سالی اور بھابھی دونوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔''

اس نے جبڑوں کو جنبش دی۔ تھوڑا سا مسکرایا۔ میرے ٹیگ پر مہر لگائی اور بولا:

''ٹھیک ہے لے جائیے۔''

جہاز میں بیٹھنے والا میں آخری مسافر تھا۔ پوچھنے والوں نے پوچھا کہاں رہ گئے تھے۔ میں نے انہیں ساری بات بتائی۔ میرے سیٹ پر بیٹھتے ہی جہاز کے اڑان بھرے جانے کا اعلان کیا جانے لگا۔ میں نے فراست اور شعیب کو فون ملایا، بتایا جہاز اڑنے والا ہے۔ یہاں اس وقت ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔

بخت نے خیر سے پہنچادیا اپنوں کی طرف

ضروری ہدایتوں کے بعد جہاز نے اڑان بھری اور جب طیارہ بہت اونچائی پر آ گیا اور کمر سے کسی ہوئی پٹی کھلوا دی گئی تو میں نے سیٹ سے پشت لگا کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں میں وہی صورتیں گھومنے لگیں جنہیں بہت زمانے بعد میں دیکھنے والا تھا۔ اپنے دونوں دوستوں شعیب اور فراست کی بیویوں اور بچوں کو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ فراست کی بیگم نسیم نازش سے بارہا بات کی تھی، ان کی شاعری پڑھی تھی، ان کی تصویر دیکھی تھی۔ شاعری ان کی بہت اچھی تھی، صورت بہت بھلی، لہجہ فراست کی طرح خالص لکھنوی (نواب شاہی نہیں) اور آواز پرکشش۔ دوستوں میں اجمل کمال اور آصف فرخی لکھنؤ کئی بار آ چکے تھے۔ وہ جب بھی یہاں آتے، ان جیسے پڑھے لکھوں سے مل کر خوشی ہوتی۔ افضال احمد سیّد، انور سن رائے، عذرا عباس، تنویر انجم اور فاطمہ حسن سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ زیبا علوی اپنے چھوڑے ہوئے لکھنؤ میں کبھی کبھی چلی آتیں لیکن انہیں بھی دیکھے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ اسد محمد خاں کو دیکھنے کا اشتیاق تھا اور ذیشان ساحل جس کی نظمیں پڑھ کر میں اداس ہو جایا کرتا تھا اور میری ایک طالبہ جس کی نظمیں پڑھتے پڑھتے اسے اپنا دل دے بیٹھی تھی، اب اِس دنیا میں نہیں تھا۔ لیکن میرے درختوں کی شاخوں پر چڑیوں کا شور جب بھی ہوتا ہے، مجھے ذیشان ساحل بہت یاد آتا ہے۔ افضال احمد سیّد سچی اور اصلی نثری نظم والے شاعر۔ اس نوع کی نظم گاہِ نثر میں ان کا مدِ مقابل کوئی نہیں۔ میرے ایک مرحوم دوست شہنشاہ مرزا جو خود بھی نثری نظمیں کہتے تھے، ان کی نظموں کے دیوانے تھے۔ مبین مرزا کے رسالے میں ایک آدھ بار چھپا ہوں۔ اُن کی چھاپی ہوئی کتابیں دیکھ دیکھ کر ان کے ذوقِ طباعت اور افتخار عارف کے کلیات ''کتابِ دل و دنیا'' میں ان کا مقدمہ پڑھ کر ان کی لیاقت کا قائل ہو چکا تھا۔ دیکھے اور بغیر دیکھے ہوئے یہ سب لوگ میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ لیکن میرے پردۂ ذہن پر ان سب میں سب سے زیادہ فراست کی صورت چمک رہی تھی۔ بس تھوڑی ہی دیر کی بات ہے۔ میں نے سوچا۔ کراچی پہنچ کر ہوائی اڈے سے نکلتے ہی میں اس سے لپٹ جاؤں گا۔ پورے پینتالیس برس بعد اسے دیکھوں گا اور اس کی ہمسفر کو بھی جو فون پر مجھ سے بڑی محبت سے بات کرتی رہی ہے۔ لیکن ایک بار فراست کے شعری

مجموعے ''کتابِ رفتہ'' کے مقدمے کے لکھے جانے میں تاخیر ہونے پر مجھ سے ناراض بھی ہوئی۔

''آخر کب لکھیں گے؟''

''لکھ چکا۔''

''تو بھیجتے کیوں نہیں۔''

''بس بھیج رہا ہوں۔''

''جلدی بھیجئے، کتاب پریس میں جا چکی ہے۔''

ڈانٹ پلانے والی یہ اپنائیت مجھے اچھی لگی تھی۔

ایر ہوسٹس کھانے کا پیکٹ لے کر آئی تو میں آنکھوں میں سمائے ہوئے منظروں سے باہر نکلا۔ بھوک سب کو بہت لگی تھی اس لیے جو کچھ پیکٹ میں تھا، سب نے کھانا شروع کر دیا۔ پیکٹ کا سامانِ طعام ختم ہوتے ہی جہاز میں پائلٹ کی آواز گونجی:

''خواتین وحضرات! کچھ ہی دیر میں ہمارا جہاز کراچی ہوائی اڈے پر اترنے والا ہے۔ کراچی میں اس وقت موسم صاف ہے، درجۂ حرارت اتنا ہے اور وقت یہ ہے۔''

یہ اعلان سن کر میری بے چینی بڑھنے لگی۔ کچھ دیر بعد طیارے کی پرواز نیچی ہونے لگی۔ سب نے اپنی اپنی پیٹی کمر سے باندھ لی۔ طیارہ اور نیچے ہوا۔ اور نیچے بہت نیچے ہوتے ہوئے اس کے پہیوں نے ہوائی پٹی کو چھوا۔ پھر اس پٹی پر اس کی رفتار دھیمی ہوتی گئی۔ پھر وہ رینگتا ہوا ایک مقام پر آ کر ٹھہر گیا۔ مسافروں نے کمروں سے کسی ہوئی پیٹیاں کھولیں، کھڑے ہوئے، سامان سنبھالے اور طیارے کا دروازہ کھلتے ہی ایک ایک کر کے نیچے اترنے لگے۔ میں نے طیارے سے اترتے ہی اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ کراچی اور لکھنؤ کا آسمان ایک جیسا تھا، ستاروں کی صورتیں بھی وہی تھیں۔ چاند بھی اسی شکل کا تھا۔ صرف زمین بدلی ہوئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا اور زمین پر اچھی طرح پاؤں جما کر یقین کیا کہ میں کراچی میں ہوں۔ اور پھر یہ سوچ کر خوش ہوا: ع بخت نے خیر سے پہنچا دیا اپنوں کی طرف۔

مسافر مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے ایمی گریشن والے حصے میں آ گئے تھے۔ میں اور قاضی افضال پاسپورٹ ہاتھوں میں لیے الگ الگ بنی ہوئی اُن کھڑکیوں پر کھڑے

تھے جہاں ہمارے کاغذات دیکھے جانے تھے۔ میری کھڑکی پر بیٹھے ہوئے افسر نے میرے پاسپورٹ اور متعلقہ کاغذات کو بہ غور دیکھتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں پوچھا:

''کانفرنس میں آئے ہیں؟''

''جی۔''

اُس نے پھر کاغذات کو دیکھا پھر کھڑکی پر لگے ہوئے کیمرے کی طرف اشارہ کر کے آہستہ سے کہا:

''اس طرف آجائیں، کیمرے کی طرف۔''

پھر میرا پاسپورٹ مجھے دیتے ہوئے پوچھا: ''کہاں سے آئے ہیں''؟

''لکھنؤ سے۔''

لکھنؤ کا نام سن کر وہ چونکا۔ بولا: ''تاریخی شہر ہے، نوابوں کا۔''

پھر بڑے مودبانہ انداز میں مجھ سے کہا: ''اس طرف سے جائیں۔''

دوسری کھڑکی پر قاضی صاحب اور کھڑکی پر بیٹھے ہوئے افسر کے مابین کارروائی پوری ہو جانے کے بعد بھی مکالمہ جاری تھا۔ اسی کھڑکی پر کچھ دیر بعد عبید آئے تو متعلقہ افسر سے ان کی بحث ہونے لگی۔ عبید کی آواز تیز ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے:

''یہ ویزا دینے والوں سے پوچھیے میں کیا جانوں۔''

افسر نے بڑے افسر سے بات کی، مشورہ ہوا اور کاغذات عبید کے حوالے کر دیے گئے۔ ان کھڑکیوں سے ہٹتے ہی میں نے قاضی صاحب سے کہا: ''افسر سے آپ کی دیر تک گفتگو رہی۔''

''بھئی وہ شاعر نکلے، جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ادیب ہوں تو وہ شعر سنانے لگے، میں تعریف کرنے لگا۔ وہ اور سنانے لگے اور بھول گئے کہ پیچھے لوگ انتظار میں ہیں۔''

کراچی ہوائی اڈے پر بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ حاجیوں کے قافلے مختلف پروازوں سے آرہے تھے۔ جتنے لوگ آرہے تھے اس سے زیادہ لوگ انہیں لینے پہنچ رہے تھے۔ سامان والی پٹی سے ہم اپنا سامان لے کر کسی طرح اس بھیڑ سے باہر نکلے۔ میری آنکھوں نے فراست کو ڈھونڈھنا شروع کیا اور شعیب کو بھی۔ قاضی صاحب اور عبید صدیقی نے آرٹس کاؤنسل کی

طرف سے بھیجے ہوئے لوگوں کو دیکھنا شروع کیا۔ پہلی نظر میں کوئی نہیں دکھائی دیا۔ میں نے قاضی صاحب سے کہا: ''سامان پر نظر رکھیے میں اِدھر اُدھر دیکھ کر آتا ہوں۔'' لیکن ادھر اُدھر کوئی نظر نہیں آیا۔ میں پھر اُسی دروازے کی طرف آیا جہاں سے باہر نکلا تھا اور اب میں نے دیکھا کہ ایک بہت خوش شکل خاتون آنکھوں پر تاریک شیشوں والا چشمہ چڑھائے، کاندھے پر ایک قیمتی بیگ لٹکائے ہاتھوں میں ایک خوبصورت گلدستہ لیے میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ میں نے سمجھا پیچھے والے کسی مہمان کو لینے آئی ہیں۔ انہیں کے پیچھے فراست تھے۔

''میں نسیم نازش۔'' اُن خوبصورت خاتون نے مسکرا کر گلدستہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

میں گلدستہ ہاتھوں میں لے کر والہانہ انداز میں بولا: ''بھابھی.......آداب۔''

''وعلیکم السلام'' انہوں نے کہا۔ (کراچی میں آداب کا چلن زیادہ نہیں ہے۔)

پھر ایک آواز میرے کانوں میں آئی: ''آداب....آداب....میرے آقا۔ میرے مولا۔''

میں نے اس آواز کی طرف بڑھ کر فراست کو سینے سے لگایا اور دیر تک لگائے رہا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ وہ واقعی فراست ہے میں نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے اسے کئی بار دیکھا۔ پھر میری نگاہ شعیب کے چہرے پر گئی۔ میرے ساتھ لکھنؤ کی سڑکوں پر گھومنے اور پرانے لکھنؤ کی چوڑی فٹ پاتھوں (اب یہ فٹ پاتھیں ختم ہوگئی ہیں۔) پر فٹ بال کھیلنے والا یہ دبلا پتلا آوارہ گرد لڑکا کچھ زیادہ ہی صحت مند ہوگیا تھا۔ میں نے فراست ہی کی طرح اسے بھی سینے سے لگایا۔ اتنی دیر میں ہار اور گلدستے لیے آرٹس کاؤنسل کے لوگ بھی آگئے۔ میں ان سب کو لے کر وہاں آیا جہاں قاضی صاحب اور عبید صدیقی کھڑے تھے۔ اُن سب نے ہم سب کو ہار پھول پہنائے، ہمارے ساتھ تصویریں کھنچوائیں۔

''یہ ہیں نسیم نازش، میری بھابھی، فراست کی بیگم۔ بہت اچھی شاعرہ۔ اور یہ ہیں فراست، نام ان کا آپ سن چکے ہیں اور کلام بھی پڑھ چکے ہیں۔ اور یہ ہیں میرے بچپن کے دوست شعیب۔'' میں نے قاضی افضال اور عبید صدیقی سے ان تینوں کا تعارف کرایا۔ پھر اُن تینوں کو بتایا: ''اور یہ ہیں پروفیسر قاضی افضال اور یہ پروفیسر عبید صدیقی۔ ایک بڑے نقاد اور دوسرے بہت اچھے شاعر۔''

آرٹس کاؤنسل کی طرف سے آنے والوں نے بھی فرداً فرداً ہم سب سے اپنا تعارف کرایا۔ پھر ہم گاڑیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ فراست اپنے کسی دوست کی گاڑی لے کر آئے تھے۔ میرا سامان اسی میں رکھ دیا گیا۔ قاضی صاحب، عبید صدیقی اور خوشبیر سنگھ شاد اور اُن کے ساتھ والے شاعر دوسری گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ شعیب بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''بہت انتظار کرایا اس فلائٹ نے۔ دوپہر سے نکلا ہوا ہوں۔ تمہارا ہوٹل یہاں سے بہت دور ہے۔ تم بھی تھکے ہوئے ہو۔ جا کر آرام کرو۔ کل آؤں گا ملنے۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھ سے گلے مل کر رخصت لی۔ اسی وقت وہ خاتون جن سے دہلی کے ایرپورٹ پر بہت دیر تک باتیں ہوئی تھیں اور جنہوں نے مجھے کرنسی بدلنے سے روکا تھا، ایک صاحب کے ساتھ میری طرف بڑھیں اور قریب آ کر ان صاحب سے ملاتے ہوئے کہا: ''یہ میرے شوہر ہیں۔''

''سلام علیکم! میں سید محمد علی۔''

اِن کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرا۔'' اُن خاتون نے اپنے شوہر سے کہا۔'' بہت اچھے آدمی ہیں اور میر جعفر عبداللہ کے دوست ہیں۔''

''اچھا!! گھر تشریف لائیں۔ بہت خوشی ہوگی۔''

''آؤں گا انشاءاللہ۔ فرصت ملی تو ضرور آؤں گا۔''

کناڈا کے شہری بہت تیزی سے کسی طرف نکل گئے تھے اور لکھنؤ کی رہنے والی نکھ سکھ سے درست خاتون بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ فراست کہیں غائب ہو گئے تھے۔ کافی دیر بعد نمودار ہوئے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے: ''اپنا موبائل دیجیے۔'' میں نے اپنا معمولی سا موبائل انہیں دیا تو انہوں نے اس کا سم نکال کر مجھے دیا اور اسی وقت خرید ہوا مقامی سم اس میں ڈال کر مجھے بتایا: ''اس میں اتنی کالیں فری ہیں۔ جب تک یہاں ہیں استعمال کیجئے۔'' پھر ایک شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''ان سے ملیے، یہ رونق حیات ہیں۔'' بہت اچھے شاعر۔ یہ گاڑی انہیں کی ہے۔ اور یہ ہے ان کا بیٹا۔''

''دن رات آپ کا ذکر سنتے ہیں فراست کے گھر میں۔'' رونق حیات گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولے۔

''محبت ہے ان کی۔'' میں نے کہا۔

میں، فراست اور بھابھی پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور گاڑی چل پڑی۔ لیکن ابھی کچھ ہی دور چلی تھی کہ ہوائی اڈے کے حدود کے اندر بنی ایک حفاظتی چوکی پر مسلح پہرہ داروں نے اس کی اچھی طرح تلاشی لی اور بندوق برداروں کے اطمینان کر لینے کے بعد ہم عام راستے پر آ گئے۔ گاڑی چمکتی ہوئی سڑک پر چل رہی تھی اور میں کھڑکی سے باہر روشنیوں میں لپٹے ہوئے شہر کو دیکھ رہا تھا۔ رونق حیات اور فراست راستے میں آنے والی بڑی اور اہم عمارتوں کے بارے میں بتاتے جا رہے تھے۔ ''یہ فلاں بینک ہے، یہ فلاں دفتر ہے۔ یہ پنج ستارہ ہوٹل ہے۔ یہاں فلاں آ کر ٹھہرا تھا۔ یہ راستہ ادھر جاتا ہے۔ یہ جمخانہ کلب ہے۔ اب اس کی ممبر شپ بہت مہنگی ہے۔ پچاس لاکھ دینے پر بھی نہیں ملتی۔ یہ ہمارا دفتر ہے۔ نسیم اور میں اسی عمارت میں بیٹھتے ہیں۔ اب ہم فلاں پُل سے گزر رہے ہیں۔ یہ روشنیاں دیکھ رہے ہیں۔ شب برات میں عریضے سمندر میں یہیں سے ڈالے جاتے ہیں۔'' اسی بتانے اور دکھانے میں رونق حیات راستہ بھول گئے۔ جانا کہیں تھا، نکل کہیں گئے۔ ہماری جائے قیام کے اصل راستے پر آنے کے لیے انہیں ایک لمبا چکر لگانا پڑا۔ جب ہم اصل راستے پر آئے اور ''یہ یہ ہے یہ وہ ہے'' کا ورد ختم ہوا تو بھابھی بولیں:

''آپ نے تو کہا تھا آپ مجھے فوراً پہچان لیں گے۔''

''اصل میں آپ اس سے زیادہ خوبصورت نکلیں جیسا میں نے تصویر میں دیکھا تھا۔'' میں نے مذاقاً کہا۔ انہوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔

کنارِ آبِ رواں

رونق حیات راستے دیکھتے جا رہے تھے، اسٹیئرنگ گھماتے جا رہے تھے اور موقع بہ موقع اپنے اور دوسروں کے شعر بھی سناتے جا رہے تھے۔ آخر ایک راستے پر گاڑی مُڑی اور سامنے ایک چمکتا ہوا بورڈ نظر آیا Way to Hotel Beach Luxury۔ گاڑی اس بہت بڑے ہوٹل کے

دروازے پر پہنچ کر رکی۔ دربان نے انجن اور ڈکی کو اپنے برقی آلے سے چیک کیا، گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا پھر اس بندش کو اٹھالیا جو گاڑی روکنے کے لیے جھکائی گئی تھی۔ گاڑی ہوٹل کے احاطے میں داخل ہو کر ایک جگہ رکی۔ ہم گاڑی سے باہر نکلے اور تفتیش والی مشین سے اپنے سامان کی پڑتال کراتے ہوئے ہوٹل کے لاؤنج میں جا پہنچے۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ہوٹل کے عملے نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور موسم کی مناسبت سے ٹھنڈے مشروبات ہمیں پیش کیے۔ میرا سینہ جکڑا ہوا تھا، اس لیے میں نے معذرت کر لی۔ ریسپشن پر ایک نوعمر سے چاق و چوبند لڑکے نے ہمارے کاغذات لے کر ہوٹل کے رجسٹر میں اندراجات کیے۔ میرا نام اور پتہ لکھتے ہوئے اس نے پوچھا:

''لکھنؤ سے آئے ہیں؟''

''جی۔''

''میں فلاں کاظمی'' (نام کا پہلا جز یاد نہیں رہا۔) اس نے گرمجوشی سے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر معاون عملے میں سے ایک کو چابی دیتے ہوئے مجھ سے اور قاضی افضال سے کہا: ''کمرہ نمبر ۲۲ دوسری منزل پر۔'' کھانے میں جو چاہیے ہو، فون کر کے بتا دیجیے گا۔ کمرے پر پہنچ جائے گا۔''

ہم اپنے سامان کے ساتھ کمرے پر پہنچے اور ہمارے ساتھ بھابھی، فراست اور رونق حیات بھی۔ بھوک ہمیں بہت تیز لگ رہی تھی سو میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی کھانے کا آرڈر دیا۔ جب تک کھانا آئے آئے میں نے اپنا سامان کھول کر وہ تھوڑی بہت چیزیں نکالیں جو میں بھابھی اور فراست کے لیے لے کر آیا تھا۔ انہیں نکال کر میں نے بھابھی سے کہا: ''انہیں اسی وقت لیتی جائیے۔ یہ چیزیں میں نے اپنی پسند سے خریدی ہیں۔ پتہ نہیں آپ کو پسند آئیں گی یا نہیں۔''

کھانا آ چکا تھا اور کھانے کے پیچھے وہ چاق و چوبند لڑکا کاظمی بھی۔

''کھانا ٹھیک ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''میاں ابھی تو شروع بھی نہیں کیا۔'' یہ سن کر وہ مسکرایا پھر بولا:

''صبح کا ناشتہ نیچے ڈائننگ ہال میں ہوگا۔''

''اور صبح کی چائے؟''

''یہیں منگوا لیجیے گا روم پر۔'' وہ پھر مسکرایا۔

کمرے کی چھوٹی سی میز پر لگے ہوئے کھانے پر ہم نے فراست، بھابھی اور رونق حیات کو بھی دعوت دی۔

''شکریہ۔ ہم سب کھا کر چلے تھے۔'' فراست نے کہا۔

ہم کھانا کھاتے رہے، باتیں ہوتی رہیں۔ کھانا ختم ہوتے ہی میں نے بھابھی سے کہا:

اب جائیے، رات بہت ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔''

میں انہیں رخصت کرنے نیچے ان کی گاڑی تک آیا اور احاطے سے ان کی گاڑی نکل جانے کے بعد میں نے دوسری بار کراچی کے تاروں بھرے آسمان کو دیکھا۔ رات کے اس اندھیرے میں تارے ہی سب سے زیادہ روشن دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد میں نے اطراف میں دیکھا۔ تین طرف ہوٹل کی دیواریں اور سامنے سڑک کے اس طرف عمارتوں کا سلسلہ۔

''میں کراچی میں ہوں۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا اور کمرے پر آ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ قاضی صاحب پہلے ہی لیٹ چکے تھے۔

صبح ہماری آنکھ دیر سے کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے چائے منگوائی اور پردہ ہٹا کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔ ہوٹل کے احاطے میں لگے ہوئے درختوں کی شاخوں پر بسیرا کرنے والے پرندے اڑ کر کہیں جا چکے تھے۔ سویرے بہت سویرے جب مسجدوں سے اذان کی آواز بلند ہوئی ہوگی تو ان درختوں پر رات گزارنے والے پرندوں نے ضرور شور کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر مجھے اپنے گھر کے درختوں کی شاخوں پر شور کرتے ہوئے پرندے یاد آئے اور اسی کے ساتھ اپنا شہر یاد آیا۔ چائے آ چکی تھی۔ ہم اس کی چسکیاں لے لے کر یہاں وہاں کی باتیں کر رہے تھے۔ پھر ہم نے ٹی۔ وی کھولنا چاہا جو نہیں کھلا۔ جب چائے کے برتن اٹھانے والا آیا تو ہم نے اس سے کہا:

''جناب یہ بتائیں یہ کیسے کھلتا ہے۔''

اس نے ریموٹ ہاتھ میں لیا، ٹی۔وی کھولا اور ہمیں بتایا: ''ایسے کھلتا ہے، ایسے بند ہوتا ہے، آواز یہاں سے کم ہوتی ہے یہاں سے تیز..... چینل ادھر سے.....''

''سمجھ گیا سمجھ گیا۔ یار ٹی۔وی لکھنؤ میں ہمارے گھر میں بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر سسٹم ہر set کا الگ ہوتا ہے۔''

کھلے ہوئی ٹی۔وی پر ہم نے خبریں دیکھنا شروع کیں۔ پہلی بار میں پورے پاکستان کو بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ پنجاب میں اس وقت ضمنی الکشن ہونے والے تھے۔ زوردار تقریریں ہو رہی تھیں، جلوس نکل رہے تھے۔ نعرے بلند ہو رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے میں نے چینل بدلنا شروع کیے تو پردے پر پاکستانی ثقافت کے خوش نما جلوے روشن ہوتے ہوئے نظر آئے۔ علاقائی تقریبیں، کوہستانی رقص، اسکولوں کے جلسے، موسیقی کی محفلیں، میدانوں میں ہوتے ہوئے کھیل۔ ہم یہ سب دیکھتے رہے پھر نہا دھو کر نیچے ڈائننگ ہال میں ناشتے کے لیے آ گئے۔ زینے سے اتر کر ہوٹل کے برآمدے میں ہمیں ایک بہت خوبصورت خاتون نظر آئیں:

ع شرمندہ جس سے چاند ہو چہرہ وہ تابناک

قاضی صاحب نے ان پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی لیکن میں نے انہیں سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ سیاہ کوٹ اور سیاہ پتلون میں ملبوس پہلی نظر میں اپنی وضع قطع سے وہ کوئی غیر ملکی خاتون معلوم ہوئیں۔ لیکن جب انہیں ہوٹل کے عملے میں گھلا ملا دیکھا تو سمجھ گیا کہ اسی ہوٹل سے متعلق ہیں۔ ہم ڈائننگ ہال میں پہنچے اور ایک بڑی سی میز پر بہت قرینے سے الگ الگ ظروف میں رکھی ہوئی مختلف چیزوں میں سے اپنی پسند کی کچھ چیزیں لے کر ایک میز پر آ بیٹھے۔ کچھ دیر بعد وہ بہت گوری اور اچھے ناک نقشے والی خاتون پھر نظر آئیں۔ قاضی صاحب نے پھر انہیں ترچھی نظروں سے دیکھا اور میں نے آنکھیں جما کر۔ وہ ایک میز پر کسی خاتون سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ میز بہت دور نہیں تھی اس لیے ان خاتون کی کھنکتی ہوئی آواز ہم تک پہنچ رہی تھی۔ وہ بہت منجھے ہوئے لہجے میں انگریزی بول رہی تھیں اور انہیں احساس تھا کہ میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ ایک دو بار انہوں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ میں انہیں دیکھ رہا ہوں یا نہیں، میری طرف دیکھا۔ ہر صاحبِ حسن خاتون ہر صاحب نظر سے اپنے حسن کی داد چاہتی ہے، سو

ان کا ہماری طرف دادِطلب نگاہوں سے دیکھنا غلط نہ تھا۔ اور میرا ان کی طرف دیکھنا اس لیے غلط نہ تھا کہ ان کا چہرہ ان چہروں میں تھا کہ:

ع جاتی ہے اس کے رخ پہ تو پھرتی نہیں نگاہ

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم اُس بہت بڑے اور بہت شاندار ہوٹل کے عقبی حصے کی سیر کو نکلے۔ دو قطعوں میں بٹے ہوئے اس حصے کے سبزہ زار پر چاروں طرف رنگ رنگ کے خوش نما پھول کھلے ہوئے تھے اور دور تک ترشی ہوئی گھاس کا بستر بچھا ہوا تھا:

ع مخمل سی وہ گیاہ وہ گلہائے سرخ و زرد

''مگر سمندر کہاں ہے؟'' اس حصے میں آتے ہی قاضی صاحب نے پوچھا۔

ان کے پوچھنے پر میں نے اپنے قریب سے گزرتے ہوئے اسی ہوٹل کے ایک شخص سے پوچھا:

''بھائی صاحب سمندر کہاں ہے؟''

''اُس طرف اور آگے جائیے۔''

ہم آگے بڑھے تو ایک طرف دور تک سبزۂ بالیدہ تھا اور دوسری طرف دو کشادہ حصے۔ ایک بالائی دوسرا نشیبی۔ ہم نشیب کے حصے میں پہنچے تو ہمیں پانی نظر آیا لیکن سمندر اب بھی نہیں دکھائی دیا۔

''سمندر کہاں ہے؟'' قاضی صاحب نے پھر پوچھا۔

اب کے اُس نے جواُن کی یہ بات سن رہا تھا ہمیں بتایا:

''پانی کا یہی کھلا ہوا حصہ آگے سمندر سے مل گیا ہے۔''

ہم اُس علاقۂ آب کو دیر تک کھڑے دیکھتے رہے اور دور تک اپنی نگاہ دوڑاتے رہے۔ اس حصے کے دونوں کناروں پر:

ع پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے

اور دور بہت دور کشتیاں کناروں سے لگی تھیں اور کچھ جہاز لنگر انداز تھے۔ ہم وہیں پر کھڑے کھڑے منظروں کے سلسلوں کو دیکھتے رہے اور ہوا کے فرح بخش جھونکوں سے لطف لیتے رہے:

ع سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا

کنارِ آب کے یہ روشن مرقعے آنکھوں میں لیے ہوئے ہم وہاں سے پلٹے تو ریسپشن پر دو تیکھے نقوش والی لڑکیوں سے ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور ہم نے خوش آمدید والی مسکراہٹوں سے ایک دوسرے کے تئیں تپاک ظاہر کیا۔ کمرے پر پہنچتے ہی میرے موبائل کی گھنٹی بجی:

''آصف فرخی بول رہا ہوں۔ آداب۔ کیا پروگرام ہے آپ کا۔''

''آداب آداب، پروگرام تو کوئی نہیں ہے۔''

''سفر کیسا رہا؟''

''تھکا دینے والا۔''

''تھکن اتر گئی؟''

''جی جی۔ رات خوب سوئے۔ جی بھر کر۔''

''میں تھوڑی دیر میں آرہا ہوں۔''

''آیئے آیئے میں انتظار کر رہا ہوں۔''

آصف سے بات ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد فراست بھابھی اور شعیب آگئے۔ بھابھی میرے لیے کھانسی کی دوائیں لے کر آئی تھیں، ہومیوپیتھی بھی اور ایلوپیتھی بھی۔ فراست بہت سی اسٹیشنری اور قلم لے آئے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو بولے:

''تین چار دن لکھنے پڑھنے کا بہت کام ہوگا، اس لیے لے آیا۔''

وہ لوگ کچھ دیر بیٹھے پھر سب ایک ساتھ نکل گئے۔ پھر آصف فرخی آئے اور اپنی دو کتابیں بھی ساتھ لائے۔ لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ ڈائننگ ہال میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو وہ بڑی محبت سے ملے اور میرے ساتھ لنچ میں برائے نام شریک ہوئے۔ کھانے کے دوران طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ نیر مسعود کی خیریت، فاروقی کی مصروفیت، نارنگ کا حال، کانفرنس کا ایجنڈا، اس کے شرکاء وغیرہ وغیرہ۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم اپنے کمرے پر آئے۔ قاضی صاحب اپنے کسی عزیز کے ساتھ کہیں چلے گئے تھے۔ کمرے پر پھر باتیں شروع ہوئیں۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور عبید صدیقی اندر داخل ہوئے۔ آصف اور وہ ایک دوسرے سے ملے اور اب باتیں نکلیں تو نکلتی چلی گئیں۔ ادب،

شاعری، تنقید، افسانہ، ہندو پاک کی ادبی صورتحال، چشمکیں، رنجشیں۔ عبید ادب اور سیاست میں کسی طرح کی رورعایت کے قائل نہیں۔ ان موضوعات پر بات کرتے وقت لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ زبان پر دھار ہے اس لیے بات منہ سے کھری نکلتی ہے۔ آصف بہت نستعلیق، شائستہ، نرم خو اور بذلہ سنج ادیب ہیں۔ اُن سے بات کیجیے تو:

ع ملتا ہے بات بات میں ہر دم نیا مزہ

لیکن چٹکی لینے سے نہیں چوکتے۔ اور چٹکی بھی ایسی کہ تلملانے کے باوجود آپ کچھ نہ کہہ سکیں۔ عالمی ادب پر اچھی نگاہ ہے۔ 'دنیازاد' نکال رہے ہیں اور بہت سلیقے سے نکال رہے ہیں۔ ادب کے ہر پہلو پر اچھی تحریریں جمع کرتے ہیں، اچھے مضامین لکھنے کے تقاضے کرتے ہیں اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی کی تحویلِ قلم میں کوئی اچھی تحریر ہے تو اسے جھپٹ لینے میں دیر نہیں لگاتے۔ یہی حال اجمل کمال کا بھی ہے:

ع اک مہرِ بے نظیر ہے اک بدرِ بے عدیل

''آج'' اور ''دنیازاد'' کراچی سے نکلنے والے دو ایسے رسالے ہیں جنہیں دوسروں کو دکھا کر میں غالب کے ایک مصرعہ کو بہ تحریف یوں پڑھا کرتا ہوں:

ع دیکھو اس طرح نکلتے ہیں رسالے اچھے

بات سے بات نکلنے میں گفتگو کا سلسلہ بڑھتا گیا اور اسی میں چار بج گئے۔ آصف ہم سے ملنے بھی آئے تھے اور یہ بتانے بھی کہ کل وہ مجھے اور عبید کو حبیب یونیورسٹی دکھانے لے جائیں گے۔ دہلی میں پروفیسر شمیم حنفی مجھے بتا چکے تھے کہ آصف اپنے اصل پیشے کو خیرباد کہہ کر اپنے اصل مزاج کے موافق حبیب یونیورسٹی کے شعبۂ ادبیات سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اگر حبیب یونیورسٹی ہر شعبے میں ایسے ہی دانا اور فرزانہ لوگوں کے خدمات حاصل کر رہی ہے تو بلاشبہ ایک دن وہ مثالی دانشگاہ ثابت ہوگی۔

''تو کل دس بجے۔''

بہ حضورِ ہمسایگاں

آصف ہمیں دعوت دے کر رخصت ہو گئے۔ عبید کسی اور طرف نکل گئے اور اس سے

پہلے کہ میں بستر پر دراز ہو کر اپنی کمر سیدھی کرتا، میرا دوست شعیب آ گیا۔ میں تیار ہوا اور اس کے ساتھ اس کی لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر اس طرف چل پڑا جہاں پہنچنے کے لیے میں کانفرنس کا دعوت نامہ ہاتھ آتے ہی بے چین ہو گیا تھا۔ وہاں میری وہ عزیزہ رہتی تھیں جو میری ماں کی بہت قریبی سہیلی تھیں۔ جنہوں نے مجھے گودیوں میں کھلایا تھا، جن کے آنگن میں میں گھٹنیوں دوڑا تھا اور اس کی مٹی میں لوٹا تھا۔ جن کے گھر میں لگے ہوئے درختوں کے پتے میری پشت پر گرے تھے اور میں نے انہیں اپنے دانتوں سے چبایا تھا۔ ماں بتاتی تھی جب وہ جاڑے میں گرم پانی سے مجھے نہلاتی تو یہی عورت مجھے اجلی سی چادر میں چھپاتی اور بدن سوکھ جانے پر دھوپ دکھاتی۔ یہ عورت جو میرے مکان سے ملے ہوئے مکان میں رہتی تھی، مجھے گھٹنیوں چلتا ہوا چھوڑ آئی تھی۔ میں اُسی عورت کو دیکھنے جا رہا تھا۔ بتانے والوں نے بتایا تھا کہ بال اس کے پوری طرح سفید ہو چکے ہیں، کمر اس کی جھک چکی ہے اور وہ نوے کو پہنچ رہی ہے لیکن حواس اب بھی اس کے بجا ہیں۔

یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ جب میں نے ہوٹل سے اس کے گھر کا فون ملایا تو اسی نے اٹھایا:

''کون؟'' آواز کی لرزش سے عمر کا پتہ چل رہا تھا۔

''عزت خالہ؟''

''ہاں کون۔''

''آداب، میں انیس، لکھنؤ سے، ذکّن کا لڑکا۔ ذکّن باجی، آپ کی سہیلی، آپ کے وجو بھائی کی بہن۔''

''ارے ارے..... جیتے رہو خوش رہو۔ تم آ گئے۔ خبر مل چکی تھی تمہارے آنے کی۔''

''میں آ رہا ہوں۔ آج شام کو۔''

''آؤ آؤ۔ ضرور آؤ۔ شام کو سب لوگ ہوں گے۔ جو نہیں ہوں گے انہیں بلا لوں گی۔''

''تو ٹھیک ہے میں شام کو حاضر ہوتا ہوں۔''

''کہاں رہتی ہیں تمہاری عزیزہ۔'' شعیب نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔

پتہ لکھوایا ہے انہوں نے۔ دیکھتا ہوں B-20, Block W North Nazimabad

گاڑی شاہراہِ فیصل پر جو کراچی کی سب سے لمبی اور سب سے چوڑی سڑک ہے آگے بڑھتی رہی۔ اس شاہراہ سے گزرتے ہوئے میں نے صاف ستھرے متوازی راستوں اور اونچی اور خوش نما عمارتوں کو آج اچھی طرح دیکھا اور دیوار ہائے شہر پر نعرہ نگارانِ شہر کی خطاطی کے مظاہرے بھی دیکھے۔ یہ ایمان ساز اور مسلک فروز نعرے طرح طرح کے خطوں میں نظر آرہے تھے۔ راستے سے ہم نے فراست کو ساتھ لیا اور شعیب اور فراست کی زبانوں سے علاقوں، بازاروں، دکانوں، راستوں اور عمارتوں کی تفصیل سنتے ہوئے ہم عزت خالہ کے علاقے میں داخل ہوگئے۔ کراچی کے بہت سے علاقوں کے نام بہت پہلے سے کانوں میں بیٹھے ہوئے تھے، انہیں میں سے ایک نام نارتھ ناظم آباد کا تھا۔ سو اس علاقے کو میں نے بڑے تجسس سے دیکھنا شروع کیا۔ کہنے کو تو یہ بلاک تھے لیکن ان کا رقبہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا اس لیے کسی کا گھر جب تک جائے رہائش کا صحیح اندازہ نہ ہو، ڈھونڈھ پانا آسان نہ تھا۔ اس لیے میں نے پھر عزت خالہ کو فون کیا۔ اب کے ان کی بہو نے اٹھایا۔ میں نے گھر ڈھونڈ نہ پانے کی بات بتائی تو انہوں نے علاقے کے مخصوص نشانات اور ان کی سمتیں بتائیں جنہیں شعیب نے سمجھ لیا اور ہم بالآخر ان کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازے پر ان کی بہو اور ان کے ساتھ کچھ اور لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں سلام کیا، انہوں نے ہمیں اندر لے جا کر بٹھایا۔ ایک ایک کر کے لوگ ڈرائنگ روم میں آنا شروع ہوئے اور انہوں نے مجھے دیکھنا شروع کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو یہیں کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے اپنے شوہر کی ماں سے، کسی نے اپنی دادی اور کسی نے اپنی نانی سے لکھنؤ کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ان میں سے ایک۔ دو لوگ لکھنؤ آ بھی چکے تھے۔ سب مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں بہت مقدس شے ہوں۔

تھوڑی دیر بعد ایک چہرہ، ایک چمکتا ہوا چہرہ سامنے آیا۔ کمر تھوڑی سی جھکی ہوئی، چہرے پر جھرّیاں، کہنیوں پر کی جلد لٹکی ہوئی۔ اس چمکتے ہوئے چہرے نے دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے گلے سے لگایا۔ یہ تھیں عزت خالہ۔ وہ سال دو سال کا بچہ جو ساٹھ باسٹھ برس پہلے روتے وقت چپ کرانے کے لیے ان کی گود میں دے دیا جاتا تھا آج اپنے پورے چھ فٹ کے قد کے ساتھ ان کی آغوش میں تھا۔ بہت دیر بعد جب انہوں نے مجھے اپنے آپ سے الگ کیا تو ان کی آنکھیں بھیگی

ہوئی تھیں۔ بہت دیر تک وہ چپ رہیں، مجھے دیکھتی رہیں، آنسو پونچھتی رہیں پھر بولیں:

''کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''اور سب لوگ کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔'' میں نے کہا۔'' آنے جانے والے تو آپ کو بتاتے رہے ہوں گے۔''

''ہاں۔ اب ہمارے ساتھ کا بچی کون وہاں۔'' یہ کہہ کر رندھی ہوئی آواز میں بولیں:

''عصمت تمہاری چھوٹی ممانی تو میرے سامنے ہی چل بسی تھیں۔ افضل ان کے شوہر کا یہاں کراچی میں بہت بعد میں انتقال ہوا۔'' پھر بولیں: ''اکیلے تھے یہاں۔ مرنے سے پہلے جو کچھ ان کے پاس تھا یہ کہہ کر مجھے دے گئے کہ اس کے عوض جو رقم ہو لکھنؤ میری بیٹیوں کو بھجوا دینا، بڑی تکلیف میں ہیں۔'' یہ بتا کر کہا: ''لکھنؤ سے اظہر (عزت خالہ کے ایک عزیز) آئے تھے۔ رقم میں نے ان کے ہاتھ بھجوا دی تھی۔'' پھر کہا:

''عصمت کی بڑی بیٹی شہناز کا بھی تو انتقال ہو گیا۔''

''جی۔ اور دو جو کے بیٹے قمر اور نیر بھی نہیں رہے۔'' میں نے انہیں بتایا۔

''اِنا للہ۔ کیا ہوا تھا انہیں؟''

''کینسر۔ دونوں کو۔''

''ایک تو مجھے یاد ہے۔ وہاں سے چلتے وقت دو سال کا تھا۔''

''قمر نام تھا اُن کا۔ مجھ سے ایک سال بڑے تھے۔''

''اور ذکن باجی تمہاری ماں، کیا ہوا تھا اُنہیں۔'' یہ پوچھ کر آنسو پھر ان کی آنکھ سے بہنے لگے۔

''زہر پھیل گیا تھا جسم میں، پانی کی کمی کی وجہ سے۔''

''ہاں سنا تو دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اور تمہارا بڑا بھائی، احسن نام تھا نا اس کا۔ وہ۔ وہ کیسے....''

''گردے خراب تھے۔ علاج ٹھیک سے نہیں کیا۔''

''خدا بخشے بہت شرارتی تھا۔ یہ...'' اُنہوں نے اس کمرے کی طرف جس میں ان کے شوہر لیٹے ہوئے تھے اشارہ کرتے ہوئے کہا، ہر وقت چھڑی لے کر اسے دوڑایا کرتے تھے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر بولیں: ''رو پیٹ کر بیٹھ رہی سب کو۔'' یہ سن کر میں نے ان سے کہا:

ع لازم ہے صبر و شکر کہ راضی رہے الہٰ

وہ کہتی رہیں: ''بس ایک بار گئی تھی لکھنؤ۔ یہاں آنے کے دو۔ تین برس بعد۔ پھر جانا نصیب نہیں ہوا۔'' پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولیں:

''اب کیا جاؤں گی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔''

اُن کا بیٹا، بہو، پوتے پوتیاں واقعات کا پس منظر جانے بغیر جو کچھ بولا جا رہا تھا اُسے سن رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ان کی بہو اٹھ کر کہیں چلی گئیں شاید باورچی خانے میں۔ عزت خالہ کے شوہر اُس کمرے سے جس کی طرف کچھ دیر پہلے انہوں نے اشارہ کیا تھا، نیا لباس پہنے چھڑی ٹیکتے اپنے بیٹے کا سہارا لیتے ہوئے باہر آئے۔ انہیں سنبھال کر صوفے پر بٹھایا گیا۔ جب وہ اچھی طرح بیٹھ گئے تو میں نے انہیں جھک کر سلام کیا۔ انہوں نے ہاتھ پھیلا کر مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا، قریب پہنچنے پر اپنے گلے سے لگایا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھتے، عزت خالہ نے اونچی آواز میں ان سے کہا:

''ذکن باجی کے لڑکے ہیں، لکھنؤ سے آئے ہیں۔''

''ہاں ہاں بتا تو چکی ہو۔ انہیں کا تو فون آیا تھا۔'' انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''کراچی پہلی بار آئے ہیں؟''

''جی، پہلی بار۔ نوکری ایسی تھی کہ آ نہیں سکا۔''

''کیا کرتے ہیں؟''

''پڑھاتا تھا، یونیورسٹی میں۔''

''ماشاءاللہ۔''

''اب ریٹائر ہو چکا ہوں۔''

''ہوں.... آپ کے بڑے بھائی تو آ چکے ہیں۔'' یہ کہہ کر عزت خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''کیا نام تھا اُن کا؟''

''انجم۔''

اُن کا بیٹا جو صوفے کے پیچھے کھڑا اپنے دونوں ہاتھ ان کے شانے پر رکھے ہوئے تھا بولا: ''ابھی بھی یاد سب رہتا ہے اور پرانی باتیں تو بہت یاد رہتی ہیں۔''

''کیا عمر ہے ماشاءاللہ۔''

''نوے سے اوپر۔''

''یہ وجو بھائی کا انتقال کب ہوا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بیس برس پہلے۔''

''کھیلتے تھے ہمارے ساتھ۔ ہاکی، اور فٹ بال بھی۔ اور وہ ماسٹر آفتاب جوان کے گھر میں رہتے تھے۔ وہ تو وجو بھائی سے پہلے.....''۔

''جی۔ ان کے انتقال سے چار۔ پانچ برس پہلے.....''۔

''بہت اچھی ہاکی کھیلتے تھے۔ سنٹر فارورڈ کی پوزیشن سے۔ دونوں ٹانگوں پر چوٹیں ہی چوٹیں تھیں۔'' یہ بتا کر پوچھا: ''تو یہاں کیسے آئے؟''

''ایک کانفرنس میں۔''

''ہاں کچھ اخبار میں پڑھا تو ہے اس کے بارے میں۔'' انہوں نے کہا۔ پھر پوچھا: ''اچھا تو یہ بتایئے اب ہمارے مکان میں.... کون رہتا ہے۔ کچھ برس ادھر از ہر آئے تھے۔'' وہ بولے۔ ''اور ان سے پہلے اچھے.... بتاتے تھے کلکتے کے کسی صاحب نے ریحانہ سے خریدا تھا۔ ریس کورس میں جاکی تھے شاید۔''

''وہی لوگ ہیں، لیکن سب نے اپنے اپنے حصے الگ کر لیے ہیں اور کچھ حصے باہر والوں نے خرید لیے ہیں۔ ایک حصہ آپ کے وجو بھائی کی سب سے چھوٹی لڑکی نے لے لیا ہے۔''

''اور خود ان کا مکان، ہے؟''

''ہے، اب دومنزلہ ہو گیا ہے۔''

''اور تمہارا تو.........''ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے عزت خالہ بولیں:''ہم لوگوں کے آنے کے بعد ہی چلا گیا تھا مہاجن کے پاس۔ انجم تمہارے بھائی نے بتایا تھا سب۔''یہ کہہ کر ایک ٹھنڈی سانس لی، بولیں:''بھائی صاحب''اُن کا اشارہ میرے والد کی طرف تھا، زندگی بھر جائدادیں بیچتے رہے یا مہاجنوں کے پاس رہن رکھتے رہے۔ اولادوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔''

شعیب اور فراست ڈرائنگ روم کے باہر والے حصے میں بیٹھے تھے۔ وہاں ایک میز پر پلیٹیں لگائے جانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''کب تک رہیں گے۔''؟ عزت خالہ کے شوہر نے پوچھا۔

''ایک ہفتہ، لیکن ویزا پندرہ دن کا ہے۔ ہوسکتا ہے ٹکٹ بڑھوالوں۔''

''ضرور بڑھوا لیجیے۔ ایک ہفتے میں کیا دیکھ سکیں گے کراچی، اور ٹھیک سے مل بھی نہیں پائیں گے سب سے۔''

بیرونی حصے سے عزت خالہ کی بہو کی آواز آئی۔''امی ناشتہ لگ گیا ہے۔''

''چلو۔''

میں اٹھنے لگا تو شبیہ الحسن، عزت خالہ کے شوہر بولے:

''یہ بتائیے کہ مینا وہ جو قیصر باغ بارہ دری کے سامنے کوثوارہ ہاؤس سے ملے ہوئے حصے میں رہتی تھیں، زندہ ہیں؟''

''کون مینا؟''

''مینا شاد[1]۔ بیڈمنٹن کھیلتی تھی۔ بعد میں تو بہت بڑی کھلاڑی بنی۔''

''جی جی جی۔ بہت تیز اسکوٹر چلاتی تھیں۔ اُس وقت تو لکھنؤ میں اتنے اسکوٹر تھے بھی نہیں۔'' میں نے کہا۔''ہماری طرف نخاس والی سڑک سے فرّاٹے بھرتی نکل جاتیں۔

---

[1] بیڈمنٹن کی اس شہرۂ آفاق کھلاڑی کا یہ سطریں لکھتے وقت (مارچ ۲۰۱۵ء) ۷۸ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

پٹے تھے ان کے۔''

''ہاں بہت چھوٹی عمر سے رکھنے لگی تھی۔ میرے پاس تو روز آتی تھی۔ اسپورٹس ٹیچر تھا میں، کھیل تو میں نے ہی سکھایا تھا اُسے۔''

''یقین سے کہہ نہیں کہہ سکتا کہ زندہ ہیں یا....نظر نہیں آئیں بہت دنوں سے۔'' میں نے کہا۔ پھر مجھے کچھ یاد آیا اور یاد آتے ہی میں نے ان سے کہا:

''پانچ چھ برس کا تھا میں لیکن اچھی طرح یاد ہے۔ اماں کے ساتھ اُنہیں مینا شاہ کے گھر گیا تھا۔ کجن ماموں......'' میں رُکا اور عزت خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''آپ کے بھائی یہاں پاکستان آنے سے پہلے اپنا مکان بیچ کر وہیں جا کر رہے تھے۔ مجھے تو پورا منظر یاد ہے۔ گلے میں پٹی بندھی تھی اُن کے۔''

''کینسر ہو گیا تھا انہیں۔'' عزت خالہ بولیں۔

''لیکن سگریٹ اس وقت بھی پی رہے تھے۔ کیپسٹن کا ٹن پچاس سگرٹوں والا ان کے سامنے رکھا ہوا تھا۔''

''یہ آپ لکھتے کیا جا رہے ہیں۔'' شبیہ الحسن میری طرف دیکھ کر بولے۔

''یہاں کی باتیں.......اور یادیں۔''

کجن ماموں کا ذکر نکلا تو مجھے ان کی بیٹی صوفیہ یاد آئی۔ کجن ماموں کی انگریز بیوی کی لڑکی۔ کیسی گڑیا سی تھی۔ اپنے گھر کے چبوتروں پر ایک ساتھ کھیلتے تھے ہم۔ وہ بھی پٹوں والی تھی۔ لڑائی ہوتی تو آگے سے وہ میرے بال اور پیچھے سے میں اس کے پٹے پکڑ لیتا، پھر ہیّو اس کا بھائی ہم دونوں کو آ کر الگ کرتا۔ الگ ہوتے ہی وہ کہتی:

''ایڈیٹ! آئی ہیٹ یو۔''

''کیا کہہ رہی ہے؟'' میں ہیّو سے پوچھتا تو وہ مسکرانے لگتا۔ کچھ دیر بعد صوفیہ آتی۔ دروازے سے لگ کر پکارتی ''اتو!!'' اور جب میں دروازے پر دوڑا ہوا جاتا تو ایک چاکلیٹ میرے ہاتھ میں تھماتی اور Sorry کہہ کر بھاگ جاتی۔ کجن ماموں کی دراز قد بیوی جنہیں سب میم صاحب کہتے تھے، محرم میں سیاہ لباس پہن کر عزا خانے کے سامنے سب سے آگے بیٹھتی تھیں، ماتم

بھی بہت جوش میں کرتی تھیں اور جیسے ہی ماتم ختم ہوتا، ایک کونے میں بیٹھ کر سگریٹ پینے لگتیں۔

''اور وہ ببّو اور صوفیہ، کجن ماموں کے بیٹے اور بیٹی۔ یہیں ہیں کراچی میں یا کہیں اور چلے گئے۔''

''اِدھر کی تو کچھ خبر نہیں۔ دو۔ چار برس پہلے تک وہ جو قائدِ اعظم کا مزار ہے اُسی کے آس پاس کسی عمارت کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ یہ لوگ صحیح بتائیں گے۔'' عزت خالہ اپنے بیٹے اور بہو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ پھر بتایا: ''صوفیہ کی شادی تو باقر کے لڑکے راجو سے ہوگئی۔''

''امّی ناشتہ۔'' عزت خالہ کی بہو کی آواز پھر آئی۔

میں نے عزت خالہ کے شوہر کو سلام کیا۔ اُن کے بیٹے نے سہارا دے کر اُنھیں اٹھایا اور جب وہ اس کمرے کی طرف جہاں سے نکل کر آئے تھے جانے لگے تو مڑ کر بولے:

''ٹھیک سے بولا نہیں جاتا۔ بہت کچھ جاننا چاہتا تھا آپ سے۔ ابھی تو ہیں۔ پھر آیئے گا۔'' یہ کہہ کر پوچھا: ''اور وہ ہمارے دوست عابد علی جو شیعہ کالج میں اسپورٹس ٹیچر تھے، وہ بھی تو چل بسے۔ جانتے ہیں اُنھیں؟''

''اچھی طرح۔ اُن کے بیٹے تو میرے دوست ہیں۔''

''اولمپک تک گئے تھے کھیلنے۔ دھیان چند کے ساتھ کھیلے ہوئے تھے۔ کیا حال ہے ان کے بچوں کا؟''

''ٹھیک ہیں سب۔'' ''سب کا شادی بیاہ ہو چکا ہے۔''

''اور وہ شہنشاہ.... شہنشاہ پیارے..... وہ بھی شیعہ کالج میں پڑھاتے تھے۔''

''جی۔ انٹر سیکشن میں، اردو۔''

''ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے۔ عابد ہی کے ساتھ کھیلتے تھے۔ شاہ گنج میں رہتے تھے شاید۔''

''وہ مکان چھوڑ کر کشمیری محلّے چلے گئے تھے۔ انتقال ہو گیا ان کا بھی۔''

''اناللہ۔''

''اب چل کر لیٹیے۔'' ان کے بیٹے نے کہا۔ ''یہ پھر آئیں گے۔''

میں باہر والے حصے میں آیا تو میز پر انواع و اقسام کی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ شعیب اور فراست عزت خالہ کی بہو سے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کی بہو اپنے بچوں کے بارے میں بتا رہی تھیں کون کہاں پڑھ رہا ہے، کون سا امتحان پاس کر چکا ہے کس امتحان کی تیاری کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

''آپ لکھنؤ میں کہاں رہتے ہیں؟'' ان کی بہو نے پوچھا۔

''گومتی نگر میں۔''

''ارے ابھی تو ایک سال پہلے میں گئی تھی وہاں۔ ہمارے بہنوئی رہتے ہیں۔ اردو اکادمی میں نوکر ہیں۔''

''وہ تو اچھی طرح جانتے ہیں مجھے۔ میرے گھر سے بہت قریب ہیں۔''

''لیجیے۔'' ان کی بہو نے ناشتے کی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنی پلیٹ میں بہت عمدہ تلے ہوئے دو۔ تین شامی کباب رکھتے ہوئے کہا:

''یہ کھا کر مجھے اپنا شہر یاد آئے گا۔''

پھر کباب کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے شعیب اور فراست سے کہا:

''کھائیے بالکل لکھنؤ کا مزہ ہے۔''

ہم سب نے ساری چیزیں مزے لے لے کر کھائیں اور کباب سب سے زیادہ کھائے۔ اس کھانے پینے کے بیچ لکھنؤ کے پرانے محلوں کی باتیں نکلیں، امام باڑوں اور درگاہوں کا ذکر آیا، محرم کی مجلسوں کے تذکرے ہوئے۔ باتیں نکلتی جا رہی تھیں اور شعیب اور فراست پہلو بدل رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہی میں اٹھنے لگا تو عزت خالہ بولیں: ''رات کا کھانا کھا کر جاؤ۔''

''شکریہ۔ وقت ملا تو پھر آؤں گا۔ یہ لوگ بہت دیر سے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں۔''

''لیکن آنا ضرور۔''

''رہا تو ضرور آؤں گا۔''

اُن سب نے دروازے تک آکر ہمیں رخصت کیا اور جب تک ہماری گاڑی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوگئی وہ سب اپنے دروازے پر کھڑے رہے۔

●

گاڑی ناظم آباد کے ڈبلو بلاک کے پتلے راستوں سے نکل کر باہر چوڑی سڑک پر آئی اور ایک لمبے فاصلے کے بعد فراست ایک جگہ یہ کہہ کر اتر گئے کہ یہاں سے ان کا گھر بہت قریب ہے، وہ ٹہلتے ہوئے چلے جائیں گے۔ میرا سینہ بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا کھانسے جا رہا تھا۔ اکتوبر کے مہینے کے اس عذاب سے میں خود کو بچا کر بھی نہیں بچا پاتا۔ اس مہینے کے شروع میں ہر سال مجھے حضرت علی کا یہ قول یاد آتا ہے:

''آتی ہوئی سردی میں اس سے احتیاط کرو اور جاتی ہوئی سردی کو
خوشی خوشی رخصت کرو۔ کیونکہ سردی جو درختوں کے ساتھ کرتی ہے
وہی جسموں کے ساتھ۔ آتے وقت وہ درختوں کو جھلس دیتی ہے اور
جاتے وقت درخت شاداب کر جاتی ہے۔''

اس مہینے میں ہر بار زود احتیاطی کے باوجود کچھ بے احتیاطی ہو جاتی ہے اور نزلہ مجھے پکڑ لیتا ہے۔ لیکن اکتوبر کے جاتے جاتے سینہ صاف ہو جاتا ہے۔ میں گاڑی میں بیٹھا بری طرح کھانس رہا تھا، کھانستے کھانستے میں نے شعیب سے کہا: ''یار گاڑی کسی دوا کی دکان پر روکو اور کوئی اچھی سی دوا لو میرے لیے۔''

شعیب نے گاڑی ادھر اُدھر کے راستوں پر گھما کر 'ٹائم میڈیکو' نام کی دوا کی ایک مشہور دکان پر روکی اور دو۔ تین طرح کی دوائیں اور شربت کی ایک شیشی میرے لیے خریدی۔ وہ دوکاندار کو دواؤں کے نام اس طرح بتا رہا تھا جیسے مریضوں کے نسخوں پر انہیں لکھتا رہا ہو۔ شعیب نیم حکیم ہے لیکن خطرۂ جان نہیں۔ دوائیں لینے کے بعد گاڑی ایک سیدھی سڑک پر آگے بڑھنے لگی۔ اس سڑک پر بہت دیر تک بڑی تیز رفتاری سے چلنے کے بعد ایک بہت بڑے دروازے پر پہنچ کر اس کی رفتار دھیمی ہوئی۔ پھر وہ رکی۔ دروازے پر مسلح پہرہ دار کھڑے تھے،

انہوں نے گاڑی کو دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔

''یہ عسکری۔۴ ہے، یہیں ہے میرا غریب خانہ''۔شعیب نے کہا۔

یہ بہت وسیع اور کشادہ علاقہ تھا۔ایک لمبی اور پختہ سڑک دور تک چلی گئی تھی جس کے دونوں طرف دور تک خوش نما عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔شعیب کی گاڑی کچھ دور چل کر ایسی ہی ایک خوش نما عمارت کے سامنے جا کر رکی اور فوراً ہی اس کا دروازہ کھلا۔

''یہ ہے آپ کے دوست کا غریب خانہ'حیدر ولا'۔'' شعیب نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔اس دو منزلہ 'غریب خانے' میں ایک بڑا سا پورٹیکو تھا، ایک اچھا سا لان جس کے چاروں طرف مختلف رنگوں سے رنگے ہوئے گملوں میں خوش نما پھول کھلے تھے۔ایک شاہانہ ڈرائنگ روم تھا جس میں بہت نفیس اور قیمتی صوفے پڑے تھے اور فرش پر ایک خوبصورت ایرانی قالین۔ڈرائنگ روم کی دیواروں، اس کے کونوں اور کناروں پر بہت مہنگی اور بہت اچھی نظر آنے والی اشیا کی آرائش تھی۔دونوں منزلوں پر بڑے بڑے رہائشی کمرے تھے۔اس وقت شعیب کے نوکر کے سوا گھر میں کوئی نہیں تھا۔اس کی بیوی اور بچے جنہیں دیکھنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا، کسی شادی میں گئے ہوئے تھے۔اسی شادی میں شعیب کو بھی جانا تھا۔شعیب کی بیوی ایک دو روز پہلے ہی حج کر کے واپس آئی تھیں۔اس نے مجھے اندر والی اس بیٹھک میں بٹھایا جہاں گھر والے یا بہت قریبی عزیز بیٹھتے تھے۔شعیب شادی میں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا اور اس کا نوکر مجھے بریانی گرم کر کے کھلا رہا تھا۔جب وہ تیار ہو چکا اور میں بریانی کھا چکا اور جب ہم دونوں گاڑی میں بیٹھنے کے لیے باہر نکلے تو میں نے اس کے گھر کو دیکھتے ہوئے کہا:

''یار! اگر یہ غریب خانہ ہے تو دولت خانہ تمہارا کیسا ہوگا۔''

یہ اُس شعیب کا دولت خانہ تھا جس نے لکھنؤ میں بڑی غربت اور جفاکشی کی زندگی گزاری تھی۔لکھنؤ کے مشہور علاقے چوک میں واقع مسجد تحسین علی خاں کے پہلو میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے گھر میں اس کی رہائش تھی جہاں وہ اپنے ماں باپ، اپنی دو بہنوں، اپنی خالہ اور ان کے ایک لڑکے کے ساتھ رہتا تھا۔یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ اس کا خالہ زاد بھائی آصف اس دنیا میں نہیں ہے۔یہ وہی آصف تھا جس کے ساتھ مسجد کے پہلو والی جگہ میں ہم

گٹھوں کے وکٹ بنا کر یا دیوار پر کوئلے سے نشان کھینچ کر کرکٹ کھیلتے تھے اور اسی میں اس کی تیز گیند سے میں کئی بار زخمی بھی ہوا تھا۔ شعیب کے باپ نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ٹوریا گنج میں پرچون کی ایک دکان کھولی، وہ نہیں چلی تو چوک میں ٹنڈے کبابی کے سامنے متفرق سامانوں والی ایک دکان کھولی۔ شعیب جو حسین آباد انٹر کالج میں پڑھتا تھا اکثر اس دکان پر بیٹھتا تھا۔ حساب میں بہت تیز تھا، کھیلوں میں بھی پیش پیش رہتا اور کرکٹ اچھی خاصی کھیل لیتا۔ حافظہ بہت قوی تھا اور اب بھی ہے۔ میرے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی اسے ایک ایک بات یاد ہے۔ میری اور اس کی ماں کے بیچ ایک مشترک پہلو یہ تھا کہ دونوں اپنی حدیث خوانی کے لیے مشہور تھیں۔ طرح طرح کی تدبیروں کے باوجود جب حالات نہیں بدلے تو ایک دن اُسی سال جب فراست کراچی آیا تھا، شعیب بھی آ گیا اور اسی کے بعد اس کے خاندان والے بھی۔ یہاں اس نے اپنے عزیزوں کی مدد سے اپنی پڑھائی پوری کی، ایم۔ ایس۔ سی۔ کیا، ایم۔ بی۔ اے بھی کر ڈالا۔ حبیب بینک میں نوکر ہوا، عزیزوں ہی میں ایک سلیقہ مند خاتون سے شادی کی، دبئی گیا، وہاں اپنا کاروبار جمایا۔ جی اکتایا تو کراچی لوٹ آیا۔ یہاں ''مانٹیسری ورلڈ'' کے نام سے بہت سے اسکول اور کالج کھول کر قسمت آزمائی کی اور سرفراز ہوا۔ تھیلی اشرفیوں سے بھری، جاہ و حشم بڑھا تو کراچی لائنس کلب کا چیرمین ہوا۔ اب ایک اچھی سی بیوی اور اچھے عہدوں پر فائز تین اطاعت گزار بیٹوں کے ساتھ آرام کی زندگی گزار رہا ہے۔ ان بیٹوں کو دیکھ کر دعا کرنے کو جی چاہتا ہے:

ع دے ایسے لال سب کو زمانے میں کردگار

لکھنؤ کی غربت، وہاں کی سڑکوں پر بہایا ہوا پسینہ، کنبے کو خوش دیکھنے کی خواہش رنگ لائی اور کراچی کی بستی اسے راس آئی۔

گاڑی شعیب کے مکان کے آہنی پھاٹک سے باہر نکل رہی تھی، اس نے پہلے مجھے میرے ہوٹل پہنچایا پھر اس شادی میں گیا جہاں پہلے سے اس کے گھر والے موجود تھے۔

میں کمرے پر پہنچا تو قاضی افضال سوئے ہوئے تھے۔ کپڑے بدل کر میں بھی بستر پر دراز ہو گیا اور لیٹتے ہی صوفیہ کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومنے لگا۔ ''اب تو اس کے بچے بھی

بہت بڑے ہو گئے ہوں گے۔'' میں نے سوچا۔ راجو، باقر ماموں کا لڑکا جس کے ساتھ صوفیہ کی شادی ہوئی تھی، میرے ساتھ کھیلتا تھا۔ خوبصورت پنو جس کا قتل یہیں کراچی یونیورسٹی میں ہوا تھا، اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ زندہ رہتا تو صوفیہ اُسی کو پسند کرتی۔ لکھنؤ میں جب میرے ساتھ کھیلتی تھی اور جب گھر میں شادیوں والے گانے گائے جاتے تھے اور دولہا۔ دلہن کی باتیں ہوتی تھیں تو بڑی بوڑھیوں میں سے کوئی مجھ سے پوچھتا:

''گڈے تو بھی کرے گا شادی؟''

''ہاں کروں گا۔''

''کس کے ساتھ؟''

''صوفیہ کے ساتھ۔''

یہ سن کر ایک ساتھ بہت سے قہقہے بلند ہوتے۔

چھوٹی عمر کی وہ باتیں اور اِن باتوں سے بھری ہوئی دنیا کیسی روشن اور صاف ہوتی ہے۔ ریا سے پاک مکر سے عاری۔

''ایڈیٹ! آئی ہیٹ یو۔''

''اُلّو.. Sorry۔''

بڑے ہو کر یہ دنیا ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ بہت سی چاکلیٹیں خرید کر کھائیں، بہت سی خرید کر اپنے بچوں کو کھلائیں لیکن صوفیہ کی دی ہوئی چاکلیٹ کو لینے، اُسے کھولنے، اسے کھانے اور نرم پڑ کر انگلیوں میں لگ جانے کے بعد اسے چاٹنے کا ذائقہ، حواس جب تک باقی رہیں گے، زندہ رہے گا۔ میں نے کروٹ بدلی اور صوفیہ کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔

حیرت خانۂ تعمیر

صبح میں جلدی اٹھ گیا۔ آصف فرخی آنے والے تھے۔ قاضی صاحب بھی جلدی تیار ہو گئے۔ انہیں اپنے عزیز کے ساتھ کسی اور عزیز کے یہاں جانا تھا۔ میں اور عبید صدیقی ناشتے سے فارغ ہو کر آصف کے منتظر تھے۔ فون کی گھنٹی بجی، آصف کی آواز آئی:

''تیار ہیں؟''

''جی۔ تیار ہیں۔''

''بس آ رہا ہوں، راستے میں ہوں۔''

''آیئے، آیئے۔''

تھوڑی دیر بعد آصف آ گئے اور ہم ان کے ساتھ حبیب یونیورسٹی دیکھنے چل پڑے۔ کراچی کی شاندار شاہراہِ فیصل سے گزرتے ہوئے اور ادبی دنیا کی صورتحال پر گفتگو کرتے ہوئے ہم بالآخر گلستانِ جوہر میں داخل ہوئے اور گاڑی اپنی رفتار دھیمی کرتی ہوئی ایک بڑے سے آہنی پھاٹک کے سامنے جا کر رکی۔ دربان نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی۔ گاڑی سے اترتے ہی یونیورسٹی کے بالکل نئی طرح کے طرزِ تعمیر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ سب سے پہلے ہماری نگاہ زیرِ تعمیر یونیورسٹی کے اس ماڈل پر گئی جو صدر دروازے کے بالکل سامنے کے برآمدے میں ایک خوبصورت سی میز پر شیشے کی دبیز دیواروں کے اندر رکھا تھا۔

''ابھی ایک صاحب آپ کو اس پورے ماڈل کے بارے میں بتائیں گے۔'' آصف نے کہا۔ زینوں، راہداریوں، چبوتروں، صحنوں اور آدھی کھلی ہوئی چھتوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے ہم اُس حصے میں داخل ہوئے جہاں ادبیات اور سماجی علوم کے شعبے تھے۔ آصف راستے میں ہمیں بتا چکے تھے کہ پاکستان کے صاحبِ ثروت خاندانِ حبیب کے فلاحی ادارے نے اس یونیورسٹی کی تعمیر اور یہاں دی جانے والی تعلیم کے لیے چالیس ملین ڈالر کا بجٹ بنایا ہے۔ اس حصے میں پہنچ کر آصف نے ہماری ملاقات دوسرے شعبوں کی شخصیتوں سے کرائی۔ ان میں سے ایک نعمان نقوی تھے۔ گول اور بھرا ہوا چہرہ، کشادہ پیشانی، سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں سیاہ و سفید کی آمیزش، تیز اور چمکتی ہوئی آنکھوں پر چڑھی ہوئی عینک، آدھی آستین کی شرٹ اور اس پر ایک خوش رنگ سوتی صدری، گہرے نیلے رنگ کی جینس۔ نقوی صاحب سماجی علوم اور ادبیات کے شعبے کے سربراہ تھے۔ اسٹیج اور ڈرامے سے دلچسپی تھی۔ لکھنوی تہذیب و ثقافت سے بھی واقف تھے۔ اندر سبھا، نوٹنکی، واجد علی شاہ کی 'راس لیلا' کے بارے میں پڑھ رکھا تھا نیز موسیقی اور رقص کے لیے اس بادشاہ کے خدمات کی بھی خبر تھی۔ جب ان سے میرا تعارف ہوا تو میں نے ان سے پوچھا:

''امروہے کے ہیں؟''

''نہیں۔''

''مصطفےٰ آباد کے؟''

''نہیں وہاں کا بھی نہیں۔''

''ہندوستان میں نقوی انہیں دونوں جگہوں پر زیادہ ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اگر آپ ہماری طرف سے آئے ہیں تو وہیں کے ہوں گے۔''

اوراس سے پہلے کہ وہ بتاتے کہ وہ کہاں کے ہیں کوئی اور بات نکل آئی۔آصف ان کی صلاحیتوں اور صفتوں کے بارے میں بتاتے رہے۔نقوی صاحب ہی کے شعبے سے ایک دوسرے صاحب ڈاکٹر حسن علی خاں سے بھی ہمارا تعارف ہوا۔گھنی مونچھیں، چوڑی پیشانی، میانہ قد۔دیکھنے میں چست اور پھرتیلے لیکن ان سے ہماری بات زیادہ نہیں ہوئی۔چائے آگئی تھی اور باتیں ہو رہی تھیں۔عبید صدیقی، نقوی صاحب سے کچھ اپنے کچھ پرائے قصے چھیڑے ہوئے تھے۔بیچ بیچ میں گزشتہ اور موجودہ لکھنؤ کی بات بھی نکل آتی۔اسی سلسلۂ گفتگو کے دوران ایک خاتون وارد ہوئیں۔عمر یہی کوئی تیس کے آس پاس۔میانہ قد، خوش رو اور خوش پیرہن، بال سیاہ اور:

ع آنکھیں وہ جس سے نرگسِ فردوس کو حجاب

ابروخمدار جنہیں تراش کر اور پرکشش بنایا گیا تھا:

ع وہ ابروؤں کے خم کہ ہلالِ فلک کٹے

ناک ستواں، ہونٹ باریک۔نصف گردن تک آئے ہوئے بال۔مانگ ترچھی۔داہنی طرف بالوں کا حجم کم اور بائیں طرف زیادہ اور اس حجم میں ابرو کا نصف سے زیادہ حصہ چھپا ہوا۔

''یہ ہیں نوشین، ڈاکٹر نوشین علی۔اسی شعبے سے متعلق ہیں۔'' آصف نے ہم سے اُن کا تعارف کرایا۔''اردو سے ان کی بڑی دل چسپی ہے اور اردو سے متعلق ان کی ایک سائٹ بھی ہے۔''

تیکھے ناک نقشے والی ان خاتون نے بولنے کے لیے جب اپنے ہونٹ کھولے تو شگفتگی اور شائستگی کی ایک لہر ہمارے کانوں تک آئی اور اسی کے ساتھ ایک آواز آئی:

ع کھلتے ہیں گُل شگفتہ بیانی کو دیکھنا

یوں لگا جیسے وہ اپنے لہجے پر سے ہر وہ پرت ہٹا دینا چاہتی ہوں جس میں ذرا سی بھی سختی کا شائبہ ہو۔ان سے ہماری بہت سی باتیں ہوئیں۔ کچھ دیر بعد وہ صاحب آ گئے جنہیں باہر رکھے ہوئے اس یونیورسٹی کے ماڈل کو دکھا کر ہمیں بتانا تھا کہ دور تک پھیلی ہوئی اس شاندار عمارت کے پیچھے طرزِ تعمیر کا فلسفہ کیا ہے۔اچھے بات مانس والے یہ نوجوان ہمیں اور عبید کو اپنے ساتھ لے کر چلے، ساتھ میں آصف بھی تھے۔ زینوں سے اترتے، چبوتروں پر چڑھتے اور کمروں میں داخل ہوتے ہوئے لوگ رک رک کر آصف سے علیک سلیک کرتے۔ان میں طلبہ بھی تھے، استاد بھی اور غیر تدریسی عملے کے افراد بھی۔ان میں سے کسی کسی سے آصف ہمیں ملواتے بھی۔ یہ یہ ہیں، یہ یہ ہیں، یہ بہت عمدہ لکھتی ہیں، یہ بہت عمدہ آرٹسٹ ہیں، یہ طبیعیات کے بہت اچھے استاد ہیں وغیرہ وغیرہ۔ وہ چست اور تندرست نوجوان نام ان کا شاید حمزہ تھا، شیشے کے خوش نما صندوق میں رکھے ہوئے ماڈل کے پاس ہمیں لے کر آئے اور بڑی دل جمعی سے انہوں نے انگریزی میں اس عمارت کے فلسفۂ تعمیر اور اس کے مختلف حصوں کے زاویوں کی باریکیوں کے بارے میں ہمیں سمجھایا۔انہوں نے بتایا کہ اس عمارت کی تعمیر میں عالمی شہرت یافتہ ماہرینِ تعمیرات سے مدد لی گئی ہے اور اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ عمارت اپنی ساخت کے اعتبار سے ایسا ماحول پیدا کرے جو طلبہ کے باطنی جوہروں کو مہمیز اور نئے آفاق کی جستجو کے لیے انہیں متحرک کر سکے۔اس کی صداقت کا احساس ہمیں یوں ہوا کہ جتنی دیر ہم اس یونیورسٹی کے مختلف حصوں میں گھومے ہم نے خود کو ایک اور دنیا میں پایا۔ایک ایسی دنیا جو اس طرز و تاب کے ساتھ ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ الگ طرح کے پڑھائی والے کمرے، الگ قسم کا کتاب خانہ، الگ ڈھنگ کے آڈیٹوریم، الگ رنگ کے اساتذہ اور الگ طور کے طلبہ۔ چھ ایکڑ کے وسیع رقبے میں ڈھائی لاکھ مربع فٹ زمین پر واقع اس تعلیمی ادارے کو سبقت اور فضیلت والا ادارہ بنانے کے لیے تین خصوصی لازموں کا خیال رکھا گیا ہے: (۱) عالمی سطح کی لیاقت والے استاد (۲) عالمی معیار کے ساز و سامان سے اس کی آراستگی اور (۳) عالمی پیمانے کی صلاحیت رکھنے والے طلبہ۔ بڑی اور عالمی دانشگاہوں سے آنکھ ملانے والی اس یونیورسٹی کو عمل میں لانے کے پسِ پشت عربی کے ایک لفظ 'سکنہ' کی بلاغت کارفرما ہے۔ یہ لفظ حضرت علی نے

اپنے ایک قول (اکیاسیواں قول) میں استعمال کیا ہے اور اس کے پوشیدہ رمز کو ظاہر کیا ہے۔ وہ قول ہے:

"قیمۃُ کُلِّ امرئ مایحسنہٗ۔"

(ہر شخص کی قیمت وہ ہنر ہے جو اس میں ہے)

آں کہ ہر کس را بقدرِ دانشِ او قیمت است

اس قول کو یونیورسٹی کا لوگو (Logo) بنایا گیا ہے اور 'یحسنہ' کی صراحت میں کہا گیا ہے: "یحسنہ" ایک ایسا عمل ہے جو پانچ بنیادی اور جداگانہ خصوصیات سے عبارت ہے: مہارت، حسن، خدمتِ خلق، جوش و جنون، تعظیم و تکریم۔

علم و ہنر سے متعلق حضرت علی کے بہت سے اقوال کے ساتھ میں اس قول کو حضرت علی پر کی جانے والی تقریروں میں برابر استعمال کرتا رہا ہوں اور حسبِ فہم اس کے رموز بھی روشن کرتا رہا ہوں۔ لیکن میرے حیطۂ خیال میں کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ یہ قول ایک ادارے اور بہت بڑے ادارے کی تشکیل کا محرک بن جائے گا۔ سیّد رضی نے اس قول کی تشریح میں لکھا ہے کہ: "انسان کی اصل قیمت اس کا جوہرِ علم و کمال ہے، وہ علم و کمال کی جس بلندی پر فائز ہوگا اسی کے مطابق اس کی قدر و منزلت ہوگی۔"

خاندانِ حبیب نے اسی جوہرِ علم و کمال کی جستجو کے لیے اس ادارے کو قائم کیا ہے۔ وہ نوجوان جو خوبصورت ماڈل کے ذریعے اس یونیورسٹی کی الگ طرح کی ساخت کا سبب بتا رہے تھے، سب کچھ بتا کر ہمیں اس ماڈل کے سامنے والے حصے کی طرف لے کر آئے اور بولے: "اب اسے دیکھیے۔" میں نے اسے دیکھا اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں بہت لمبے اور بہت چوڑے زینوں پر چڑھتا ہوا اوپر کی طرف جا رہا ہوں اور ہر زینے پر پہلے والے زینے سے زیادہ زینت و آرائش ہے۔ میں نے دنیا بہت نہیں گھومی لیکن دیکھی ہوئی دنیا میں جتنی عمارتیں دیکھی ہیں ان میں ندرت اور غرضِ تعمیر کے اعتبار سے یہ دوسری عمارت تھی جو میری آنکھوں میں اہم ٹھہری۔ پہلی عمارت بھوپال کا وہ بھارت بھون ہے جو فنونِ لطیفہ کا گہوارہ کہا جاتا ہے اور جس کا نقشہ مشہورِ عالم ماہرِ تعمیرات چارلس کوریا نے غرضِ تعمیر کو نگاہ میں رکھ کر تیار کیا تھا۔

ماڈل دیکھنے اور اس کے رمزِ تعمیر کو بساط بھر سمجھ لینے کے بعد ہم آصف کے ساتھ ایک اور طرف چلے۔ اس راستے میں بھی آصف خندہ پیشانی سے کسی کو سلام کر رہے تھے اور کسی کے سلام کا مسکرا کر جواب دے رہے تھے۔ اپنے دائیں بائیں کی مختصر تفصیل سنتے ہوئے ہم عمدہ فرنیچر والے ایک کمرے میں پہنچے جہاں ایک دراز قد اور جسیم و شکیل شخص سے ہمارا تعارف کرایا گیا:

''یہ ہیں واصف رضوی، اس یونیورسٹی کے پریسیڈنٹ (وائس چانسلر)۔''

سر پر گھنے سیاہ بال۔ چمک، سیاہی اور ملائمیت میں یہ بال عمدہ قسم کے شمپو استعمال کرنے والی خواتین کے بالوں کو بھی مات دے رہے تھے۔ چہرہ کھلا ہوا بھی اور کِھلا ہوا بھی۔ خطوط روشن، ہر نکتے کو بہت جلد سمجھ لینے والی آنکھوں سے ذکاوت کی شعاعیں پھوٹتی ہوئی اور بدن میں برقی رو دوڑی ہوئی۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے عالمی تعلیم کی اعلیٰ ڈگری حاصل کیے ہوئے۔ خوش گفتار و خوش لباس واصف رضوی سے جب میرے تعارف میں لکھنؤ کا نام آیا تو وہ اچھل پڑے۔

''لکھنؤ! ہم تو وہاں رہ چکے ہیں۔ بہت رشتے دار ہمارے وہاں رہتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''کشمیری محلّے میں ۔ مجھے آج بھی یاد ہے، بہت چھوٹا تھا میں، وہ جو چڑھائی ہے وہاں۔ وہ کون سا نگر......''

''منصور نگر؟''

''جی جی۔ بہت اونچی چڑھائی ہے۔ اس پر جب ہمارا رکشہ چڑھ رہا تھا۔ میں ابا جی کے ساتھ تھا تو ہم نے اتر کر پیچھے سے دھکا لگایا تھا۔'' یہ بتا کر پوچھا:

''وہیں پر کوئی اسکول بھی تھا۔''

''کشمیری اسکول۔''

''جی جی۔ مجھے تو کچھ کچھ یاد ہے۔ وہ علاقہ اب بھی ویسا ہی ہے؟''

''بہت سے حصے نہیں بدلے لیکن بہت سے بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔''

میرا لکھنوی ہونا جان کر واصف صاحب کا تپاک بڑھ گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے لکھنؤ ان کے اندر جاگ اٹھا۔ جتنا وہ مجھ سے پوچھتے، اس سے زیادہ میں انہیں بتاتا۔ نعمان نقوی،

آصف فرخی اور دوسرے لوگ بہت شوق سے یہ باتیں سن رہے تھے۔ انہیں اس طرح یہ باتیں سنتے دیکھ کر میں نے سوچا: ''باہر جا کر معلوم ہوتا ہے کہ لوگ لکھنؤ سے کتنی رغبت رکھتے ہیں۔'' ان باتوں کے بعد یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم، نصابات اور درسیات کی نوعیت کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ عبید چونکہ ماس کمیونی کیشن کے آدمی ہیں اور اس میدان میں خاصی شہرت رکھتے ہیں اس لیے اُن سے اس موضوع پر مکالمہ ہوتا رہا۔ چائے اپنے لوازم کے ساتھ آ چکی تھی۔ میں چائے پی رہا تھا اور واصف رضوی کی برق روی بھی دیکھ رہا تھا: تیزی کے ساتھ کرسی کی پشت پر اپنا لمبا کوٹ اتار کر رکھنا پھر کسی ضرورت کے لیے برابر والے کمرے میں جانا، چائے کی پیالی کا ہونٹوں سے لگانا، طشتری سے چپس اٹھا کر منہ میں ڈالنا اور بدن کی جنبشوں کے ساتھ بات کرنا۔ لیکن اِس چستی پھرتی میں نہ تو بچکانہ پن تھا نہ اضطرار۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ وقت ان کے لیے بہت اہم ہے اور کاموں کو نمٹانے کی انہیں عجلت ہے۔ وہ تحرک اور عمل سے بھرے ہوئے تھے اسی لیے حبیب یونیورسٹی کو ایک شکل دینے، آئندہ کے لیے اس کے منصوبے بنانے اور تنظیمی سطح پر اسے مضبوط کرنے کے لیے ان کے خدمات حاصل کیے گئے تھے۔

واصف رضوی کے کمرے سے نکل کر آصف نے ہمیں اس یونیورسٹی کے آڈیٹوریم دکھائے، کتاب خانہ دکھایا۔ ہم نے وہ کھلا ہوا رنگ منچ بھی دیکھا جہاں ایک چبوترہ نما اسٹیج تھا اور تین طرف سیڑھیاں۔ اس اسٹیج پر ڈرامے بھی کھیلے جاتے ہیں اور رنگا رنگ پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ یہ سب دیکھنے کے بعد ہم یونیورسٹی کی کینٹین میں آئے جہاں طلبہ اور اساتذہ ایک ساتھ مصروفِ خورونوش تھے۔ یہیں آصف نے ایک لڑکے شارق سے یہ کہہ کر ہم کو ملوایا کہ یہ نیر صاحب (نیر مسعود) کی بہن[1] کے نواسے ہیں، بہت ذہین ہیں اور یہاں کمپیوٹر سائنس کے طالب علم ہیں۔ اُس لڑکے نے اپنی ماں اور اپنی نانی کے بارے میں جو بیماری کی وجہ سے بستر سے لگی ہوئی تھیں، کچھ باتیں کیں۔ نیر مسعود کی افسانہ نگاری سے کچھ کچھ اپنی واقفیت کا اظہار کیا اور اپنی ذہانت کی چھاپ چھوڑ کر چلا گیا۔۔

میں نے شعیب کو جس کا دفتر گلستانِ جوہر سے بہت قریب تھا، یونیورسٹی کی سیر سے

---

[1] نیر مسعود کی ان بیمار بہن کا جون (۲۰۱۵ء) میں انتقال ہوگیا۔

فرصت پاتے ہی فون کر دیا تھا کہ مجھے آ کر لے جائے۔ کچھ دیر بعد وہ یونیورسٹی آ پہنچا۔ عبید کسی اور طرف نکل گئے تھے۔ میں آصف سے مل کر باہر نکلا۔ راستے سے فراست کو لیا۔ پھر لنچ کے لیے ہم تینوں Largesse نام کے ایک بہت اچھے سے ہوٹل میں گئے۔ وہاں ہم نے چینی کھانے کھائے۔ ہوٹل کے بیرے شعیب سے مانوس تھے اور اس کی پسند کی ڈشوں سے بھی واقف تھے۔ کھانے کا آرڈر دیتے وقت شعیب نے ایک خاص ڈش جو اسے بہت پسند تھی، وہ بھی منگوائی۔ میں نے ان خوش ذائقہ کھانوں کا مزہ لیا اور ہوٹل سے باہر نکل کر فراست سے کہا:

''ارتضٰی عباس سے بھی مل لیا جائے۔''

''ضرور یہاں سے وہیں چلتے ہیں۔''

یہ نوجوان میرے کراچی آنے کا بے چینی سے منتظر تھا اور میں بھی اس سے ملنے کا متمنی۔ رثائی ادب سے متعلق کتابوں کی جستجو اور ان کی معلومات کے بارے میں وہ کراچی سے برابر مجھے فون کرتا اور بہت شستہ اور شائستہ لہجے میں سلام کرنے کے بعد کہتا:

''حضور کیسے ہیں؟''

''اچھا ہوں۔''

''جناب یہ فرمائیں کہ فلاں کتاب کہاں مل سکتی ہے اور حضور یہ بھی بتائیں کہ وہ جو پروفیسر مسعود حسن رضوی کا ذخیرہ علی گڑھ منتقل ہوا ہے، اس کی فہرست مل سکتی ہے؟''

پھر فون آتا: ''جناب کو بے وقت تو زحمت نہیں دی۔''

''نہیں، بالکل نہیں، بتائیں۔''

''حضور سنا ہے محمود آباد کے کتب خانے میں رثائی ادب کا بہت عمدہ ذخیرہ ہے۔ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ وہاں کون کون سی کتابیں ہیں؟''

ایک بار میں نے اس سے پوچھا: ''میاں کیا آپ لکھنؤ کے ہیں؟''

''جی نہیں پنجاب کا۔''

''واقعی؟''

''جی پنجاب کا۔''

''میاں یہ ڈھلا ڈھلایا نرم اور لوچ دار لہجہ تو لکھنؤ ہی کا ہوسکتا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ آپ پنجاب کے ہیں۔''

پھر اُس کو بتاتا: ''یہ مرثیے سے شغف کا نتیجہ ہے۔ یہ خوش لہجگی انیس کے دربارِ فصاحت سے ملی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

ارتضیٰ عباس بہت کم سنی میں کئی کتابوں کے مصنف بن گئے ہیں۔ وہ رثائی ادب سے متعلق ایک رسالے 'جواہر' کے مدیر بھی ہیں۔ فراست بھی جو بہت کم کسی کو خاطر میں لاتے ہیں، ان کے مدّاح و معترف ہیں۔ کراچی کے مشہور محلّے رضویہ میں ان کا مسکن ہے۔ جہاں اس وقت ہم تھے وہاں سے رضویہ کا علاقہ بہت دور نہیں تھا۔ سو شعیب نے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں رضویہ کالونی سے قریب کی جگہ پر اتار دیا۔ وہاں سے کراچی کے خاص طرح کے رکشے پر بیٹھ کر ہم رضویہ کی طرف چل پڑے۔ رضویہ سے کچھ پہلے لڑکیوں کے ایک کالج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فراست نے کہا:

''یہ سرسید کالج ہے۔ پروین شاکر یہیں پڑھتی تھی۔'' یہ بتا کر مجھے بتایا: ''یہاں سے نکلتے ہی برقع اپنے بیگ میں ڈالتی اور وہاں آگے ایک ٹھیلے پر پرانی کتابیں لگی رہتیں، وہاں سے چھانٹ چھانٹ کر کتابیں خریدتی۔ ہماری ملاقات کبھی کبھی اسی ٹھیلے کے پاس ہوتی تھی۔''

رضویہ پہنچ کر ہم نے ارتضیٰ کے دولت کدے کے بڑے سے آہنی دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن دستک کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ ارتضیٰ شاید گھر پر موجود نہیں تھے۔ قدرے انتظار کے بعد ان کی ہمشیرہ نے اوپر کی منزل کی آدھی کھلی ہوئی کھڑکی سے مونہہ نکال کر ہم سے اندر آنے کو کہا۔ اندر داخل ہو کر ہم زینہ چڑھتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں ایک بڑے سے کمرے میں ارتضیٰ عباس کی جمع کی ہوئی بہت عمدہ اور نایاب کتابیں بڑی تعداد میں بڑے سلیقے سے شیلفوں میں سجی ہوئی تھیں۔ میں چھوٹی سی عمر کے اِس شخص کا اتنا بڑا ذخیرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کمرے میں کچھ کتابیں کھلی ہوئی تھیں جنہیں شاید پڑھا جا رہا تھا، کچھ ایک طرف رکھی ہوئی تھیں جنہیں پڑھا جا چکا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے چھوٹی بڑی موٹی اور پتلی کتابوں کے ٹائٹل

دیکھے۔ ان میں سے تین چوتھائی کا تعلق رثائیات اور مذہبیات سے تھا۔ یہ مجھے وہیں جا کر معلوم ہوا کہ ارتضٰی عباس ذاکری بھی کرتے ہیں۔ ہم کچھ کتابیں جو ہماری پہنچ میں تھیں انہیں کھولتے اور بند کرتے رہے۔ اتنی دیر میں ارتضٰی عباس آ گئے۔ میں نے انہیں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ ایک بہت خوبصورت نوجوان میرے سامنے کھڑا تھا۔ پیچھے کی طرف کھنچے ہوئے گھنے سیاہ بال جن پر عادتاً وہ بار بار اپنے دونوں ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کا یہ عمل دیکھ کر مجھے سردار جعفری یاد آ گئے جو شعر پڑھتے یا تقریر کرتے وقت کبھی دایاں اور کبھی بایاں ہاتھ اپنے بالوں پر پھیرتے رہتے تھے۔ پہلی نظر میں وہ ملکِ یونان کا کوئی قدیمی باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ کچھ ایسے چہرے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر آپ کو ایک خاص علاقے اور وہاں کی تاریخ یاد آنے لگتی ہے۔ ارتضٰی کے چہرے میں بھی یہی خوبی تھی۔ لیکن خود ارتضٰی کو اپنے اس مردانہ حسن کا احساس نہیں تھا۔ وہ لباس کے معاملے میں بھی سادہ اور آرائش سے بے نیاز تھے۔

ارتضٰی مجھ سے بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ میرے سفر کا حال اور لکھنؤ کا احوال معلوم کرنے کے بعد انھوں نے بڑی محنت سے اپنی جمع کی ہوئی کتابوں کو دکھانا اور ان کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ کس کس سے کہاں کہاں سے اور کس کس طرح انھوں نے یہ کتابیں حاصل کی ہیں۔ میں کتابوں کی جمع آوری کے اس جنون پر انھیں داد دیتا رہا۔ ارتضٰی نے اپنی زیرِ قلم کتابوں کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ جلد ہی وہ زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی ہیں۔ میں ارتضٰی کی لکھی ہوئی اور لکھی جانے والی کتابوں کا ذکر سن کر سوچنے لگا کہ پاکستان کی مٹی میں کون سا تخم ہے کہ لوگ بہت کمسنی میں بارآور ہو جاتے ہیں۔ سراج منیر، تحسین فراقی، سہیل عمر، اجمل کمال، آصف فرخی، ذیشان ساحل، افضال احمد سید۔ بہت نام ہیں جنہوں نے آنکھ کھولتے ہی زینۂ دانش پر قدم رکھ دیا اور بہت کم وقت میں ذکاوت کی بہت سی منزلیں طے کر لیں۔

میں نے بہت جی لگا کر ارتضٰی کی کتابیں دیکھیں اور بہت دیر تک رثائی ادب پر ان سے بات کی۔ فراست اپنے قابلِ رشک حافظے سے اس گفتگو میں جان ڈالتے رہے۔ پھر ارتضٰی ہمیں نچلی منزل میں لے کر آئے جہاں ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہم نے بہت سے لوازم کے ساتھ چائے پی۔ چائے پیتے پیتے سہ پہر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ شام کے جھٹ پٹے سے جا ملی۔

میدانِ خطابت میں علم اس کو ملا ہے

لکھنؤ میں جب مجھے فراست کی بہت عمدہ رباعیات کا مجموعہ ''دردکی قندیل'' ملا تھا تو میں نے اس کی رباعیوں کی تحسین کے ساتھ ساتھ اس مجموعے پر علامہ طالب جوہری کے لکھے ہوئے عالمانہ مقدمے کی بھی دل کھول کر داد دی تھی اور اس کے بعد فراست سے کہا تھا کہ کراچی آیا تو علامہ سے ضرور ملوں گا۔ میں ان کی عالمانہ خطابت کا بھی قائل تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلتے ہی فراست بولے: ''کیوں نہ علامہ سے بھی آج ہی مل لیا جائے۔ کل سے آپ کانفرنس میں مصروف ہو جائیں گے''۔

''بہت اچھا خیال ہے''۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہم سواری کے بغیر تھے۔ چنانچہ شعیب کو فون کر کے پروگرام سے مطلع کیا گیا۔ وہ بخوشی رضو یہ آنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ارتضیٰ نے علامہ سے رابطہ قائم کیا، باریابی کی اجازت چاہی۔ اُدھر سے جواب آیا مغرب بعد آ جائیے۔ اور جب شام علاقۂ شب میں داخل ہو کر تاریکی سے جا ملی تو ہم شعیب کی گاڑی میں بیٹھ کر انچولی میں واقع پاکستان کے نامور خطیب علامہ طالب جوہری کی قیام گاہ کی طرف چل دیے۔ لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب ہم انچولی سے قریب کے علاقے میں داخل ہوئے تو فراست نے ایک چوڑی سی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہیں سے کچھ دور آگے جا کر بائیں طرف رہتے تھے سلیم احمد 'مسکنِ عزیز' میں جو کراچی کے ادیبوں اور دانشوروں کی آماجگاہ تھا۔ یہ کہہ کر بتایا: ''رات گئے تک یہاں علمی اور ادبی محفلیں جمی رہتیں جن میں خوب گرما گرم بحثیں ہوتیں۔

پھر فراست سلیم احمد کے ساتھ اپنی شب گشتی کے قصے سنانے لگے اور اُن لوگوں کے بارے میں بتانے لگے جو رات کی ان چلتی پھرتی محفلوں میں شریک رہتے۔ پھر سلیم احمد کے ان مضامین کا ذکر نکل آیا جنہوں نے ستر کے دہے میں دھوم مچا دی تھی۔ اسی ضمن میں اُن کے اُن مضمونوں کا بھی حوالہ آیا جو سلیم احمد نے بالکل نئے زاویے سے انیس پر لکھے تھے۔ ارتضیٰ عباس ان مضمونوں کی بات سن کر خوش ہوئے۔ شعیب کچھ نہ سمجھتے ہوئے گاڑی چلاتے رہے اور پھر

گاڑی ایک تنگ راستے میں داخل ہو کر اپنی رفتار دھیمی کرتی ہوئی علامہ کے دولت کدے کے سامنے جا کر رکی، رکی کیا بندوق برداروں نے بڑھ کر اسے روکا۔ ہم گاڑی سے اترے تو دیکھا کہ علامہ کے گھر کے باہر ایک حفاظتی چوکی بنی ہوئی ہے اور کئی مسلح سپاہی وہاں موجود ہیں۔ یہ تحفظ انھیں حکومت کی طرف سے فراہم کیا گیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم ابھی پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ گھنی مونچھوں والے گٹھے ہوئے جسم کے ایک دراز قد شخص نے آگے بڑھ کر فراست کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جس کا مطلب تھا کون ہو، کہاں سے آئے ہو۔ یہ افغانی علامہ کا نجی محافظ تھا۔ فراست نے اسے وجہِ ورود بتائی۔ خود کار بندوق کو شانے پر سنبھالتے ہوئے اس نے اندر ہمارے آنے کی اطلاع بھجوائی۔ اندر سے ایک نوجوان نکلا جو فراست اور ارتضٰی کا شناسا تھا۔ اس نے اندر لے جا کر ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور بتایا کہ علامہ آیا ہی چاہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد علامہ برآمد ہوئے۔ ہم سب ان کے احترام میں کھڑے ہوئے، سلام بجالائے۔ علامہ مصافحے کے لیے بڑھائے ہوئے ہمارے ہاتھوں کو چھوتے ہوئے کونے کی ایک خوشنما کرسی پر اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر اور داہنا ہاتھ کرسی کے ہتھے سے ٹکا کر جسم کو ہلکا سا ترچھا کرتے ہوئے بیٹھ گئے اور اس کرسی میں پوری طرح سما گئے۔ اور یوں انھوں نے ظرف اور مظروف کی دوئی کو مٹا دیا۔

''لکھنؤ سے پرسوں مولانا آغا روحی کا فون آیا تھا، بتا رہے تھے آپ کے آنے کے بارے میں''۔ علامہ نے کرسی پر بیٹھتے ہی مجھ سے کہا۔

''حضور یہ آپ کے مقدمے کی بہت تعریف کر رہے تھے''۔ فراست نے اپنے مجموعے پر لکھے ہوئے علامہ کے مقدمے کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''واقعی مقدمہ آپ نے بہت عمدہ لکھا ہے۔ رباعی کے فن اور اس کی تاریخ پر بڑی گہری نظر ہے آپ کی''۔ میں نے کہا۔

علامہ کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انہوں نے سامنے رکھے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالی اور اسے جلاتے ہوئے بہ انکسار بولے:

''بھئی ان کا بہت اصرار تھا، سو جیسا ہم لکھ سکتے تھے لکھ دیا''۔

''نہیں صاحب، فن پر بڑی زبردست گرفت ہے آپ کی۔ رباعی کے سے مشکل فن پر لکھنا آسان نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر ان کی خطابت کی تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ لکھنؤ سے یہ فن ختم ہوتا جارہا ہے۔

''ایسا کیوں؟'' انھوں نے پوچھا۔

اس کے جواب میں سبقتِ لسانی کی وجہ سے ایک ایسی بات میری زبان سے نکلی کہ علامہ نے مجھے ٹھٹھک کر دیکھا۔ فراست جو میرے برابر بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے پہلو بدل کر میرے پہلو میں کہنی ماری اور اس سے پہلے کہ میں کہتا کہ میرا مطلب یہ نہیں یہ ہے فراست کی طلاقتِ لسانی کام آئی:

''حضور مطلب ان کا یہ ہے کہ بھارت میں ذاکری کا فن رو بہ زوال ہے۔ وہ جو قرآن وحدیث کی فہم آپ کے پاس ہے، وہ بہت کم لوگوں کو میسّر ہے''۔

علامہ کے چہرے پر آیا ہوا رنگ ہلکا پڑ گیا اور اب کے میں گویا ہوا:

''وہ جو آپ ایک موضوع کو لے کر چلتے ہیں اور قرآن وحدیث کی روشنی میں جس طرح اس کی پرتیں کھولتے ہیں وہ اوروں کے یہاں بہت کم نظر آتا ہے''۔ میں نے کہا۔ ''اور یہی اصل خطابت ہے''۔

علامہ خوش ہوئے مگر ان کی خوشی سگریٹ کے لمبے کش والے دھوئیں میں دکھائی نہیں دی۔ علامہ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگاتے رہے اور مذہب اور ادب پر گفتگو فرماتے رہے۔ علامہ کی خطابت کی پوری دنیا میں شہرت ہے۔ ہندوستان میں بڑی تعداد میں لوگ ان کے دلدادہ ہیں۔ بہت عمدہ خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ فراست کے مجموعے پر عالمانہ مقدمہ لکھ کر انھوں نے دو باتوں کو غلط کر دکھایا۔ ایک یہ کہ مولوی شعر کی فہم نہیں رکھتا اور دوسرے یہ کہ وہ اچھی اور شگفتہ نثر نہیں لکھ سکتا۔

مذہب اور ادب کی بات کے بیچ کچھ مقامی سیاست والی باتیں بھی نکل آئیں۔ میں پس منظر سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ فراست اور علامہ کی گفتگو میں جو کچھ میں سن رہا تھا وہ یہ تھا کہ شہر کراچی میں اردو سے متعلق ایک ادارے کے تنازعے میں آمادۂ جنگ فریقین نے

علامہ کے حضور الگ الگ حاضر ہوکر اپنی بات رکھی تھی۔ علامہ ثالثی بنے تھے لیکن مصالحت کی صورت نہیں نکلی۔ جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، میں سوچ رہا تھا کہ یہ صورتحال تو ہر جگہ ہے۔ اردو کے بیشتر ادارے اسی کھینچا تانی کا شکار ہیں۔ کوئی کام کرنے والا آتا ہے تو اسے کام کرنے نہیں دیا جاتا اور جو لوگ عہدہ خواہی اور جاہ طلبی کی ہوس میں ان عہدوں کو حاصل کرتے ہیں وہ عموماً ناکارہ ہوتے ہیں۔

ادب، مذہب اور مقامی سیاست والی باتیں چل ہی رہی تھیں کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے وہی نوجوان جو باہر سے ہمیں اندر لے کر آیا تھا، اٹھ کر علامہ کے قریب آیا اور دھیمے سے ان سے کچھ کہا۔ علامہ کے جواب سے ہم نے جانا کہ کچھ لوگ باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔ علامہ نے انھیں کچھ وقت کے بعد آنے کی اجازت دے دی۔ علامہ کا دیا ہوا کچھ وقت گزر جانے کے بعد ہم نے دیکھا کہ آٹھ دس کیم شحیم لوگ بندوق برداروں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ فراست نے ہمیں بتایا کہ ان میں سے ایک دو لوگ وزیر بھی ہیں، باقی پارلیمنٹ کے ارکان ہیں۔ ان کے آنے کے بعد ہم نے سمجھ لیا کہ علامہ کو تخلیہ درکار ہے۔ سو ہم اٹھے، علامہ سے اجازت طلب کی اور جب باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو فراست بولے:

''محرم میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے یہ سب حساس شہر میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے علامہ کے تعاون کے طلبگار ہیں''۔

اور تب مجھے معلوم ہوا کہ قوم میں علامہ کی تقلید اور حکومت میں ان کا دبدبہ کتنا ہے۔ اور اسی وقت میں نے دعا کی: ع یارب فسادِ خلق سے امن و اماں رہے۔

شعیب نے پہلے ارتضیٰ اور فراست کو ان کے ٹھکانوں تک پہنچایا پھر مجھے میرے ہوٹل۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ کھانے کے لیے میں ڈائننگ ہال کی طرف گیا تو معلوم ہوا کہ آج کھانے کا اہتمام اس نشیب میں ہے جو کنارۂ آب سے متصل ہے۔ میں لکڑی کے زینوں سے اترتا ہوا اس نشیب میں پہنچا تو وہاں میزوں پر انواع و اقسام کے کھانے موجود تھے۔ ان میں گوشت اور گوشت میں بھی کبابوں کی قسمیں بہت تھیں۔ لیکن دانتوں میں تکلیف کی وجہ سے میں ان میں سے زیادہ تر کے ذائقوں سے محروم رہا۔ میں نے اپنی طشتری میں وہ چیزیں جنھیں

میں آسانی سے کھا سکتا تھا، نکالیں اور اس میز پر جس کے پایوں تک پانی کی موجیں آ آ کر لوٹ رہی تھیں، جا کر بیٹھ گیا اور ان موجوں میں نشیبی حصے میں روشن قمقموں کی روشنیوں کے عکس دیکھتا رہا۔ یہ عکس دیکھنے کے کچھ دیر بعد:

ع دریا نے بھی حبابوں کے روشن کیے چراغ

میں اس وقت سمندر کو یہاں سے دور تک نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے دور تک نہ دیکھ سکنے کے باوجود میں وہاں دیر تک بیٹھا رہا اور وسعتِ آب کے نہ دکھائی دینے والے سلسلے پر نظر دوڑاتا رہا اور جب میزوں سے کھانوں کی قابیں اٹھائی جانے لگیں اور ان پر بچھی ہوئی اجلی چادروں کو سمیٹا جانے لگا تو میں دور تک بچھی ہوئی چادرِ آب پر آخری نگاہ ڈالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے پر آ کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ قاضی افضال اپنے عزیزوں سے ملاقات کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ وہ رات بہت دیر میں جب میں گہری نیند سو رہا تھا، وارد ہوئے۔ میں نے سوتے سے اٹھ کر دروازہ کھولا، اور پھر اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی اور میں نے کھڑکی کے پردے کھینچے تو دھوپ ہوٹل کے بہت بڑے صحن میں لگے ہوئے درختوں کی شاخوں پر اتر چکی تھی اور دیواریں اس کی چمکتی ہوئی روشنی میں نہا رہی تھیں۔ میں نے اچھی لگنے والی اس دھوپ کو دیکھا اور سوچا: سورج، چاند اور ستاروں کی طرح دھوپ بھی ہر خطۂ زمین پر ایک ہی طرح کا رنگ رکھتی ہے۔ ہوٹل میں آ کر ٹھہرنے والوں کی سواریاں صحن میں وقفے وقفے سے آ رہی تھیں۔ میں نے چائے منگوائی، قاضی افضال بیدار ہوئے۔ چائے پر ہم نے گزرے ہوئے دن کی مصروفیتوں کے بارے میں باتیں کیں اور جب ناشتے کے لیے نیچے اتر کر ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچے تو وہاں ناشتے کی میزوں پر کانفرنس میں آنے والے بہت سے پاکستانی ادیب موجود تھے۔ ان میں سے کوئی لاہور سے آیا تھا کوئی اسلام آباد سے، کوئی ملتان سے تو کوئی لندن سے۔ میں ان سب میں صرف انتظار صاحب کو پہچانتا تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی میں تیزی سے اُن کی میز کی طرف بڑھا اور جھک کر انھیں مودبانہ سلام کیا۔ انھوں نے مجھے پہچان کر اسی میز پر بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ ان کے ساتھ ایک اور سن رسیدہ اور خوبرو شخص بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس عمر میں بھی اُس کے چہرے پر:

ع اللہ ری ضو جھپکتی ہے آنکھ آفتاب کی

والا عالم تھا۔ انتظار صاحب نے مجھے اُس سے ملواتے ہوئے کہا: ''یہ مسعود اشعر ہیں''۔ میں ادبی جریدوں میں ان کی تحریریں بہت پہلے سے پڑھتا رہا تھا لیکن آج انھیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اپنی پلیٹ میں ناشتے کی چیزیں رکھنے کے بعد میں نے انتظار صاحب سے کہا:

''آپ نے میرے ناولٹ کو پسند کیا اور 'ڈان' میں اس پر لکھا، یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے، آپ کا بہت بہت شکریہ''۔

''نہیں شکریے کی کوئی بات نہیں، تمہارا ناولٹ اچھا ہے''۔ یہ کہہ کر بولے: ''تم لکھنؤ ہی کو اپنا موضوع بناؤ''۔

''جی۔ اس موضوع پر ایک اور تحریر زیرِ قلم ہے، دیکھیے کیا صورت بنتی ہے''۔

قاضی افضال بھی اسی میز پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ ناشتے کے لقموں اور چائے کی چسکیوں کے ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ انتظار صاحب کی گفتگو میں کبھی لاہور زندہ ہو جاتا کبھی لکھنؤ، کبھی دہلی کے گلی کوچوں کا قصہ چھڑ جاتا تو کبھی اردو کی صورتحال سامنے آجاتی۔ مسعود اشعر بیچ بیچ میں انھیں بھولی ہوئی باتیں یاد دلانے لگتے اور اس یاد دلانے میں جب بھی وہ کوئی جملہ ادا کرتے میں انھیں بہت غور سے دیکھتا اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کا تعلق رام پور سے ہے تو مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے لہجے میں لاہوریت تھی نہ رام پوریت۔ صاف اور شستہ لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر وہ نپے تُلے جملے بول رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا: اگر یہ پردے کے پیچھے سے بول رہے ہوتے تو ہم انھیں لکھنؤ والا سمجھتے۔ دراز قد، خوش رو، گورے چٹے اور بال سارے کے سارے سفید۔ بالوں کی سفیدی میں دانشوری کی دمکتی ہوئی کرن، پہناوے میں نفاست۔ غرضیکہ وہ ان لوگوں میں تھے جو محفل میں بیٹھیں تو آنکھیں خود بخود ان کی طرف اٹھ جائیں۔

انتظار صاحب سے کچھ دور ایک اور میز پر سفید بالوں والا ایک بہت بوڑھا شخص بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا، دیکھا کیا اس نے خود مجھے اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔ آنکھوں پر سیاہ فریم والی عینک، سفید رنگ کی آدھی آستین والی شرٹ اور نیلے رنگ کی

جنیس۔ چائے پیتے جب وہ شخص اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتا تو بہت پراسرار معلوم ہونے لگتا۔ جب وہ ناشتہ کر چکنے کے بعد اپنی کرسی سے اُٹھا تو اس کے بہت لمبے قد نے اسے اور پراسرار بنا دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھا لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے اپنے آپ سمجھ لیا کہ یہ شخص بھی ہماری ہی طرح اس کانفرنس میں شرکت کرنے آیا ہے۔ انتظار صاحب کپڑے بدل کر نیچے اترے تھے۔ انھوں نے سفید رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس لباس میں ان کی جوانی پلٹ آئی تھی۔ انہیں دیکھ کر یوں لگا:

ع ظاہر ہو جیسے ابر میں چھپ کر مہ تمام

وہ جس کرسی پر بیٹھے تھے اس کے پہلو میں ان کی چھڑی بھی میز سے ٹکا کر رکھ دی گئی تھی جو کرسی پر ان کے پہلو بدلتے وقت گر جاتی اور پھر اٹھا کر رکھ دی جاتی۔ جب وہ ناشتے سے فارغ ہو چکے اور جب مسعود اشعر نے انھیں سہارا دے کر اٹھایا تو میری زبان سے بے اختیار نکلا:

ع یارب اس ایک دم کو عطا کر ہزار دم

مسعود اشعر انھیں اس کمرے میں لے گئے جہاں انتظار صاحب ان کے ساتھ ٹھہرے تھے۔

●

آج کانفرنس کے آغاز کا دن تھا۔ گزشتہ روز ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ ہم چار بجے تک تیار رہیں، گاڑیاں ہمیں لینے کے لیے آجائیں گی۔ لیکن میں اسی وقت نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ مجھے خریداری کے لیے پاکستانی روپیوں کی ضرورت تھی اس لیے آج مجھے شعیب کے ساتھ کرنسی بدلنے جانا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شعیب آکر مجھے اپنے دفتر لے گئے۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے چائے پینا شروع ہی کی تھی کہ ایک بہت خوبصورت خاتون نام ان کا ادیبہ خان تھا ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ وارد ہوئیں۔ علیک سلیک کے بعد جب انھوں نے بڑی روانی کے ساتھ اردو اور انگریزی میں بات کرنا شروع کی تو معلوم ہوا کہ موصوفہ کسی بڑے بینک کی منیجر ہیں جو اپنے ماتحت کے ساتھ اس دفتر میں اس لیے آئی ہیں کہ شعیب کو اپنے بینک کے فوائد بتا کر اسے وہاں اپنے کالج کا اکاؤنٹ کھولنے کے لیے ہموار کر سکیں۔ وہ بول رہی تھیں اور بولے جا رہی تھیں، میں خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں اس لیے سن رہا تھا کہ مجھے ان کا بولنا اچھا لگ رہا تھا۔

وہ جس طرح اکاؤنٹ کھولنے کے فائدے بتا اور سمجھا رہی تھیں، اسے سن کر میں نے سوچا کہ یہ خاتون اپنی باتوں سے کسی کو بھی شیشے میں اتار سکتی ہیں۔ اور وہی ہوا۔ دیر تک بیٹھنے اور یقین سے بھرے لہجے میں بولنے کے بعد اپنی گفتگو کا جادو جگا کر انہوں نے شعیب کو ہموار کر ہی لیا اور جب وہ فاتح بن کر صوفے سے اٹھنے لگیں تو جو کچھ میں نے ان سے پوچھا اس کے جواب میں انہوں نے کہا: ''میں پٹھان ہوں، میرے شوہر پنجابی ہیں اور میرے اتنے بچے ہیں۔'' ان میں سے میں صرف اس بات پر یقین کر سکا کہ وہ پٹھان ہیں، وہ بھی اس لیے کہ وہ بہت گوری تھیں۔ پٹھانی آواز میں پنجابی میل کے باوجود ان کے لہجے میں پٹھانیت تھی نہ پنجابیت۔ وہ تاجرانہ مہارت کے ساتھ بڑی دلآویزی سے دل میں اتر جانے والی باتیں کر رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ''اتنے بچوں کی ماں'' والی بات پر میں کیا کوئی بھی یقین نہ کرتا کہ وہ ایک ایسی لڑکی معلوم ہو رہی تھیں جو بس ابھی ابھی شادی کے لائق ہوئی ہو۔ جامہ بھی انہوں نے اپنے رنگ سے میل کھاتا ہوا زیبِ تن کیا تھا، اس لیے ان کا سراپا اور زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ اپنے معاملات کو قطعی شکل دینے کے بعد وہ مشرقی اور مغربی دونوں طریقوں سے ہمیں سلام کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں نے شعیب سے کہا ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے:

ع آ گیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا

دفتر کے ضروری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد شعیب نے فراست کو فون پر بتایا کہ وہ کہاں اور کس لیے جا رہے ہیں۔ اُدھر سے فراست نے شعیب کو بتایا کہ گلشنِ اقبال میں عثمانیہ ریستوراں کے قریب آ جائیں اور وہاں سے ایک ساتھ کرنسی بدلنے والی جگہ 'Galaxy' جائیں گے۔ فراست مقررہ مقام پر اپنی گاڑی لے کر آ گئے اور ہم لوگ آگے پیچھے کرنسی بدلنے والے دفتر پہنچ گئے۔ اس چھوٹے سے دفتر میں دو یا تین کاؤنٹر تھے اور اُن سب پر لین دین والا کام عورتیں کر رہی تھیں۔ عورتیں کہنا انہیں غلط ہوگا، یہ نوعمر لڑکیاں تھیں جو بڑی تیزی اور مستعدی سے اپنا کام انجام دے رہی تھیں۔ جس کھڑکی پر مجھے لے جایا گیا وہاں ایک لڑکی بیٹھی لنچ کر رہی تھی۔ اپنے پہلو میں رکھی ہوئی طشتری میں سے اس نے آخری لقمہ اٹھا کر سر پر آنچل کو درست کرتے ہوئے کہا: ''معاف کیجیے میں ذرا........''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔

جب وہ لڑکی اپنے پہلو سے طشتری ہٹا کر پانی پینے کے بعد رومال سے اپنا مونہہ پونچھ چکی تو شعیب نے اس سے دونوں کرنسیوں کے درمیان کا فرق پوچھا۔ کچھ مول تول ہوا۔ لڑکی نے اندر جا کر اپنے اوپر والے عہدہ دار سے مشورہ کیا اور شعیب کی بتائی ہوئی شرح کو قبول کرتے ہوئے ایک فارم دیا۔ میں نے اسے بھر کر اس پر دستخط کیے۔ اپنے پیسے دیے، اس کے پیسے لیے۔ یہ کام جس خوبی اور پھرتی کے ساتھ ہوا اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ دفتر سے باہر نکل کر میں نے شعیب سے کہا:

''یار تمہارے دفتر میں اُن خاتون اور ان لڑکیوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ پاکستان میں عورتیں پیچھے ہیں۔''

''تمہیں دیکھو۔'' شعیب نے کہا۔

''ہاں، مالی معاملات میں عورتیں عموماً کچی ہوتی ہیں لیکن یہاں تو بالکل پکّی نکلیں۔''

کرنسی بدلنے کے بعد فراست اپنی طرف چلے گئے اور ہم شعیب کے گھر آ گئے۔ یہاں ہم نے دن کا کھانا کھایا۔ دانتوں میں درد کی وجہ سے میں چونکہ گوشت نہیں کھا سکتا تھا، اس لیے بھابھی نے میرے لیے کھچڑی پکا لی تھی اور اسی کے ساتھ کباب۔ میں نے دونوں چیزیں بڑے شوق سے کھائیں۔ کھانے کے بعد شعیب نے مجھے میرے ہوٹل پہنچا دیا اور وہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں آرٹس کاؤنسل جانے کی تیاری کرنے لگا۔

سونے کی ہے زمیں تو ستاروں کا فرش ہے

آرٹس کاؤنسل کی گاڑیاں ہوٹل کے صحن میں آ چکی تھیں۔ میں اور قاضی افضال نیچے اترے تو کانفرنس میں آئے ہوئے دوسرے مہمان بھی تیار کھڑے تھے۔ گاڑیوں میں بیٹھ کر ہم تھوڑی ہی دیر میں آرٹس کاؤنسل پہنچ گئے۔ کاؤنسل کے دروازے پر پولیس کا سخت پہرہ تھا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی۔ ہم گاڑی سے اترے تو آرٹس کاؤنسل کے رضا کاروں نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں آرٹس کاؤنسل کے ڈائرکٹر ندیم ظفر صاحب کے کمرے میں بڑے احترام سے لے جا کر بٹھا دیا۔ اسی کمرے میں وقفے وقفے سے دوسرے مہمان بھی آ کر بیٹھنے

لگے۔ جب جگہ بھرنے لگی تو دوسرے کمروں سے کرسیاں لاکر رکھی جانے لگیں۔ ندیم صاحب سب سے بڑے تپاک سے مل رہے تھے۔ وہ ہماری تواضع بھی کر رہے تھے اور کارکنوں اور رضا کاروں کو ہدایات بھی دے رہے تھے۔ اسی دوران انہوں نے کمرے میں داخل ہونے والی ایک خوش شکل خاتون سے ہمارا تعارف کرایا: ''یہ ڈاکٹر فوزیہ خان ہیں۔'' انہوں نے مسکرا کر ہم سب کو خوش آمدید کہا:

ع لب پر ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رو

ڈاکٹر فوزیہ خان کے سرخی مائل رنگ اور چہرے کے متناسب خطوط نے دوسروں کو ان کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا:

ع اڑتا تھا رنگِ روئے سحران کے سامنے

گفتگو میں بھی ان کا لہجہ نرم تھا اور اس میں پٹھانی دھمک کے بجائے ہلکی سی کھنک تھی۔ وہ جس طرح کمرے میں آ جا رہی تھیں، اسے دیکھ کر ہم نے سمجھ لیا کہ انہیں یہاں کے امور میں خاصا دخل ہے۔ ندیم ظفر صاحب نے آنکھوں پر اپنی عینک ٹھیک کرتے ہوئے فوزیہ خان کے تعارف میں یہ بھی بتایا کہ یہ علمِ نفسیات کی استاد ہیں۔ ان کے کمرے میں چائے وغیرہ سے فارغ ہو جانے کے بعد ہمیں آرٹس کاؤنسل کی عمارت کے ایک اور گوشے میں لے جایا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا جس میں کرسیاں اور میزیں قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ اس چھوٹے سے ہال کے داخلی دروازے کے داہنی طرف بہت خوش نما حروف میں لکھا تھا 'گل رنگ' اور بائیں طرف ایک بورڈ کے چاروں کونوں پر عمدہ نقاشی کے ساتھ نیلی زمین پر سفید حروف میں تحریر تھا "Writers' Lounge" مجھے 'گل رنگ' نام پسند آیا۔ 'گل رنگ' کے دروازے پر رضا کار بڑی مستعدی سے کھڑے دیکھ رہے تھے کہ مہمانوں اور عملے کے سوا کوئی اور اندر نہ جانے پائے۔ ہم 'گل رنگ' میں داخل ہوئے تو وہاں بہت بڑی بڑی ہستیاں موجود تھیں جن میں سے ہم کچھ ہی کو پہچانتے تھے۔ ان میں انتظار حسین، افتخار عارف، رضا علی عابدی، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، اشفاق حسین، زاہدہ حنا، زیبا علوی۔۔۔ یہ جانے پہچانے چہرے تھے۔ میں ان سب لوگوں سے ملا اور جنہیں میں نہیں پہچانتا تھا ان میں کسی سے فراست نے ملوایا اور کسی سے افتخار عارف نے۔ ایک صوفے پر افتخار

عارف کے پہلو میں وہی سفید ڈاڑھی والا دراز قد شخص بیٹھا تھا جسے میں نے صبح ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں دیکھا تھا اور جس کی شخصیت بہت پر اسرار معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے افتخار عارف سے پوچھا: ''یہ بزرگ کون ہیں''؟

''ارے انہیں نہیں جانتے۔ عبداللہ حسین''۔

یہ سن کر میں اچھل پڑا۔ اُن کا ناول ''اداس نسلیں'' ہم نے ایک بار نہیں کئی بار پڑھا تھا اور اپنی چھوٹی سی انجمن ''مجلسِ حملہ آوراں'' میں اس پر دیر تک بحث بھی کی تھی اور ہم میں سے کچھ نے اسے ''آگ کا دریا'' سے آگے بڑھا دیا تھا۔ ہم نے ان کے افسانے بھی پڑھے تھے اور وہ ناول بھی جو ہمیں پسند نہیں آئے۔ لیکن ''اداس نسلیں'' ہمارے حافظے کا حصہ بن چکا تھا۔ اتوار اتوار منعقد ہونے والی ہماری نشستوں میں بڑے ادیبوں کی تخلیقوں پر مضمون پڑھے جاتے اور اُن مضمونوں کے نکات پر گرما گرم بحث ہوتی اور اس بحث میں وہ باتیں بھی آ جاتیں جو ان پرچوں میں آنے سے رہ جاتیں۔ عبداللہ حسین کو دیکھ کر مجھے وہ اتوار یاد آ گیا جب ہم نے اُن کے ناول پر گرما گرم گفتگو کی تھی۔ اس گفتگو میں ناول کے موضوع، اس کے بیانیے، اس کے کرداروں، اس کی زبان اور اس کے جزئیات پر ایک دوسرے کی رائے سے خوب اختلاف کیا گیا تھا۔ آج اس ناول کا مصنف میرے سامنے تھا اور وہاں بیٹھے لوگوں سے بس ضرورتاً بول رہا تھا۔ 'گل رنگ' میں فراست نے مجھے بہت سے لوگوں سے ملوایا۔ ان میں اسد محمد خاں، انور شعور، پروفیسر سحر انصاری، مبین مرزا، صبا اکرام، جاذب قریشی اور فاطمہ حسن وغیرہ شامل تھے۔ اس وقت میں 'گل رنگ' میں اُن لوگوں کے بیچ بیٹھا تھا:

ع جن کا سینہ گہرِ علم سے ہے مالا مال

اسد محمد خاں میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ مدت سے ان کے افسانوں پر لکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں لیکن ابھی تک اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اسد محمد خاں اپنے ہندستانی معاصرین کی طرح نہ تو خود پسند نظر آئے نہ عظمت گزیدہ۔ انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوا جیسے انہیں احساس ہی نہ ہو کہ وہ بڑے افسانے لکھتے ہیں۔ اُن سے مل کر مجھے یوں لگا کہ اگر انہیں بڑا افسانہ نگار کہہ دیا جائے تو وہ بارِ عاجزی سے جھک کر بیٹھ جائیں۔ سادہ لوح، پرتپاک، نرم خو، کم سخن۔ انہیں دیکھ

کر آپ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے:

ع ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

یہ افسانہ نگار ان لوگوں میں تھا جن سے مل کر آپ بہت دیر تک خوش رہتے ہیں بلکہ جب وہ یاد آتے ہیں خوش رہنے والی وہ ساعتیں لوٹ آتی ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری سے میں غائبانہ بہت مانوس تھا۔ اُن کی تحریریں پڑھ رکھی تھیں، نام سن رکھا تھا اور ایک رشتہ اُن سے یہ بھی نکل آیا تھا کہ انہوں نے فراست کے مجموعۂ غزلیات پر مختصر لیکن جامع مضمون لکھا تھا۔ سحر انصاری دیکھنے میں واقعی دانشور معلوم ہوتے ہیں، پیچھے کی طرف کھنچے ہوئے بال جن کی کچھ لٹیں لہرا کر ان کے جمے ہوئے بالوں سے کبھی کبھی الگ ہو جاتیں اور وہ اپنی انگلیوں سے انہیں پھر ان کی اصل جگہ پر لے آتے۔ وہ ہر طرف سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اشیا کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''گل رنگ'' میں بیٹھے ہوئے لوگ ادھر اُدھر کے موضوعات پر باتیں کر رہے تھے کہ اچانک احمد شاہ بڑے طمطراق سے داخل ہوئے۔ انہوں نے فرداً فرداً سب کو گلے لگا کر سب کا حال احوال پوچھا۔ وہ سرمئی رنگ کے پٹھانی سوٹ میں ملبوس تھے اور 'گل رنگ' ان کی پاٹ دار آواز سے گونج رہا تھا۔ لانبا چہرہ، کھلتا ہوا رنگ، کشادہ پیشانی، آنکھوں پر سیاہ فریم والی عینک، ستواں ناک، فرنچ کٹ ڈاڑھی جس کے بال سیاہ کم سفید زیادہ، کمان کی صورت پیچھے کی طرف کھنچے ہوئے بال اور ہاتھ میں سگریٹ۔ تپاک ان کے بدن سے جیسے تپ کر نکلا ہو۔ جس سے ہاتھ ملاتے اسے گلے ضرور لگاتے اور کانفرنس میں آنے کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتے۔ مجھے بھی انہوں نے گلے لگایا اور سفر کا حال پوچھ کر پوچھا:

''ہوٹل میں کوئی تکلیف تو نہیں۔''

''بالکل نہیں، بہت اچھا انتظام ہے۔''

''ہم گل رنگ'' میں جاتی ہوئی سہ پہر میں داخل ہوئے تھے۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا اور شام پوری طرح پھیل چکی تھی۔ افتتاحی اجلاس کا وقت قریب آ رہا تھا۔ احمد شاہ ''گل رنگ'' سے نکل کر ان مہمانوں کا استقبال کرنے پہنچ گئے تھے جو افتتاحی اجلاس کے اسٹیج پر

رونق افروز ہونے والے تھے۔ کچھ دیر بعد رضا کاروں نے آ کر ہم سے جلسہ گاہ میں چلنے کے لیے کہا۔ ہم ایک غول کی شکل میں باہر نکلے تو دیکھا کہ چاروں طرف روشنیوں کا ہجوم ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ کاؤنسل کے بہت بڑے احاطے میں ایک بہت خوبصورت شامیانہ تنا ہوا ہے جس کے نیچے نور کا سیل رواں ہے۔ یہ شامیانہ دیکھ کر مجھے مجید امجد کا ایک مصرعہ یاد آیا اور میں نے اس میں تحریف کر کے اسے دل ہی دل میں یوں پڑھا:

ع خنک ہوائیں، اجالوں کے شامیانوں میں شام[1]

اچھی پوشاکوں والے مرد اور آرائش کے تمام لوازم سے آراستہ خوش جمال عورتیں جن میں:

ع کوئی ہم طلعتِ خورشید کوئی غیرتِ ماہ

کشاں کشاں جلسہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم دوسروں کی نظر بچا کر اچھی صورتوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے رضا کاروں کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں اگلی صف میں لے جا کر بہ عزو احترام بٹھایا۔ اس صف میں دور تک بہت آرام دہ صوفے پڑے ہوئے تھے جن پر خاص خاص مہمان اور عمائدینِ شہر بیٹھے ہوئے تھے۔ افتتاحی تقریب کے بہت بڑے اسٹیج کو بڑی نفاست کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ بہت خوبصورت میز پوش سے ڈھکی ایک بہت بڑی میز کے پیچھے کئی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میز پر خوش رنگ پھولوں سے آراستہ بڑے بڑے گلدستے رکھے تھے۔ کرسیوں کی پشت پر بہت خوش نما حروف میں لکھا ہوا ساتویں عالمی اردو کانفرنس کا دل پذیر رنگوں والا بہت بڑا بینر لگا تھا۔ میں جہاں بیٹھا تھا اسی کے پہلو میں انور شعور بھی جلوہ افروز تھے۔ ان کے دہن سے نکلنے والی بہت تیز خمار آفریں ترنگوں کے سامنے میری قوتِ شامہ جواب دینے لگی تھی۔ لیکن میں نے اپنی طرف آتی ہوئی اُن موجہائے تند کو انگیز کیا۔ فراست مجھے ان سے ملوا چکے تھے۔ ملتے ہی انہوں نے گرمجوشی سے گلے لگا کر کہا تھا: ''انیس اشفاق! یار وہ نئی غزل میں......والی تمہاری کتاب لاجواب ہے۔''

---

[1] مجید امجد کا اصل مصرعہ اس طرح ہے: ع سیہ ہوائیں زمانے کے شامیانوں میں شام۔ نظم 'حضرت زینب'۔

میں نے ان کی پسند فرمائی کا شکریہ ادا کیا تو وہ پھر بولے: ''نہیں کتاب.... فراست سنو! ان کی کتاب۔ غزل والی..... فراست تم سے کہہ رہا ہوں..... لاجواب ہے۔''

اس اگلی صف میں جب انہوں نے مجھے اپنے برابر بیٹھا دیکھا تو ایک بار پھر اسی ترنگ میں گویا ہوئے:

''یار انیس اشفاق وہ ظفر اقبال والا مضمون.... میں نے اسے (ظفر اقبال) بتایا لاجواب ہے۔'' اور اسی وقت احمد شاہ نے اس خوش نما اسٹیج کے پہلو میں رکھے ہوئے اسٹینڈ پر لگا ہوا بہت صاف اور بہت تیز آواز والا مائک سنبھال لیا۔ آرٹس کاؤنسل کی چہار دیواری ان کی گرجدار آواز سے گونج رہی تھی۔ اس آواز کو سن کر ایسا لگ رہا تھا:

ع نعرہ ابھی کریں تو ہلے عرصۂ قتال

وہ حاضرین وسامعین کو بتا رہے تھے کہ اس کانفرنس میں کہاں کہاں سے کون کون کیا کیا زحمتیں اٹھا کر آیا ہے اور کون کس وجہ سے کیوں نہیں آسکا۔ یوں تو وہ بہت سے نام لے رہے تھے لیکن بھارت سے آنے والوں کا بار بار ذکر کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے:

''بھارت سے پروفیسر قاضی افضال آئے ہیں، پروفیسر انیس اشفاق پہلی بار آئے ہیں، ہم ان کا استقبال کرتے ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی نہیں آسکے، اس کا ہمیں افسوس ہے۔''

بیچ بیچ میں وہ اپنی گرجتی ہوئی آواز میں ان لوگوں کو بھی ڈپٹ رہے تھے جو مہمانوں کے لیے مخصوص نشستوں پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ اور اس وقت:

تھی قہر کی نگاہ غضب کا جلال تھا
آنکھیں بھی سرخ سرخ تھیں چہرہ بھی لال تھا

کچھ لوگوں نے اٹھنے میں تامل کیا تو احمد شاہ نے انگلی سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''آپ سے کہہ رہا ہوں، آپ جو کوٹ پہنے ہیں اور آپ جو فلاں رنگ کی قمیض پہنے ہیں۔ اٹھیے، مہمانوں کے لیے جگہ خالی کیجیے۔''

میں نے سوچا کہ منتظم ہو تو ایسا نڈر اور بیباک۔ آرٹس کاؤنسل کا صحن سامعین سے چھلک رہا تھا۔ آنے والوں کو بیٹھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو لوگ بھری ہوئی کرسیوں کے چاروں طرف دہری اور تہری قطاروں میں کھڑے تھے۔ احمد شاہ نے اپنی گونجتی ہوئی آواز میں تقریب کے خصوصی مہمانوں سے حسب مرتبہ اسٹیج پر آنے کی گزارش کی۔ اسی بیچ انور شعور سے میری آنکھیں چار ہوئیں اور انہوں نے پھر جھومتے ہوئے کہنا شروع کیا:

''یار تم انیس اشفاق ہی ہو؟''

''جی جی انیس اشفاق۔''

''یار وہ تمہاری کتاب......''

''جی جی۔ دیکھیے احمد شاہ صاحب کیا فرما رہے ہیں۔''

''لیکن یار وہ تمہاری کتاب......''

اُدھر احمد شاہ نام لے لے کر مہمانوں سے اسٹیج پر آنے کی درخواست کر رہے تھے: انتظار حسین، عبداللہ حسین، مسعود اشعر، ضیا محی الدین، افتخار عارف، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر قاضی افضال، پیرزادہ قاسم، مستنصر حسین تارڑ، اسد محمد خاں، عطاء الحق قاسمی، رضا علی عابدی، اشفاق حسین اور امینہ سیّد... یہ خاص مہمان جب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ چکے تو احمد شاہ نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں اس ساتویں عالمی اردو کانفرنس کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور گزشتہ کانفرنسوں کی کامیابیوں کا ایک مختصر سا گوشوارہ پیش کیا۔ سامعین سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''ہر زبان ایک تہذیب کو جنم دیتی ہے۔ اردو نے بھی ایک تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ یہ دلوں کو جوڑنے اور تہذیبوں کو ہم آہنگ کرنے والی زبان ہے۔ ساتویں عالمی کانفرنس کی شکل میں یہ عظیم اجتماع دلوں سے نفرتوں کو مٹانے کی ایک حقیر سی کوشش ہے۔ کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ سات برس قبل ہم نے جو پودا لگایا تھا وہ بالیدہ ہو کر ایسا بارآور درخت بن جائے گا جس کی شاخیں پورے ملک میں پھیل جائیں گی۔''

احمد شاہ کی بلند ہوتی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی:

''دنیا بھر کے ادیب اور دانشور اس کانفرنس میں اپنی شرکت کو
باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ میرے ذہن میں اکثر یہ سوال اٹھا کرتا تھا کہ
ایسی عظیم زبان اور اس سے متعلق تہذیب کی بقا اور ترویج کے لیے
اب تک کوئی منظم کوشش کیوں نہیں کی گئی۔ جب ہم نے اس کانفرنس
کا ڈول ڈالا تو ہر صاحبِ علم شخص ہماری صف میں شامل ہوتا گیا اور
اب تو چار دانگِ عالم میں اس کا شہرہ ہے۔''

یہ خطبہ دینے کے بعد انہوں نے بتایا:

''ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے عہد کے سب سے بڑے مزاح
نگار اور افسانوی شہرت کے حامل جناب مشتاق احمد یوسفی کی کتاب
''شامِ شعرِ یاراں'' کے اجرا کی رسم بھی یہاں انجام دی جائے گی۔
یہ کتاب کاؤنسل کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔''

یہ اطلاع دینے کے بعد انہوں نے سامعین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

''اب مائک میں محترمہ ہما میر کے حوالے کرتا ہوں جو اجلاس کی باقاعدہ نظامت
کے فرائض انجام دیں گی۔''

اور فوراً ہی مائک کے سامنے کشادہ پیشانی والا ایک چمکتا ہوا چہرہ نمودار ہوا:

وہ روئے دل فروز وہ زلفوں کا پیچ و تاب
گویا کہ نصف شب میں نمایاں تھا آفتاب

وہ خاتون ایک خاص ادا سے مائک کے سامنے آکر کھڑی ہوئیں۔ خمدار ابروؤں کے نیچے گھنیری پلکوں والی آنکھوں کو گردش دے کر انہوں نے سامعین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ سیاہ زلفوں کو ہلکی سی جنبش دے کر لہرایا، لکھا ہوا کاغذ پوڈیم پر رکھا، ہلکا سا مسکرائیں اور بڑے دل نواز لہجے میں ساتویں عالمی کانفرنس کی تمہید باندھنا شروع کی۔ کاغذ پر جمی ہوئی ان کی آنکھیں کبھی کبھی سامعین کی طرف بھی اٹھ جاتیں اور ان لوگوں کی طرف بھی جو اسٹیج پر بطور مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ ہما میر کو دیکھ کر اور انہیں سن کر بہ آسانی سمجھا جا سکتا تھا کہ انہوں نے

اس تقریب کے لیے خود کو اچھی طرح تیار کیا ہے۔ اس اچھی طرح کی تیاری میں ان کا لباس، ان کی آرائش، ان کے بولنے کا ڈھنگ اور مائک کے سامنے کھڑے ہونے کا انداز سب کچھ شامل تھا۔ خوش اسلوبی سے کانفرنس کی تمہید باندھنے کے بعد جب انہوں نے مائک پر آکر مہمانوں کو سامعین سے خطاب کرنے کی دعوت دی تو سب سے پہلے کرسی نشینوں کی صف سے اٹھ کر باوقار انداز میں چلتے ہوئے مائک پر آئے ضیاء الدین یونیورسٹی کے وائس چانسلر پیرزادہ قاسم۔ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے وہ ادیب سے زیادہ مفکر معلوم ہورہے تھے۔ ان کے کان اُن کے سفید بالوں میں چھپے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ اگر ان کے ہاتھ میں ایک پائپ یا سگار دے دیا جائے تو وہ کراچی کے مدرسۂ وجودیت میں سارتر کے قائم مقام نظر آنے لگیں۔ مائک پر آکر انہوں نے خالص فلسفیانہ انداز میں سامعین کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''ہمارا معاشرہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ ہمیں اس بدلتے ہوئے منظرنامے میں اپنا عکس دیکھنا ہوگا۔ ہماری زبان ادب وثقافت کا گہوارہ ہے۔ کسی روایت کو باقی اور قائم رکھنا ایک بڑا مرحلہ ہے۔ یہ کانفرنس اسی مرحلے کا جشنِ جاریہ ہے۔ یہ ایک بڑی کانفرنس ہے جس سے ہماری زبان فیضیاب ہوگی۔''

سامعین سے خطیبانہ انداز میں ہمکلام ہوتے ہوئے پیرزادہ قاسم کہہ رہے تھے:

> ''ہم غیر محسوس طریقے پر عالم گیر کلچر کی طرف مائل ہوتے جارہے ہیں۔ معاشرے کے ترجیحات بدل رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ وہ ثقافتیں جو اقلیت میں ہیں، کبھی پروان نہیں چڑھتیں۔ ہمیں اپنی زبان، ثقافت اور ادب کے مثبت پہلوؤں پر نگاہ رکھنا ہوگی'' [اور ان کا تحفظ کرنا ہوگا۔]

پیرزادہ قاسم کی فاضلانہ تقریر کے بعد بھارت کے ادیب پروفیسر قاضی افضال کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ سابق مقرر کی طرح انہوں نے بھی دانشورانہ انداز میں اپنی بات کہنا شروع کی:

''زبان انسان کی خلقی ضرورت ہے۔'' عالمی سطح کے ماہرینِ لسانیات کے حوالوں کی روشنی میں انہوں نے کہا:

''زبان کا زبان سے دو سطحوں کا تعلق ہوتا ہے، ایک خلقی دوسرا معاشرتی۔ برصغیر میں اردو زبان کل بھی موجود تھی اور ترسیلی صلاحیت کی بنا پر آج بھی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔''

ان کی باتوں کو غور سے سننے والے سامعین اس وقت بہت خوش ہو گئے جب انہوں نے کہا:

''اپنی زبان کی موجودہ توانائی کے باوجود میں سوچتا ہوں کہ جب مشتاق احمد یوسفی ہم میں نہیں ہوں گے تو ہم کس طرح زندہ رہیں گے۔''

افتتاحی اجلاس کی تقریبِ اول میں اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو صدارت کی مجلس میں شامل کیا گیا تھا لیکن خطاب کرنے والوں میں چند ہی لوگ تھے۔ انہیں چند لوگوں میں تقریب کے آخری مرحلے میں انتظار حسین سامعین کے سامنے آئے اور وہ جو فلسفہ و دانش کی باتیں ہو رہی تھیں، ان سے ہٹ کر سادہ زبان میں اپنی باتیں کہنا شروع کیں۔ ان میں سے بہت سی باتوں کا تعلق ان کے ملک میں ان کی زبان کی صورتحال سے تھا۔ سب یہ باتیں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے تھے۔ وہ بول رہے تھے اور غیب سے ایک آواز آ رہی تھی:

ع سخنِ حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو

انتظار صاحب اپنے مخصوص لہجے میں بڑی خاص، بڑی تلخ اور بڑی اہم باتیں بتا رہے تھے، کہہ رہے تھے:

> ''عالمِ اسلام میں قیامتیں ٹوٹ رہی ہیں اور ہمیں ان قیامتوں کا عادی ہو جانا چاہیے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ان قیامتوں میں بھی یہ کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ موت سے بھاگتے ہیں وہ موت ہی کی طرف بھاگتے ہیں۔ ادب اور ثقافت کو پھلتے پھولتے رہنا چاہیے۔ جب آرٹس کاؤنسل کی طرف سے پہلی اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا، اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں

سکتا تھا کہ یہ کانفرنس آنے والے سالوں میں بھی اسی کامیابی سے منعقد ہوگی۔ کراچی بلاشبہ دمشق سے آگے نکل گیا ہے۔ سال بہ سال اس کانفرنس کا اہتمام کر کے کراچی والوں نے کمال کر دکھایا۔ ناسازگار حالات میں بھی کراچی والے علم وادب کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ لاہور والوں نے آپ سے تحریک حاصل کی ہے اور وہاں بھی اس نوع کی کانفرنسوں کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ اب دوسرے صوبوں میں بھی اس کی بنا ڈالی جائے۔''

عمر کی اس منزل میں بھی انتظار صاحب کی آواز پوری قوت کے ساتھ سامعین تک پہنچ رہی تھی اور یہ مصرعہ ان کے لیے بالکل موزوں معلوم ہو رہا تھا:

ع ہمت میں نوجواں ہیں متانت میں پیر ہیں

وہ کہہ رہے تھے:

''اس کانفرنس میں بہت فکر انگیز اور خیال افروز مقالے پیش کیے جاتے ہیں۔''

انتظار صاحب کی پراثر تقریر کے بعد وہ خاتون جن کا سامنے رہنا سب کو اچھا لگ رہا تھا، اچھی طرح نظامت کے فرائض انجام دے کر سامعین کی صف میں آگئیں۔ مائک پر یہ خاتون کچھ ہی دیر رہیں لیکن اتنی ہی دیر میں:

ع اقبال سر کے گرد ہما بن کے پھر گیا

تقریب کے دوسرے مرحلے کے لیے مائک پر احمد شاہ پھر آ گئے اور سب سے پہلے اُنھوں نے تقریب کے مہمانِ ذی شرف مشتاق یوسفی سے اسٹیج پر آنے کی مودبانہ گزارش کی۔ پھر زہرا نگاہ، انتظار حسین، عبداللہ حسین اور افتخار عارف اپنی کرسیوں پر آ کر بیٹھے۔ ان صورتوں کو اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر میں نے دل میں کہا:

ع دیکھو انہیں دموں سے ہے رونق زمین کو

پھر اسٹیج پر آئے: عطاء الحق قاسمی، انور مقصود، آغا ناصر، مستنصر حسین تارڑ، ڈاکٹر فاطمہ حسن،

شاہد رسام، کمشنر کراچی شعیب احمد صدیقی اور صوبائی وزیر فیصل سبزواری۔ یہ سب اِس دوسری مجلس کے اراکینِ صدارت میں تھے۔

آرٹس کاؤنسل کے اس بہت بڑے صحن میں بھرے ہوئے بلکہ ایک دوسرے میں گُتھے ہوئے سامعین کے درمیان احمد شاہ کی آواز بلند ہو رہی تھی:

''شامِ شعرِ یاراں ہمارے عہد کے عظیم مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی پانچویں کتاب ہے جو تقریباً پچیس برس بعد منظرِ عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف آرٹس کاؤنسل کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے بلکہ اس کے اجرا کی رسم بھی یہاں انجام دی جائے گی۔ یہ کتاب پرستارانِ یوسفی کے لیے بلاشبہ ایک خصوصی تحفے کی حیثیت رکھتی ہے۔ چند ماہ قبل جب میں اُن سے ملنے گیا تو وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ کئی برسوں سے کوئی اہم کتاب سامنے نہیں آئی۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ کتاب آ گئی ہے اور اس کا نام ہے: ''شامِ شعرِ یاراں'' جس کے ہر ورق پر وہی ظرافت اور وہی شگفتگی بکھری ہوئی ہے جو ان کی پہلے کی کتابوں میں موجود ہے۔''

انہوں نے اس تقریب کی صدارت قبول کرنے کے لیے زہرا نگاہ کا شکریہ بھی ادا کیا۔

احمد شاہ کے ان تعارفی کلمات کے بعد کتاب اور صاحبِ کتاب پر گفتگو کرنے والوں میں جو شخص سب سے پہلے مائک پر آیا اس کا نام تھا شاہد رسام۔ میں اس کے نام کا دوسرا لفظ سن کر چونکا۔ یہ لفظ میرے علم میں نہیں تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس کی اصل پر غور کرتا، سر سے پیر تک فنکار نظر آنے والے اس شخص نے اپنا مضمون پڑھنا شروع کر دیا۔ اچھے بدن اور مناسب شکل و شباہت والے اس شخص نے پیچھے کی طرف کھینچے ہوئے اپنے بالوں کی ایک چوٹی بنا کر اسے ایک سوتی چھلّے سے باندھ رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی شکل پونی ٹیل کی سی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا: ہو گا کوئی ایسا ہی نوجوان جسے منتظمین نے کسی کی سفارش پر یہ موقع فراہم کر دیا ہو گا۔ لیکن جب اس شخص نے اپنا مضمون پڑھنا شروع کیا تو اس کی مخصوص قرأت نے سب

کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ لہجے کا اتار چڑھاؤ، جملوں کو ادا کرنے کا خاص انداز، ٹھہرنا، رکنا، سامعین کو دیکھنا، آواز کے آہنگ کو بدلنا۔ ہر شخص اپنے دل میں کہہ رہا تھا:

ع یہ حسنِ صوت اور یہ قرأت یہ شدّ ومد

یہ سب تو اس کی قرأت کی خوبیاں تھیں لیکن جو کچھ وہ پڑھ رہا تھا وہ سب بھی لائقِ سماعت تھا اور اسے سن کر ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ جوانِ رعنا یوسفی کی گود کا پالا ہوا ہو۔ اپنی غربت، یوسفی کے یہاں اپنی آمد، یوسفی اور بیگم یوسفی سے قربت، خاندانِ یوسفی کے ذریعے اس کی خبر گیری اور کفالت اور مصور بننے تک کے مرحلے میں یوسفی کی اعانت۔ مضمون میں ان سب کا ذکر تھا اور اس کی ایک ایک سطر حرفِ صداقت کی آئینہ دار تھی۔ بیچ بیچ میں وہ مغربی مصوروں کا بھی ذکر کر رہا تھا اور جہاں اُسے اردو کے مناسب لفظ نہیں مل رہے تھے، وہاں وہ انگریزی کے لفظوں کا سہارا لے رہا تھا۔ لیکن یہ سب اس کے مضمون میں اس طرح آرہے تھے جیسے اس کی عبارت کے لازمی اجزا ہوں۔ اس کا بولا ہوا ہر لفظ اچھا لگ رہا تھا۔ اس نوجوان مصور نے اپنے موئے قلم سے یوسفی کا ایسا مرقع تیار کیا تھا جس میں یوسفی کے سارے صفات روشن ہو گئے تھے۔ اس کی بنائی ہوئی تصویر میں ہم ایک ایسے یوسفی کو دیکھ رہے تھے جو نرم دل، خوش اطوار، مشفق و مہربان اور کفیل و خبر گیر — سب کچھ تھا۔ حاتم کی طرح جس کے دروازے حاجت مندوں کے لیے ہمیشہ کھلے ہوئے تھے۔ جو دوسروں کا دکھ سن کر پریشان ہو جاتا تھا۔ شاہد رسام نے اس مرقعے میں ایسے رنگ بھرے کہ اسے دیکھنے والے داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔

شاہد رسام کی اس جاندار مرقع نگاری کے بعد انجمن ترقی اردو، کراچی کی اعزازی معتمد ڈاکٹر فاطمہ حسن نے یوسفی کی مزاح نگاری کے رموز کو روشن کرتے ہوئے کہا:

> ''آج اُس کتاب کے اجرا کی مبارک رسم انجام دی جارہی ہے جو کتابہائے یوسفی میں سب سے معتبر کتاب ہے یعنی ''شامِ شعرِ یاراں''۔ بلاشبہ یہ ایک تاریخی لمحہ اور مبارک موقع ہے اور ہماری خوش بختی ہے کہ ہم اس تاریخی لمحے کا حصہ اس لیے بن گئے ہیں کہ اس میں ہمارا عہد لکھا گیا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ایک قابلِ رشک اور ناقابلِ تقلید

مزاح نگار ہیں۔''

فاطمہ حسن کے ان توصیفی کلمات کے بعد مائک پر آئے برصغیر کے معروف شاعر افتخار عارف۔ یہ شخص میرے شہر کا تھا، ہمارے گلی کوچوں میں بہت گھوما تھا، ہماری دانش گاہ میں پڑھا تھا سو میں نے اس کے لیے دعا کی:

ع تاباں رہے یہ نیرِ اقبالِ بے زوال

انہوں نے اپنی مخصوص آواز میں کہنا شروع کیا:

''یوسفی صاحب ایک عہد ساز مزاح نگار تو ہیں ہی لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے ایک سفرنامہ بھی لکھا تھا لیکن سات سو صفحے لکھنے کے بعد اسے یہ کہہ کر پھینک دیا کہ مزا نہیں آرہا۔ یہی نہیں وہ ایک ناول بھی لکھ رہے تھے لیکن جب چار سو صفحات پورے ہو گئے تو بولے کہ ہیرو تو اب پیدا ہوا ہے اور جب ہیرو پیدا ہو گیا تو اسے کہیں رکھ کر بھول گئے۔''

سامعین افتخار عارف کے یہ دل چسپ انکشافات سن کر اُسی طرح ہنس رہے تھے جیسے مشتاق یوسفی کے تبسّم خیز جملوں پر ہنستے ہیں۔ افتخار عارف نے اس تجویز کے ساتھ اپنی بات ختم کی کہ یوسفی صاحب کی ان تحریروں کو بھی شائع ہونا چاہیئے۔

اور اب مہمانوں کی صف سے ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس کا چہرہ پاکستان کے چھوٹے پردے پر بار بار نمایاں ہوتا ہے۔ اس شخص نے مائک پر آکر بہت ڈرامائی انداز میں سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا:

''حاضرین! یہاں آنے سے قبل میں خدائے سخن میر تقی میر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ انہوں نے جب سنا کہ یوسفی صاحب کی نئی کتاب آئی ہے تو بہت خوش ہوئے۔ بولے: ''یوسفی کو میرا سلام کہنا۔'' میں نے کہا: ''ہم خوش قسمت ہیں کہ عہدِ یوسفی میں زندہ ہیں اور یوسفی صاحب کی بدنصیبی ہے کہ وہ مسلم لیگ نون کے عہد میں جی رہے

ہیں۔'' میں نے یوسفی صاحب کی چاروں کتابیں پڑھی ہیں اور اب
پانچویں کتاب کو جی لگا کر پڑھوں گا۔''

شاہد رسام نے اپنے مضمون کی قرأت سے جو سماں باندھا تھا، انور مقصود نے اسے اپنے ڈرامائی لہجے اور دلچسپ اندازِ بیان سے ٹوٹنے نہیں دیا۔

سامعین ہمہ تن گوش تھے۔ تحسینِ یوسفی کی ضیاباریوں میں ان کے روشن رخوں پر نور اور زیادہ برس رہا تھا۔ انہیں نور افشانیوں میں مائک پر تشریف لائے ملکِ متن خوانی کے شہنشاہ... ضیا محی الدین۔ احمد شاہ کی زبان پر ان کا نام آتے ہی پورا صحن تالیوں سے گونجنے لگا۔ اپنی پڑھت سے لفظ کو زندہ کر دینے والی تھیٹر، فلم اور ٹی۔وی کی شہرۂ آفاق شخصیت ضیا محی الدین نے مائک سنبھالا اور: ع ''یوں گہر بار ہوئے اس کے لبِ گوہر بار''

''ابنِ انشاء کے بقول ہم ظرافت کے عہدِ یوسفی میں جی رہے ہیں۔
میں یوسفی صاحب کا ممنون ہوں کہ میں نے بارہا ان کی تحریروں کی
پڑھت کی ہے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے قبلِ تقسیم کے پارسی تھیٹر سے متعلق یوسفی صاحب کی ایک نادرالوجود تحریر اپنے منفرد اور ناقابلِ تقلید لہجے میں یوں سنائی کہ وہ سارے منظر آنکھوں میں عریاں ہونے لگے جنہیں یوسفی نے اپنے چنے ہوئے لفظوں سے بے لباس کیا تھا۔ سامعین یوسفی صاحب کے لکھے ہوئے لفظوں اور ضیا محی الدین کی خواندگی کے ذریعے نسائی خطوطِ بدن کی اتاری ہوئی تصویروں کو دیکھ دیکھ کر اپنے جذبات کو بار بار برانگیختہ ہونے سے روک رہے تھے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس ہیجان انگیزی میں کمال مشتاق یوسفی کی تحریر کا تھا یا ضیاء محی الدین کی پڑھت کا۔ جتنی دیر ضیا محی الدین یہ تحریر پڑھتے رہے، سامعین قہقہے لگاتے رہے اور اپنی چشم تماشا کی تیزی کو بڑھاتے رہے۔ محی الدّین اِس وقت دین کو حیات بخشنے کے بجائے اُن جذبوں کو زندگی دے رہے تھے جنہیں دین بے دینی میں شمار کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی قرأت ختم کی تو سامعین کی صفوں میں بہت دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔

دلوں کو باغ باغ کر دینے والی ضیاء محی الدین کی دل آویز پڑھت کے بعد

کرسیِ صدارت سے اس عورت کی آواز بلند ہوئی جس نے اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے شاعری کے نسائی لہجے کو اعتبار بخشا اور پاکستان کی خاک سے اٹھنے والی نوجوان شاعرات کے لیے نئے نسائی لہجے کی راہ ہموار کی۔ یہ عورت تھی ہمارے عہد کی مشہور و معتبر شاعرہ زہرا نگاہ جس نے عمر کی اس منزل میں بھی صفحۂ کاغذ پر اپنا قلم رواں رکھا اور اس کے روضۂ سخن میں کھلے ہوئے گلہائے معانی کی بو ہم تک پہنچتی رہی۔ زہرا نگاہ بہت نرم، پروقار اور اعتماد سے بھرے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھیں:

''مشتاق احمد یوسفی کی شگفتہ اور ظریفانہ تحریروں نے ہمیں اِس آشوب میں جینے اور مسکرانے کا موقع فراہم کیا ہے۔ طنز و مزاح کا تعلق اُس صنفِ ادب سے ہے جو لکھنے والے کی ذات کے دریچوں کو روشن کرتی ہے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے بہت بلیغ جملہ کہا:

''اس صنف کو عام تو ہونا چاہیے، عامیانہ نہیں۔''

مشتاق احمد یوسفی نے منتظمین سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ نہ تو اپنی کتاب کے تعلق سے کوئی بات کریں گے اور نہ کسی کتاب پر دستخط کریں گے۔ لیکن تقریب ختم ہوتے ہی لوگ کانفرنس کے اسٹال سے خریدی ہوئی اُن کی کتابیں لے کر اسٹیج پر پہنچ گئے اور دستخط حاصل کرنے کی ہوڑ لگ گئی۔ لیکن یوسفی صاحب کے دست کش ہوجانے کی وجہ سے مشتاقانِ مہرِ یوسفی بے نیلِ مُرام اسٹیج سے نیچے اتر آئے۔

احمد شاہ نے فاتحانہ شان سے تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔ آرٹس کاؤنسل کی چہاردیواری میں بھرے ہوئے سامعین میں ہر شخص مہمانوں سے ملنے اور ان کے ساتھ تصویریں کھنچوانے کو بیتاب تھا۔ یہ سلسلہ اسٹیج پر اور اسٹیج کے نیچے بہت دیر تک چلتا رہا۔ لوگ احمد شاہ کو گھیرے ہوئے تھے اور افتتاحی اجلاس کی شاندار کامیابی پر انہیں مبارکباد دے رہے تھے۔ میری نگاہیں فراست، ان کی بیگم اور شعیب کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جلد ہی وہ مجھے نظر آ گئے۔ پھر ان تینوں نے مجھے اپنے ملنے والوں سے ملوانا شروع کیا۔ فراست کے بارے میں تو میں نے سن

رکھا تھا کہ وہ کراچی کے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہیں لیکن بھابھی کے ملاقاتیوں کا وسیع حلقہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس حلقے میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔ شعیب کا ایک خاص حلقہ تھا جس کا تعلق افسروں اور تاجروں سے تھا۔ اسی ملنے ملانے میں ہماری ملاقات پاکستانی تھیٹر کی ان ہستیوں سے بھی ہوگئی جو آج کل ہندوستان کے چھوٹے پردے پر آکر خوب مقبول ہو رہی ہیں۔ پھر اسی بھیڑ میں مجھے شاہد رسام نظر آ گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کی پیٹھ ٹھونکی اور ایک اچھا مضمون لکھنے اور اسے اچھی طرح پڑھنے پر انہیں مبارکباد دی اور اُن سے ان کا مضمون بھی طلب کیا تاکہ اسے ہندستان کے کسی اہم رسالے میں شائع کراؤں۔ فراست نے مجھے بتایا کہ ان کا یہ نام جون ایلیا کا دیا ہوا ہے اور تب مجھے معلوم ہوا کہ رسام کے معنی ہیں مصوّر۔

مشتاق یوسفی کی تقریب کے اختتام پر پاکستان کی مشہور رقاصہ شیمہ کرمانی کے رقص کا اعلان ہو چکا تھا۔ کلاسیکی رقص کے بارے میں جو کچھ میری شُد بُد ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک فن شناس رقاصہ ہیں۔ آرٹس کاؤنسل کا ہال جہاں اس رقص کا مظاہرہ ہونا تھا، چشم زدن میں بھر گیا۔ جو شائقین ہال میں جگہ نہ پا سکے وہ کاؤنسل کے احاطے میں لگے ہوئے ایک بڑے پردے پر شیما کرمانی کے رقص کی رونقوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ بھاؤ بتانے اور تال اور سر سے قدم ملانے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ناچوں میں سب سے مشکل ناچ کتھک ہے اور لکھنؤ اس کے لیے مشہور ہے۔ کتھک میں اگر اچھے سازندے بالخصوص ماہر طبلہ نواز نہ ہوں تو رقاص کے پاؤں صحیح نہیں پڑتے۔ لکھنؤ کے احمد جان تھرکوا ہندستان کے بہت بڑے طبلہ نوازوں میں تھے اور میں نے ان کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ میرے محلّے میں کئی مشہور سازندوں کی رہائش تھی اس لیے تالوں اور سُروں سے میرے کان آشنا تھے۔ شیما کرمانی ماہر سازندوں کے ساتھ اپنے رقص کا جادو جگا رہی تھیں اور مجھے اپنے شہر کے بندادین، لچھو مہاراج اور برجو مہاراج یاد آ رہے تھے۔ بندادین واجد علی شاہ کے پسندیدہ رقاص تھے۔ ان کے والد درگا پرساد الہ آباد کے ہنڈیا ضلع کے کچھگلا گاؤں سے ۱۸ویں صدی کے اوائل میں دربار کے بلاوے پر لکھنؤ آئے تھے۔ اس گاؤں میں ۹۸۹ گھروں پر مشتمل ان کی جمعیت 'کتھک خاندان' کے نام سے جانی

جاتی تھی۔ اُن کے یہاں آنے کے بعد کتھک لکھنؤ کی شناخت بن گیا۔ اپنے زمانے میں بڑے بزرگوں سے میں سنا کرتا تھا کہ سعادت علی خاں کے زمانے میں پرکاش نام کا ایک شخص بتاشے اور کوڑی پر ناچتا تھا۔ یہی حال لکھنؤ کے موسیقاروں کا بھی تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں حیدر خاں سڑے فنِ موسیقی کے ماہر تھے۔ من موجی آدمی تھے۔ جی میں آیا تو گایا نہیں تو منہ گھمایا۔ اسی کج روی کی بنا پر سڑے کہلانے لگے۔ اسی زمانے میں شوری کی بھی بہت شہرت تھی جو ٹپّے کا موجد تھا۔ خود واجد علی شاہ نے بہت سی ٹھمریاں اور دادرے ایجاد کیے تھے۔ اور لکھنؤ کی بھیرویں کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں طرح طرح کی راگ راگنیاں ایجاد ہوئیں اور مذہب میں بھی ان کا دخل اس طرح ہوا کہ سوز خوانوں نے ان مشکل راگوں میں سوز پڑھ کر فن سے اپنی واقفیت کے خوب خوب مظاہرے کیے۔ اس وقت دربار کے اندر اور باہر بھی ایک سے ایک موسیقار تھے۔ دربار کے باہر ایک گلوکار باسط خاں کے لیے کہا جاتا تھا کہ وہ تان سین کے خاندان سے تھے۔

شیما کرمانی کا رقص دیکھتے دیکھتے میں بھی کہاں سے کہاں نکل گیا۔ مجھے افسوس یہ تھا کہ ملنے ملانے کے عمل میں میں ہال کے اندر نہیں پہنچ سکا مجبوراً میں پردے پر ہی شیما کرمانی کے پیروں کو تھرکتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ جب وہ کسی تال یا تھاپ پر اپنے جسم کو لہرا کر فرش پر دھمک کے ساتھ اپنے پاؤں جماتیں تو پورا ہال اور پورا صحن تالیوں سے گونجنے لگتا۔

عِشائیے کا وقت ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ پہلے ہی 'گل رنگ' پہنچ چکے تھے کچھ خراماں خراماں اُس طرف بڑھ رہے تھے۔ افتتاحی تقریب کی اس شاندار کامیابی کے لیے احمد شاہ پر ہر طرف سے تحسین کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ 'گل رنگ' میں کوئی شاہد رسّام کے مضمون کی تعریف کر رہا تھا، کوئی افتخار عارف کی تقریر کی اور کوئی انتظار صاحب کی کھری کھری باتوں کی۔ کچھ لوگ ابھی تک اپسراؤں جیسی نظر آنے والی عورتوں کی عریانی کے وہ منظر اپنی آنکھوں میں سمیٹے ہوئے تھے جنہیں مشتاق یوسفی نے اپنے فقروں سے بنایا تھا اور ضیا محی الدین نے اپنی پڑھت کے ذریعے دکھایا تھا۔ لوگ اپنی اپنی پلیٹوں میں کھانا لے کر میزوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں

سب سے ملتا ملاتا اس میز پر پہنچا جہاں فراست — انور شعور، امجد اسلام امجد اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھے اپنے تیکھے اور ظریفانہ جملوں سے انور شعور کو دانستہ اشتعال دلا رہے تھے۔ فراست اُنھیں پابندِ مذہب اور دیندار ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے اور یہ سن کر انور شعور آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے:

''لیکن آپ نماز پڑھتے تھے۔'' فراست نے انہیں چھیڑا۔

''بالکل نہیں۔ کس نے کہا تم سے؟''

''آپ نے روزے بھی رکھے ہیں۔''

''ارے کون کم بخت کہتا ہے۔ میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی، کبھی روزہ نہیں رکھا۔''

''شروع میں آپ بہت دیندار تھے۔''

''غلط کہتے ہو تم۔ یہ سب کس نے بتایا تمہیں میں کبھی مذہبی نہیں رہا۔ قلندر ہوں، اپنی موج میں رہتا ہوں۔''

''لیکن آپ نماز.....''

''غلط بالکل غلط۔ جو میں نہیں ہوں وہ کیوں بنانے پر تلے ہو تم۔''

فراست انہیں چھیڑے جا رہے تھے اور وہ اپنی موج میں کرسی سے اٹھ اٹھ کر فراست کی طرف یوں لپک رہے تھے جیسے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے ہی والے ہوں۔ اس غضبناکی میں کبھی پلیٹ سے ان کی کہنی ٹکراتی، کبھی چمچہ زمین پر گرتا کبھی لقمہ ان کے منہ تک آ کر رہ جاتا۔ فراست اور انور شعور کے مابین اس میز پر جو کچھ جس طرح ہو رہا تھا اسے دیکھ کر میرے لیے اپنی ہنسی کا روک پانا مشکل تھا۔ جب یہ چھیڑ چھاڑ ختم ہوئی اور لقمہ انور شعور کے منہ کے اندر گیا تو ایک بار پھر انہوں نے مجھے مخاطب کر کے وہی کہا جو پہلے کہا تھا:

''یار انیس اشفاق....'' پھر انہوں نے فراست کی کہنی پکڑی۔ ''یار فراست ....! وہ انیس اشفاق کی جو کتاب ہے.........وہ غزل کا علامتی..... یار کیا اچھی....''

''اپنی کچھ غزلیں سنایئے۔ چھوٹی بحروں میں آپ خوب کہتے ہیں۔'' میں نے بات کا رخ بدلا۔ انور شعور نے اپنے شعر سنانا شروع کیے اور ہم نے داد دینا شروع کی۔ بیچ بیچ میں

کوئی مجھ سے یا فراست سے ملنے آجاتا تو اسی میز پر بیٹھ کر ہماری باتیں سننے لگتا۔ بھابھی کچھ خواتین کے ساتھ کسی اور میز پر بیٹھی مصروفِ طعام تھیں۔ کھانا ختم ہوا۔ ہم 'گل رنگ' سے باہر نکلے۔ باہر پیشہ ور فوٹوگرافر مہمانوں کو روک روک کر ان کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ کچھ لوگ یہ دیکھ کر دوڑے دوڑے آئے اور مہمانوں کے ساتھ اپنی تصویریں کھنچوانے لگے۔

'گل رنگ' سے باہر نکل کر میں نے اوپر تاروں بھرا آسمان دیکھا۔ میں اس گنبدِ نیلوفری کی دید میں گم تھا کہ فراست کا حرفِ رخصت میرے کانوں تک آیا:

''اچھا حضور، انشاء اللہ کل.....''

رات اپنے پہلے پہر سے نکل چکی تھی۔ ہم آرٹس کاؤنسل کی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل آئے۔ کپڑے بدلے اور بستر پر دراز ہوگئے۔ تکان بہت تھی اس لیے نیند بہت جلد آگئی۔

●

صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے چائے منگوائی اور کھڑکیوں کے پردے کھینچ کر باہر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان میں اس لیے دیکھتا ہوں کہ زمینوں کی طرح وہ بستۂ زنجیر نہیں ہے۔ اس نے اپنی حدیں نہیں قائم کی ہیں۔ پرندوں کے لیے اس کی آغوش کھلی رہتی ہے۔ وہ ہر زمین پر ایک سا نظر آتا ہے۔ اس کے سورج کی دھوپ بھی ہر زمین پر ایک سی ہوتی ہے، اس کی پہنائیاں اسرار سے بھری ہوئی ہیں اور وہ زمین کے ذی روحوں کی آلودگیوں سے پاک ہے۔ میں نے اُس آسمان کو جہاں تک دیکھ سکتا تھا دیکھا۔ پرندے اس کی پہنائی میں نہیں تھے اور نہ ہوٹل کے صحن میں لگے ہوئے درختوں کی شاخوں پر۔ وہ اُس آسمان سے بہت آگے چلے گئے تھے جو میرے حلقۂ نگاہ میں تھا۔

چائے آچکی تھی۔ میں اور قاضی صاحب چائے پر روزِ گزشتہ کی تقریبوں پر گفتگو کرتے رہے پھر تیار ہو کر ناشتے کے لیے نیچے اترے۔ آج ڈائننگ ہال میں مدعوئین کی تعداد زیادہ تھی۔ یہ لوگ رات میں کسی وقت آئے تھے۔ ہال میں کنارے کی ایک میز پر انتظار صاحب مسعود اشعر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ دور پر مستنصر حسین تارڑ تنہا چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ عبداللہ حسین ناشتہ ختم کرنے کے بعد میز پر مراقبے کے سے انداز میں بیٹھے تھے۔ ہندوستان سے آنے والے

نو جوان شعرا خوشبیر سنگھ شاد کی معیت میں قہوۂ صبح گاہی کا لطف لے رہے تھے۔ اور ایک میز پر علم آثار صورتوں والے کچھ تازہ دم نو جوان ایک دوسرے سے محوِ گفتگو تھے۔ میں ان میں سے صرف ناصر عباس نیر کو پہچانتا تھا جن سے گزشتہ سال دہلی میں ایوانِ غالب کے سیمنار میں ملاقات ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور ٹوٹ کر ملے۔ ناصر عباس نیر نے مجھے میز پر بیٹھے ہوئے دوسرے نوجوانوں سے ملوایا: ''یہ نجیب جمال ہیں اور یہ ڈاکٹر ضیاء الحسن۔''

ان میں سے ایک کا تعلق ملتان سے تھا دوسرے کا لاہور سے۔ ان دونوں ادیبوں کی عمریں کچھ بہت زیادہ نہیں تھیں لیکن ان کی تصنیفوں اور تالیفوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان قلم کاروں نے اپنے خامۂ زود رقم کو زحمت دیے بغیر اپنی جو کتابیں مجھے مرحمت فرمائیں ان پر ان کی نگارشات کی طویل فہرست دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور سوچنے لگا کہ پاکستان میں لوگ اتنا کیسے لکھ لیتے ہیں۔ ناصر عباس نیر کا قلم بھی اس وقت بہت رواں ہے اور ان کی زود نگاری کا مظاہرہ ہندو پاک کے تمام بڑے جریدوں میں ہو رہا ہے۔ نئی اردو تنقید کو اُن سے بڑی توقعات ہیں۔ وہ اُن لکھنے والوں میں ہیں جو سوچتے ہیں، غور کرتے ہیں اور محنت سے لکھتے ہیں۔ اگر نظری مباحث کے گورکھ دھندوں میں بہت زیادہ نہیں الجھے تو مصنف کے مطالب کی نارسائی کے الزام سے بچ نکلیں گے۔ حد سے بڑھی ہوئی دانش زدگی کی بنا پر ہمارے بیشتر مصنفین کا قلم آج اِس شفافیت سے محروم ہے۔ پھر یہ کہ زود کلامی اور زود نویسی دونوں میں ہر جگہ ایک سے معیار کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ مضمون نگاری قلم بازی بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ جو محبوب خزاں نے سہلِ ممتنع میں شاعروں کو نصیحت کی تھی:

ع کم کہو، اپنا کہو اچھا کہو

وہ نثر نگاروں پر بھی صادق آتی ہے۔ میں نے چونکہ نجیب جمال اور ضیاء الحسن کی تحریریں ابھی زیادہ نہیں پڑھی ہیں، اس لیے میں یہ کیوں کہوں کہ زود نویسی اچھی چیز نہیں۔ ضیاء الحسن کے دیے ہوئے شعری مجموعے ''ازل سے'' کے مطالعے سے مجھ پر ایک خوش گوار تاثر قائم ہوا اور بقول شمیم حنفی: ''انہوں نے غزل کے معلوم اور مانوس اسالیب کے ساتھ کسی طرح کی دراز دستی

کے بغیر انہیں اندر سے بدلنے اور اپنانے کی کوشش کی ہے۔''

کشتۂ لکھنؤ یاس یگانہ چنگیزی پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود نجیب جمال نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے ایک اچھا مقالہ لکھا ہے اور بہت کچھ لکھے ہوئے کو جمع کر کے اس میں بہت کچھ اور جمع کیا ہے اور اس میں معنی خیز اضافے بھی کیے ہیں۔

ڈائننگ ہال میں ایک اور میز پر ایک بہت نفیس خاتون کسی شخص کے ساتھ سکے ہوئے توسوں پر بڑی نزاکت کے ساتھ مکھن لگا رہی تھیں۔ غالباً یہ بھی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئی تھیں۔ ان ہی سے ملی ہوئی میز پر فن لینڈ سے آئے ہوئے ارشد فاروق بیٹھے تھے جن کی جسامت خوشحال ملک سے ان کے تعلق کی صاف گواہی دے رہی تھی۔ عبید صدیقی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم لوگ جس دن سے اس ہوٹل میں آئے تھے، اسی دن سے وہ سب سے پہلے ناشتے سے فارغ ہو لیتے اور اپنے صحافی دوستوں سے ملنے نکل پڑتے۔ ناصر عباس نیر اور ان کے دوستوں سے ملنے کے بعد میں نے اپنی پلیٹ میں اپنی پسند کی چیزیں لیں اور انتظار صاحب کی میز پر آ کر بیٹھ گیا اور اُن کی اور مسعود اشعر کی گفتگو سے مستفید ہونے لگا۔ اس گفتگو میں فاروقی کے ناول 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' کا ذکر نکل آیا اور بات اس پر ہونے لگی کہ تاریخ کو افسانے میں کیسے ڈھالا جاتا ہے اور نتیجہ یہ نکالا گیا کہ تاریخ افسانے میں اس طرح آئے کہ وہ نری تاریخ نہ معلوم ہو۔ یعنی افسانہ خود پر تاریخ کو حاوی کرنے کے بجائے خود اس پر حاوی رہے اور تاریخ کو لے کر تخلیق کے بطن سے باہر آئے۔ اس اچھی اور عمدہ گفتگو کے بعد انتظار صاحب نے میری طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا: ''بھائی انیس اشفاق ناول پڑھ کر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''جی وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ بھائی یہ کون سی مخلوق تھی جو کھانا نہیں کھاتی تھی۔ اتنے ضخیم ناول میں کھانے کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔''

انتظار صاحب کے یہ کہنے کے بعد مسعود اشعر زبان کے رموز پر گفتگو کرنے لگے۔ قاضی افضال چونکہ فلسفۂ لسان میں آج کل پوری طرح ڈوبے ہوئے ہیں اس لیے انہیں اس

گفتگو میں مزہ آنے لگا اور وہ بات کو فلسفیانہ طریقے سے آگے بڑھانے لگے۔ مسعود اشعر زیادہ دور تک نہیں گئے۔ وہ تو بس زبان کے اُس عملِ تقلیب کے بارے میں بات کر رہے تھے جس میں کوئی لفظ کہیں کچھ معنی دینے لگتا ہے کہیں کچھ اور۔ یعنی لفظوں کی ساخت کیونکر بدلتی ہے اور ساخت بدل جانے سے معنی کس طرح منقلب ہوتے ہیں۔ انتظار صاحب بڑی سادہ لوحی سے اس گفتگو کو یوں سن رہے تھے جیسے کوئی طالب علم استادوں کے سبق سنتا ہے۔ بیچ بیچ میں اپنا شک رفع کرنے کی خاطر وہ بغیر کسی تامّل کے کسی لفظ کی اصل اور اس کے مشتقات کے بارے میں بھی دریافت کر لیتے۔ یہ بڑے لوگوں کی عظمتوں کی نشانیاں ہیں ورنہ آج کل کے جہل پوش ادیب جو نہیں جانتے اسے بھی اپنے اعتمادِ جہل کی بنا پر ایسے بیان کرتے ہیں جیسے وہی صحیح اور اصل ہے۔ انتظار صاحب کی اس سادہ لوحی پر میرا ذہن گیان چند جین اور پروفیسر احتشام حسین کی طرف چلا گیا۔ گیان چند جین لسانیات کے آدمی تھے، بڑے تحقیقی کارنامے انجام دیے، مثنوی پر لکھا، غالب کا متروکہ کلام مرتب کیا۔ لیکن اس بات پر کوئی مشکل ہی سے یقین کرے گا کہ ایک دن لکھنؤ کی ایک محفل میں جہاں میں ان کے پہلو میں بیٹھا تھا، مجھ سے پوچھنے لگے ''یہ حسنِ مطلع کیا ہوتا ہے؟'' میں نے کہا: ''مطلعے کے بعد والا شعر۔'' اچھل کر بولے: ''ارے میں تو سمجھتا تھا غزل کا سب سے اچھا شعر۔'' اسی طرح استادِ محترم پروفیسر شبیہ الحسن اپنے استاد پروفیسر احتشام حسین کے بارے میں بتاتے تھے کہ ایک دن انہوں نے پوچھا: ''اماں شبیہ الحسن یہ نعمتِ غیر مترقبہ کے معنی کیا ہوتے ہیں۔'' استاد نے بتایا: ''وہ نعمت جس کے حصول کی امید یا گمان نہ ہو۔'' وہ بولے: ''میں سمجھتا تھا ایسی نعمت جس کا کوئی رقبہ نہ ہو۔ یعنی بے پناہ نعمت۔'' پھر استاد نے جو بنیادی طور پر عربی کے آدمی تھے انہیں ترقب کے معنی بھی بتائے اور اس کے مشتقات بھی۔ علم جویوں اور باکمالوں کے اوصاف میں ایک صفتِ احسن یہ بھی ہے کہ جو نہیں معلوم ہے اسے معلوم کرو اور مت دیکھو کہ جو بتا رہا ہے وہ بڑا ہے یا چھوٹا۔ لیکن یہی انتظار صاحب ایسے ایسے متروک لفظوں کے معنی بتا دیتے ہیں جو بڑے بڑے زباں دانوں کو بھی نہیں معلوم۔ دہلی میں ایوانِ غالب کے سیمنار میں حالی پر اپنا مضمون پڑھتے ہوئے ایک صاحب نے حالی کے استعمال کیے ہوئے لفظ 'چینک' کے معنی میں شک ظاہر کرتے ہوئے قیاساً اس کے کچھ اور

معنی بتائے۔ انتظار صاحب اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے شاہد احمد دہلوی کی ایک تحریر کے حوالے کے ساتھ اس لفظ کے صحیح معنی بتائے۔[1]

•

آرٹس کاؤنسل کی گاڑیاں آ چکی تھیں۔ ہم نے کمرے پر آ کر کپڑے تبدیل کیے اور نیچے اتر آئے۔ کچھ لوگ جا چکے تھے، کچھ لوگ رہ گئے تھے۔ ہم ایک گاڑی میں بیٹھے اور کچھ ہی دیر میں آرٹس کاؤنسل پہنچ کر 'گل رنگ' میں داخل ہو گئے۔ یہاں بہت سے لوگ آ چکے تھے، بہت سے لوگ آ رہے تھے۔ آج سے کانفرنس کے باقاعدہ اجلاسوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ یہ اجلاس مختلف موضوعات سے مخصوص تھے۔ پہلے اجلاس کا موضوع تھا۔ ''اردو کا جدید ناول اور افسانہ۔'' اس اجلاس سے متعلق قریب قریب سبھی لوگ 'گل رنگ' میں آ چکے تھے۔ انتظار حسین، عبداللہ حسین، اسد محمد خاں، مسعود اشعر، مستنصر حسین تارڑ اور شکیل عادل زادہ۔ یہ سب صاحبانِ صدارت تھے اور یہ خاکسار بھی۔ 'گل رنگ' کی میزیں بھری ہوئی تھیں۔ فراست بھی اپنی بیگم کے ساتھ آ چکے تھے۔ چائے پر اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اجلاس کا وقت قریب آ پہنچا اور آرٹس کاؤنسل کے رضا کاروں نے ہم سے آڈیٹوریم کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ میں آڈیٹوریم کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ ایک نوعمر لڑکا تیزی سے میری طرف آیا اور اپنی ڈائری کھول کر میری طرف بڑھا دی۔ مطلب یہ تھا کہ اس پر دستخط فرما دیں۔ میں نے پوچھا ''آپ کا نام؟''

بولا: ''اُمیش لدھانی۔'' میں نے کہا: ''ہندی میں اپنا نام لکھیے۔''

''ہندی مجھے نہیں آتی۔''

میں نے اس کی ڈائری پر اس کے لیے ایک محبت بھرا فقرہ لکھ کر اپنے دستخط کیے پھر ہندی میں اس کا نام لکھا پھر کہا: ''آپ مجھے یہاں کے مندر دکھا سکتے ہیں؟''

''ضرور ضرور۔'' اس نے دو۔ تین مندروں کے نام لیے اور اپنا فون نمبر بھی دیا لیکن اتنا موقع نہیں مل سکا کہ میں ان مندروں کو دیکھ پاتا۔ اُمیش سے باتیں کرتا ہوا میں آڈیٹوریم

---

[1] شاہد احمد دہلوی نے اس لفظ کو اپنی کتاب ''گنجینۂ گوہر'' میں استاد بندو خاں کی ریاضت کا حال لکھتے وقت استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ہیں: دُھن۔ شوق۔

میں داخل ہوگیا۔ آج کے اس پہلے اجلاس کی نظامت اختر سعیدی کر رہے تھے جو پاکستان کے نمائندہ اردو اخبار ''جنگ'' سے منسلک ہیں۔ شلوار قمیص میں ملبوس اختر سعیدی مائک پر آئے اور مجلسِ صدارت کے اراکین کو اسٹیج پر مدعو کرنا شروع کیا۔ جب سارے صدور پہنچ گئے تو انہوں نے اجلاس کے موضوع کی مختصر سی تمہید باندھ کر پہلی مقالہ نگار سے مقالہ خوانی کی گزارش کی۔ یہ ایک نوعمر خاتون تھیں عنبریں حسیب عنبر۔ نام میں ایک صوتی آہنگ تھا۔ جامہ زیب، خوش وضع، اور: ع سروشرمائے قد اس طرح کا قامت ایسی

کئی رنگوں کی گھیردار پوشاک پہنے پشت پر بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ اُس خاتون نے تلے انداز میں چلتے ہوئے مائک کے سامنے آ کر سامعین کو بتایا: ''میرے مقالے کا موضوع ہے: 'اردو افسانہ اکیسویں صدی میں'۔'' اور پھر سامنے رکھا ہوا کاغذ دیکھے بغیر سامعین سے مخاطب ہونا شروع کر دیا:

''ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ادب کو زمانی تناظر میں کس طرح دیکھیں۔ اس میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اس عہد میں ہمارے لیے ایک بڑا چیلنج یہ ہے کہ ہم موضوع کا انتخاب کیونکر کریں۔''

عنبریں حسیب عنبر نے کہا: ''بے شک یہ عہد الکٹرانک میڈیا کا ہے۔ انٹرنیٹ نے اطلاعات کے دائرے کو وسیع کر دیا ہے لیکن کتاب کی اہمیت پھر بھی ختم نہیں ہوگی، یہ الگ بات ہے کہ اس کی شکل بدل جائے۔'' میں نے سوچا یہ موصوفہ فضا سازی کے لیے زبانی تمہید باندھ رہی ہیں، مقالہ اس وقت شروع کریں گی جب سننے والوں کو اپنے موضوع کے حدود اور خطوط بتا چکیں گی۔ مگر وہ نوعمر خاتون کاغذ کو دیکھے بغیر ربط اور تسلسل کے ساتھ بولتی رہیں۔ نہ لکنت، نہ سکتہ، نہ تکیۂ کلام نہ تکرار۔ میں نے دل ہی دل میں کہا: ''یا تو لکھا ہوا سب یاد کر لیا ہے یا یہ کوئی مقرر ہیں جو کالج اور یونیورسٹی کے جلسوں میں تقریر کرتے کرتے رواں ہو چکی ہیں۔'' لیکن تقریر کا متن بھی یونہی سا نہیں تھا۔ باتیں موضوع سے متعلق تھیں اور بامعنی بھی۔ عنبریں حسیب عنبر پیشہ ور مقرر ہوں یا نہ ہوں لیکن ایک صفت اُن میں اِن مقرروں والی ضرور تھی اور وہ تھی حدودِ وقت سے آگے نکل جانا۔ پھر بھی متعلق بہ موضوع متن کو تلفظ کی غلطیوں کے بغیر مربوط جملوں کے ساتھ ان خاتون

نے سامعین کے سامنے جس طرح پیش کیا وہ ان کی وقت خوری کے باوجود لائقِ تحسین تھا۔

جب یہ خاتون بول رہی تھیں تو صدر الصدور انتظار حسین بہت بے چین نظر آ رہے تھے اور پہلو بدل بدل کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان صاحبہ نے اپنی بات ختم کی تو انتظار صاحب نے مائک سنبھالا اور بولے: ''مقالہ نگاروں سے میری درخواست ہے کہ وہ اختصار سے کام لیں۔'' یہ کہہ کر بولے: ''آخر ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ بہت سے لفظوں میں کہی جانے والی بات کم لفظوں میں زیادہ اچھی طرح کہی جاسکتی ہے۔ طولِ کلام سے کوئی فائدہ نہیں۔''

عنبریں حسیب عنبر کے بعد اخلاق احمد نے ''جدید افسانہ اور سماج۔ اجنبی یا آشنا'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور وقت کا لحاظ رکھا۔ انہوں نے اشتراکی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے کہا کہ ''ادب اور سماج لازم وملزوم ہیں اور اُن کا رشتہ ہمیشہ خوش گوار رہا ہے۔'' یہ بتا کر انہوں نے بتایا:

''اس عہد میں افسانہ لکھنے کے لیے ہمیں اپنے خوف پر قابو پانا ہوگا۔''

اجلاس کے تیسرے مقالہ نگار امجد طفیل نے ''اردو ناول کا مختصر جائزہ'' پیش کرتے ہوئے بتایا کہ: ''اردو ناول کے زرّیں عہد میں سب سے اہم اور نمایاں نام قرۃ العین حیدر کا ہے۔'' ترقی پسند تحریک کو نشانہ بناتے ہوئے انہوں نے الزام لگایا کہ اس تحریک نے اردو ناول کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ انہوں نے یہ حیرت آور انکشاف بھی کیا کہ ''میں مشتاق یوسفی کی کتاب ''آبِ گم'' کو بطور ناول پڑھتا ہوں۔''

کراچی سے شائع ہونے والے ضخیم اردو رسالے ''مکالمہ'' کے ایڈیٹر مبین مرزا نے مقالہ پڑھنے کے بجائے ''معاصر افسانے کے تخلیقی نقوش'' کو اجاگر کرنے میں اپنی طلاقتِ لسانی کا لائقِ تحسین مظاہرہ کیا۔ وہ افسانوں کا ذکر کر رہے تھے، کرداروں کے نام لے رہے تھے، وقوعوں کی مختصر تفصیل بیان کر رہے تھے۔ یہ سب ان کے حافظے میں جما ہوا تھا اور پگھل پگھل کر بہت مرتب اور منظم شکل میں باہر آ رہا تھا۔ میں اُن کے حافظے پر رشک کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی تقریر میں وہ بیانیہ کے رموز، کرداروں کی آویزش، زبان کے فنکارانہ استعمال پر ایسے بول رہے تھے جیسے یہ سب ان کے سامنے لکھا ہوا موجود ہو۔ مبین مرزا کی بندھی ہوئی تقریر نے

سامعین کو باندھ لیا تھا۔ ان کی پوری تقریر کا لبِ مطلب یہ تھا کہ ''چونکہ موجودہ معاشرے میں زبان کے بدلتے ہوئے رویّوں نے سنگین مسئلہ پیدا کر دیا ہے اس لیے لکھنے والے کو اپنی الگ راہ نکالنا ہوگی۔''

مبین مرزا کا خطاب ختم ہوا تو نجم الحسن رضوی آئے اور انہوں نے ''عہدِ حاضر کے افسانے کے اہم خدوخال'' کو نمایاں کرنا شروع کیا لیکن ان خدوخال کی وضاحت میں ان کا ملک زیادہ نمایاں ہو رہا تھا اور یہ اس لیے تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان رسالوں اور کتابوں کی آمدورفت انسانوں کی آمدورفت سے بھی کم ہے۔

نجم الحسن رضوی کے بعد باری آئی اس خاکسار کی۔ گزشتہ پینتیس برسوں سے سیمناروں میں شرکت کرتے کرتے میں نے اتنا جان لیا ہے کہ اگر آپ نے مقالہ نگاروں کے ہجوم میں وقت کا لحاظ نہیں رکھا تو ناظم اور صدر کے ساتھ ساتھ سامعین کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہونے لگتا ہے اور مقررہ وقت کے بعد جو کچھ آپ پڑھتے ہیں اسے موجود سامعین سماعت برائے سماعت کے خانے میں ڈال کر یا تو اونگھنے لگتے ہیں یا اہلو پہلو والوں سے ان کے حال احوال پوچھنے لگتے ہیں۔ سو میں نے اپنے طویل مضمون کو مقررہ وقت کے مطابق مختصر کر لیا تھا۔ اور یہ اس لیے بھی تھا کہ میں نے سن رکھا تھا کہ احمد شاہ وقت کی پابندی کے معاملے میں بہت بے رحم ہیں اور پڑھنے والے کو ٹوک دینے بلکہ روک دینے میں کسی مروّت کے قائل نہیں۔ میں نے مقالہ پڑھنے سے قبل دنیائے افسانہ کے دیوزاد انتظار حسین کو بصد احترام مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میری خوش بختی ہے کہ میں کراچی کی سرزمین پر اردو فکشن کی قدآور شخصیت عبداللہ حسین اور آپ کی موجودگی میں یہ مضمون پڑھ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنی اس غزل کے ابتدائی دو شعروں سے اپنا تعارف کرایا جو میں نے پی۔ آئی۔ اے کی اڑان کے چھ گھنٹے کی تاخیر والے وقفے میں ایرپورٹ پر ٹہل ٹہل کر مکمل کی تھی۔ وہ شعر ہیں:

صفِ ستم سے نہ فوجِ عدو سے آئے ہیں
تمہارے شہر میں ہم لکھنؤ سے آئے ہیں

تمہاری یاد کے آہو جہاں رمیدہ ہیں
ہم اِس گلی میں اُسی دشت ہو سے آئے ہیں

اِن شعروں سے اپنا تعارف کرانے کے بعد میں نے ''ہندوستان میں نیا اردو ناول''

کے موضوع پر اپنا مختصر کیا ہوا پرچہ پڑھا اور صفِ سامعین میں آکر بیٹھ گیا۔ اپنے پرچے میں جن ناول نگاروں کے تعلق سے میں نے گفتگو کی تھی، سامعین میں سے بیشتر ان سے مانوس نہیں تھے۔ کم وقت میں اشاراتی حوالوں کے ذریعے اِن ناول نگاروں اور اِن کی تحریروں سے ان سامعین کو متعارف نہیں کرایا جا سکتا تھا اس لیے پرچے میں تشنگی رہی اور اسی لیے سامعین پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ میں جب اپنا مقالہ پڑھ رہا تھا، شعیب سامعین کے بیچ میں بیٹھے میری تصویریں کھینچ رہے تھے، فراست کہیں اور بیٹھے تھے اور بھابھی کہیں اور۔ میں نے گردن گھما کر پچھلی صفوں میں انہیں ڈھونڈنا شروع کیا لیکن ان تک میری نگاہ نہیں پہنچی۔

اردو کی خواتین قلم کاروں نے بہت اہم اور تلخ موضوعات پر لکھ کر زندگی کی سنگین حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ان لکھنے والیوں نے افسانے کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے بہت حساس اور نازک موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور اس طرح بہت سے مرداد یبوں کا قد کم کر دیا ہے۔ انہیں میں ہندو پاک کی معروف افسانہ نگار زاہدہ حنا بھی ہیں۔ بہت پہلے وہ ایک بین الاقوامی سیمنار کے سلسلے میں لکھنؤ آ چکی تھیں اور اسی لکھنؤ آنے میں وہ دوسرے پاکستانی مہمانوں کے ساتھ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بھی آئی تھیں۔ اس وقت میں لکچرر تھا۔ ہم نے ان مہمانوں کے اعزاز میں ایک تقریب بڑی محنت اور محبت کے ساتھ منعقد کی تھی۔ شعبے کے طلبہ کو ان مہمانوں کو دیکھنے، انہیں سننے اور ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ یہ جب آئے تو جائے تقریب میں تلِ دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ یہ کوئی پچیس تیس برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت زاہدہ حنا اپنی شہرت اور اپنی عمر کے عروج پر تھیں اور اِس وقت بھی نہ اُن کی شہرت میں کمی آئی ہے اور نہ اُن پر عمر کے ڈھل جانے کا اثر ہوا ہے۔ اُس وقت انہوں نے اپنے افسانے کے موضوع اور اسے پڑھنے کے انداز سے بہت متاثر کیا تھا۔ جلسہ ختم ہوتے ہی طلبہ نے انہیں اپنے حلقے میں لے لیا تھا اور اخبار والوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ وہ کبھی کسی طالب علم کی ڈائری پر دستخط کرتیں کبھی کسی نامہ نگار کے سوال کا جواب دیتیں۔ دوسرے دن لکھنؤ کے اخباروں میں اس تقریب کی خبریں بڑے اہتمام سے شائع ہوئیں۔ آج آرٹس کاؤنسل کے اس بھرے ہوئے آڈیٹوریم میں اسی خاتون افسانہ نگار کے مقالے پر صبح کے اس اجلاس کو ختم ہونا تھا۔

اپنے نام کا اعلان ہونے کے بعد خوبصورت بوٹے اور بارڈر والا ہلکے سفید رنگ کا شلوار سوٹ پہنے زاہدہ حنا پر وقار انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی شانِ بے نیازی کے ساتھ مائک پر آئیں، اپنا پرچہ سامنے رکھا، آنکھوں پر عینک کے زاویے کو درست کیا، سر کی ہلکی سی جنبش سے گیسوؤں کی اصلاح کی اور اپنی پرکشش قرأت کے ذریعے ''معاصر افسانے میں عورت کی آواز'' کو اٹھانا شروع کیا۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس افسانے میں خود اُن کی آواز بھی بہت اونچی ہے۔ مرد وزن کے یکساں حقوق کی علم بردار زاہدہ حنا پدری نظام والے اس مرد اساس معاشرے میں عورت کی خود مختاری (Female Autonomy) کے حق میں بہت پہلے سے آواز اٹھاتی رہی ہیں اور خود کو مرکز میں لا کر اس خود مختاری کی مثال بھی پیش کرتی رہی ہیں۔ مرد غالب معاشرے سے آزادی خواہی کی مہم میں پاکستانی عورت بلا شبہ بہت آگے ہے۔ زاہدہ حنا، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن اور عذرا عباس وغیرہ عورت کی حریت کے روشن استعارے ہیں۔ اِن عورتوں نے اپنی فکر اور اپنے طرزِ عمل سے اس بات کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ عورت پدری نظام کے جبر کے سامنے مجہولِ محض ہے۔ اپنے ملک میں عورتوں کو مرد کی بالا دستی سے نجات دلانے میں ان عورتوں کے عزائم دیکھ کر مجھے سیاہ فام تانیثی مصنفہ آدرے لارڈے کے یہ الفاظ یاد آنے لگتے ہیں:

> ''ہم میں سے وہ جو اس معاشرے کی بنائی ہوئی تعریف کے اُس دائرے سے باہر ہیں جو قابلِ قبول عورتوں کے لیے بنائی گئی ہے، ہم میں سے وہ جو تفریق کی سخت آزمائشوں کی بھٹی میں جھونک دی گئی ہیں، ہم میں سے وہ جو نادار ہیں سیاہ فام ہیں، سن رسیدہ ہیں... جانتی ہیں کہ زندہ رہنا کوئی عالمانہ ہنر نہیں ہے۔ یہ ایک سبق ہے یہ سیکھنے کا کہ تنہا رہ کر، بیہودہ اور بری بھلی (باتیں) سہہ کر کس طرح معاشرے میں زندہ رہا جاتا ہے اور ایک ایسی دنیا کو جس میں ہم (بہ آسانی) پھل پھول سکیں، تشکیل دینے اور اس کی جستجو کرنے میں کس طرح ایک مشترک مقصد کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔''

آدرے لارڈے۔ مضمون: 'معمار اپنے اوزاروں سے خود اپنا گھر کبھی مسمار نہیں کرتا'۔

میں بھی کہاں سے کہاں نکل گیا۔ لیکن بہک کر کہیں اور نکل جانے میں دخل میرا نہیں زاہدہ حنا کا ہے کہ وہ معاصر افسانے میں عورت کی آواز جس طرح ہمیں سنا رہی تھیں اس کی بازگشت ہمیں کہیں اور سنائی دینے لگی۔ زاہدہ حنا نے ٹھہر ٹھہر کر صاف اور رواں لہجے میں بہ کمالِ قرأت اپنا مضمون پڑھا اور اس کے مشتملات کی معنویت کو سامعین تک منتقل کر دیا۔

اجلاس کے سارے پرچے پڑھے جا چکے تھے۔ وقت زیادہ ہو چکا تھا اس لیے انتظار صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں افسانے اور ناول سے متعلق چند باتیں کہہ کر اور مقالہ پڑھنے والوں کو وقت کا خیال رکھنے کی ہدایت دے کر اس کامیاب اجلاس کو ختم کیا۔

•

اجلاس ختم ہوتے ہی میں نے زاہدہ حنا کو اچھا پرچہ پڑھنے کی مبارکباد دی اور جب مبین مرزا سے آنکھیں چار ہوئیں تو کہا: ''تحریر تو پڑھتا رہا ہوں آپ کی لیکن تقریر آج سنی اور جانا کہ ایک منجھا ہوا خطیب بھی موجود ہے آپ کے اندر، ماشاءاللہ۔'' فراست، بھابھی اور شعیب اپنی جگہوں سے اٹھ کر میرے پاس آ گئے تھے۔ لنچ کا وقفہ ہو چکا تھا۔ میں ہال سے باہر نکلا تو کچھ مقامی ادیبوں نے جنہیں میں نہیں جانتا تھا، مجھے اپنی کتابیں عنایت کیں میں ان کتابوں کو لیے ایک کونے میں کھڑا تھا کہ میرے قریب سے کل کے افتتاحی اجلاس کی نظامت کرنے والی خاتون ہما میر گزریں۔ کچھ دور نکل کر وہ پلٹیں اور میرے قریب آ کر مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

''آپ اہلِ تشیع ہیں؟''

''تشیع نہیں تشیُّع۔'' میں نے ان کا غلط بولا ہوا لفظ صحیح کیا پھر پوچھا:

''آپ کا مسلک کیا ہے؟''

''ہم لوگ حضرت علی کے چاہنے والوں میں ہیں۔'' انہوں نے قدرے تامّل سے کہا۔

''مجھ سے آپ نے یہ کیوں پوچھا؟''

''آپ نے وہ دو شعر جس طرح سے پڑھے، وہ کوئی شیعہ ہی پڑھ سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر بولیں: ''میرا مطلب ہے جو مرثیہ بھی پڑھتا ہو۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ لکھنؤ کا ہوں۔ وہاں سب شعر خوانی کے فن سے واقف ہیں۔''

یہ سن کر وہ آگے بڑھ گئیں۔ کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد میں ایک رضا کار کے پاس اپنا کتابوں سے بھرا بیگ رکھ کر واش روم چلا گیا۔ وہاں سے نکلتے ہی مجھے ساری میں ملبوس ایک عورت نظر آئی جس کے ہاتھ میں دھاگا بندھا تھا اور ماتھے پر بندیا تھی۔ یہ عورت یہاں صفائی ستھرائی والے کاموں میں لگی تھی۔ میں نے اسے نمستے کیا تو وہ شرمائی اور جواباً اس نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں کہا: ''نمستے۔''

''کیا نام ہے آپ کا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''لکشمی۔''

''دیوالی کب ہے؟''

''پچیس یا چھبیس (اکتوبر) کو۔''

پوری کانفرنس کے دوران جب بھی میں لکشمی کے سامنے سے گزرتا اسے نمستے ضرور کرتا اور وہ بھی مسکرا کر اس نمستے کا جواب دیتی۔

آڈیٹوریم کے باہر والے اسی حصے میں زیبا علوی نے اپنی پیاری سی بیٹی مریم سے ملوایا۔

●

عصرانے کے لیے ہم 'گل رنگ' پہنچ چکے تھے۔ میزوں پر مہمانوں کا ہجوم تھا۔ کوئی پہلے اجلاس کی روداد بتا رہا تھا، کوئی دوسرے اجلاس کے موضوعات پر خیال آرائی کر رہا تھا اور کسی کی گفتگو عام موضوعات پر ہو رہی تھی۔ کھانا ہوتا رہا، باتیں چلتی رہیں، قہقہے لگتے رہے۔ اسی بیچ دوسرے اجلاس کا وقت آ گیا۔ اس اجلاس کا موضوع تھا: ''اردو زبان کو درپیش مسائل اور اس کا مستقبل۔'' رضا کاروں نے ہم سے ہال میں چلنے کے لیے کہا۔ ہم وہاں پہنچے تو اجلاس کے ناظم مہمانوں کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ انتظار حسین، رضا علی عابدی اور قاضی افضال حسین اپنی کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے۔ ان سب کے بیٹھ جانے کے بعد مائک پر آئے لاہور کے جواں سال ادیب اور نقاد ناصر عباس نیر۔ انہوں نے گلوبلائزیشن کی اصطلاح استعمال کر کے بہت مدلل طریقے سے اپنی بات کہی اور عالمی سطح پر اردو کو پیش آنے والے مستقبل

کے خطرات سے آگاہ کیا۔ ناصر عباس نیر نے دہلی کے ایک سیمینار میں بھی، جہاں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی، بڑی پر مغز باتیں کہی تھیں۔ وہ اس موضوع سے متعلق اہم اور پر اثر باتیں کہہ کر بیٹھے تو مدعو کیا گیا ڈاکٹر نجیبہ عارف کو۔ یہ وہی خاتون تھیں جنہیں میں نے روزِ گزشتہ ہوٹل میں ایک شخص (بعد میں معلوم ہوا وہ ان کے شوہر ہیں) کے ساتھ ناشتہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ نجیبہ عارف انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد میں اردو کی استاد ہیں۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: ''اردو زبان کے عصری مسائل اور جامعات کا کردار۔'' اپنے مقالے میں انہوں نے اردو زبان سے متعلق بہت سے جائز اندیشوں کا اظہار کیا اور اس بات پر گہری تشویش ظاہر کی کہ اردو کی تبلیغ و ترویج میں جامعات کا کردار اطمینان بخش نہیں ہے اور حکومت بھی اردو کے مسائل سے لاتعلق ہے۔ انہوں نے بڑی بے خوفی سے کہا کہ ''اردو کو ہم اپنی تہذیبی اساس اور ثقافتی شناخت تو قرار دیتے ہیں لیکن اس کے لیے فکرمند بالکل نہیں ہیں۔ یہ جو ہماری زبان میں لہجے بدل رہے ہیں اور یہ جو لفظوں کی شکست و ریخت کا عمل رونما ہو رہا ہے اس طرف کون توجہ دے رہا ہے۔ زبان کے لسانی ضابطوں کو بنانا اور اُنہیں عمل میں لانا تو ماہرین لسانیات کا کام ہے لیکن اس راہ میں کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے۔'' نجیبہ عارف نے بڑی بیباکی اور صاف گوئی سے بہت اہم اور کارآمد باتیں کہیں۔

فاطمہ حسن اردو شاعری کی ایک اہم نسائی آواز ہیں اور زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے معاملے میں بہت فعال۔ فی الوقت وہ انجمن ترقی اردو، پاکستان کی معتمد اعزازی ہیں۔ انہوں نے ''اردو کی ترویج میں غیر سرکاری اداروں کے کردار'' پر گفتگو کرتے ہوئے صاف صاف کہا:

> ''انجمن ترقی اردو، پاکستان کو دو برس سے کوئی سرکاری امداد نہیں مل رہی ہے، نتیجتاً ایک تعطّل کی سی فضا ہے۔ ہم مختلف موضوعات پر اب تک ساڑھے چھ سو کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ اگر سرکار کی طرف سے ہماری اعانت نہیں کی گئی تو ہم اشاعتِ کتب کا یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکیں گے۔ یہ ادارے زبان کی بقا اور تحفظ کے لیے قائم کیے گئے

ہیں اور اگر انہیں مالی وسائل فراہم نہ ہوئے تو زبان کا وجود خطرے
میں پڑ سکتا ہے اور اگر زبان معرضِ خطر میں آئی تو ثقافت کا بھی قائم
رہنا مشکل ہے۔''

بجاطور پر شکوہ کناں فاطمہ حسن کے بعد صفِ صدارت سے قاضی افضال اٹھ کر سامعین سے ہمکلام ہونے آئے اور بولے: ''ہم نے اپنے طور پر یہ سوچ لیا ہے کہ ہم عالم کاری کو اپنی گرفت میں رکھ سکتے ہیں مگر ہم نہیں جانتے کہ ہم خود اس کا شکار ہوگئے ہیں۔'' فاطمہ حسن نے جو حق بجانب شکوے کیے تھے انہیں نگاہ میں رکھتے ہوئے قاضی صاحب گویا ہوئے: ''حکومتیں جو سہولتیں فراہم کرتی ہیں اور اس راہ میں جو قدم اٹھاتی ہیں ان کا مقصد اپنے مفادات کا حصول ہے۔ انہیں زبان کے فروغ کی فکر نہیں رہتی۔'' بالفاظِ دیگر قاضی صاحب یہ دعوت دے رہے تھے کہ ہمیں سب کچھ اپنے زورِ بازو سے حاصل کرنا چاہیے۔

لہجے کا زیر و بم، جملوں کی خاص طرح کی ساخت، صاف اور روشن آواز .... ان سب کو دیکھنا ہو تو رضا علی عابدی کی طرف دیکھیے۔ ایک زمانے میں پوری دنیا میں سنی جانے والی یہ آواز میرے کانوں میں ایک خاص طرح کے آہنگ کے ساتھ برس بیت جانے کے باوجود محفوظ ہے۔ اُس وقت ٹیلی ویژن نہیں تھا، چوبیس گھنٹے خبریں نہیں آتی تھیں۔ اس وقت رات ہوتے ہی ایک آواز سننے کے لیے ہم اپنے مرفی ریڈیو کے سامنے گھر کے اور لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ یہ آواز منظروں کو ہماری آنکھوں میں روشن کرتی ہوئی ہمیں پوری دنیا کی سیر کراتی۔ اس آواز کو سن کر یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ریڈیو ہی کے لیے بنی ہے۔'' یہ بی۔بی۔سی ریڈیو کی اردو سروس ہے۔ اب آپ رضا علی عابدی سے اردو میں خبریں سنیے۔'' یہی رضا علی عابدی اپنے مخصوص لہجے میں کہہ رہے تھے:

''اردو عجیب زبان ہے۔ سب کی ہے اور کسی کی نہیں۔ جب تک ہر گھر
میں تین تین، پانچ پانچ بچے پیدا ہوتے رہیں گے، اردو باقی رہے گی۔''

اُن کا مطلب تھا کہ نسل کی افزائش کے ساتھ ساتھ زبان کی افزائش بھی ہوتی رہے گی۔ اس لیے ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے خالص شاعرانہ انداز میں کہا:

''خزاں رسیدہ پتوں سے جب بھی کونپلیں پھوٹتی ہیں مجھے لندن میں اردو یاد آتی ہے۔''

رضا علی عابدی کی گل افشانیِ گفتار کے بعد ناظم نے اجلاس کے آخری خطیب اور دامنِ اردو کو دولتِ افسانہ سے بھر دینے والے ادیب انتظار حسین سے خطاب کی گزارش کی۔ اردو کی موجودہ صورتحال سے نامطمئن اس عہد ساز افسانہ نگار نے جب بولنا شروع کیا تو سب کو یہ منظر نظر آیا:

ع رخ سے عیاں جلال و جوانمردی و نمود

انتظار صاحب نے سخت لہجے میں خود اردو والوں کو اردو کُشی کا مجرم قرار دیتے ہوئے کہا:

''اردو کے سب سے بڑے خطا کار خود اس کے اپنے لوگ ہیں۔
جب بنگالی زبان کا مسئلہ پیدا ہوا تو انہوں نے اپنی زبان میں لچک
پیدا کرنا گوارا نہیں کیا۔ ہم نے اردو کو قومی زبان کا درجہ تو دیا لیکن
اُسے فروغ دینے کے بجائے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔''

بہت سخت باتیں کہنے کے بعد انتظار حسین نے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا:

''بابائے اردو مولوی عبدالحق جب پاکستان چلے آئے تو بھارت
والے پریشان ہوئے کہ اب ہماری اردو کا کیا ہوگا۔ تو یار لوگوں نے
کہا فکر کی کوئی بات نہیں وہاں لتا منگیشکر موجود ہے۔''

انتظار صاحب کی یہ بات سن کر میں زیرِ لب خود سے گویا ہوا: ''لیکن انتظار صاحب آپ کو خبر نہیں کہ وہ اردو جو اُس وقت لتا منگیشکر کی آواز میں ڈھل کر رس گھولتی تھی، اب اُس نے اپنی شکل بدل لی ہے اور اب نئی آوازوں میں آ کر وہ سماعتوں پر پتھر برسانے لگی ہے۔'' کبھی سخت، کبھی نرم ہوتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے: ''اردو کے سلسلے میں اگرچہ گلوبلائزیشن واقعی ایک مسئلہ ہے لیکن اردو کو فروغ پانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

میں انتظار صاحب کی زبانی اُن کے ملک میں اُن کی زبان کی زبوں حالی کا ذکر سن رہا تھا اور میرے ذہن میں ان کے سفرنامے ''زمیں اور فلک اور'' کے وہ الفاظ گونج رہے تھے

جوانہوں نے دونوں ملکوں میں اردو کی صورتحال کے تعلق سے رقم کیے تھے۔لکھا تھا:

''مگر میرے پاس خبر دینے اور بیان کرنے کے لیے کیا ہے....چند سوال تو ایسے ہیں جو ہندستان کا سفر کرنے والے سے بہرحال پوچھے جاتے ہیں....مثلاً یہ کہ ہندوستان میں اردو کی کیا حالت ہے؟ ہندستانی مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟...اگر میں ان سوالوں کے جواب فراہم کرنے سے قاصر ہوں تو یار یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ پھر تم ہندستان کیا کرنے گئے تھے........ مجھے یاد آیا کہ ہندستان میں بھی ایک اردو کے پرستار نے مجھ سے پوچھا تھا کہ پاکستان میں اردو کا کیا احوال ہے۔ میں نے یہ سوال اُن دوستوں تک پہنچادیا بس اس پر وہ چپ ہو گئے۔''

زمیں اور فلک اور :ص ۵۷۔۱۷۴

انتظار صاحب کو نہیں معلوم کہ ہندستان میں اردو اور مسلمان دونوں کی حالت ایک سی ہے — ابتر اور افسوسناک۔ اور اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ ہم اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے میدان میں تو آتے ہیں لیکن حکومت کی آنکھیں دیکھ کر ہتھیار رکھ دیتے ہیں۔ عہدہ خواہی اور جاہ طلبی کی ہوس نے ہماری زبان بند کردی ہے۔ کسی زمانے میں چند نادار اردو پرستوں نے ''اردو یا موت'' کا نعرہ بلند کیا تھا۔ وہ میدان میں آکر چیختے رہے:

ع وقتِ امداد ہے یاصاحبِ اردو مدد ے

لیکن سفید پوش اردو خواں اپنی صفوں سے باہر نہیں نکلے۔ ان اردو پرستوں نے لاٹھیاں کھائیں، خون اُگلا اور اکیلے میدان میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اُن بے غرض نہتے مجاہدوں کی شکست کے بعد اور بھی لشکر صف آرا ہوئے لیکن عہدوں کے علم لے کر انہوں نے میدان چھوڑ دیے۔ سو انتظار صاحب! دونوں طرف صورت ایک سی ہے۔ شکر کیجیے کہ ہماری طرح آپ کی شناخت خطرے میں نہیں ہے۔ ہم اپنے تہذیبی آثار کو معدوم اور منہدم ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ میدانوں سے ہمارے لشکر کے لشکر اس طرح غائب ہو رہے ہیں کہ ان کے لہو کے نشانات بھی

کہیں نہیں ملتے:

ع پڑتے ہیں تازیانے یہاں دادخواہ پر

اپنے وجود کو باقی رکھنے کی جنگ میں زبان ہمارا ایک بڑا ہتھیار ہے لیکن اسے کند کر دیا گیا ہے اور ہم اس پر صیقل کرنے کا جوکھم نہیں اٹھاتے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ زبان کا یہ مقدمہ ہم کس کی عدالت میں پیش کریں۔ کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں:

کون فریاد سنے بے سروسامانوں کی

یاں تو بستی بھی نہیں کوئی..............

مگر انتظار صاحب جب تک آپ کا افسانہ زندہ ہے، زبان زندہ رہے گی۔ جب تک آپ لفظوں پر صیقل کرتے رہیں گے زبان چمکتی رہے گی۔ آپ نے صحیح کہا کہ ''اردو کو فروغ پانے سے کوئی نہیں روک سکتا'' کہ ہم اپنے قلم سے زندہ لفظ لکھ رہے ہیں۔ اردو زندہ لفظوں کی زبان ہے۔ حکومت کے پھینکے ہوئے لقمے اسے زندہ نہیں رکھ سکتے۔ ان سے تو زبان فروشوں کے شکم سیر ہوتے ہیں۔ ہماری زبان نے رُسوا سے انتظار حسین تک زندہ لفظ لکھے ہیں اور مردہ لفظوں کو زندہ کیا ہے۔ غالب، انیس اور اقبال کا لفظ مر نہیں سکتا۔ ہم زندہ لفظوں کے امین ہیں۔ ہم زندہ تو لفظ زندہ، لفظ زندہ تو زبان زندہ۔

اگر اجلاسوں میں پرچوں اور تقریروں کے بعد سوالوں اور بحثوں کے لیے کچھ وقت مقرر ہوتا تو میں یہ باتیں اسٹیج پر جاکر ضرور کہتا۔ میں کانفرنس کے مہتمم احمد شاہ سے یہ گزارش ضرور کروں گا کہ آئندہ ہونے والی کانفرنس میں پرچوں پر بحثوں کے لیے کچھ وقت ضرور مقرر کریں تا کہ اُن پر سوال جواب کے دوران کچھ اور گوشے اجاگر ہوں۔ یہ وقت مقرر ہوتا تو اس اجلاس میں ہونے والی گفتگو پر بڑی گرما گرم بحث ہوتی۔

●

اردو کی زبوں حالی کے نوحوں، اس کے زندہ اور باقی رہنے کی تشویشوں اور اندیشوں کے اظہار پر یہ اجلاس ختم ہوا۔ ہم نے سہ پہر کی چائے پی اور اس چائے کے دوران اردو کی بدحالی اور بے وقعتی پر گفتگو کی، مقررین کے اندیشوں کو صحیح ٹھہرایا اور تیسرے اجلاس

کے لیے پھر اپنی نشستوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ یہ اجلاس اُن اہم ادیبوں اور شاعروں کی یادوں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا جو اردو کو بہت کچھ دے کر اس دنیا سے اٹھ گئے۔ اسی لیے اس اجلاس کو ''یادِ رفتگاں'' سے منسوب کیا گیا تھا۔ ان بڑے اور مرحوم ادیبوں کی یادیں تازہ کرنے کے لیے اجلاس کے ناظم نے مائک کے سامنے آ کر صاحبانِ مقالہ سے اسٹیج پر آنے کی درخواست کی۔ عطاء الحق قاسمی، جاذب قریشی، آصف فرخی، اظہر عباس ہاشمی اور شاہد رسّام اپنی اپنی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ مقالہ خوانی کے آغاز کے لیے سب سے پہلے اُسی نوجوان کا نام لیا گیا جس نے افتتاحی اجلاس میں یوسُفی پر اپنا پرچہ پڑھ کر سامعین سے خوب داد وصول کی تھی۔ یعنی شاہد رسّام۔ اُس نوجوان مصور نے ایک بار پھر اپنے موئے قلم کا جوہر دکھایا اور ایم۔ ایف۔ حسین کے ہم پلّہ ایک بہت بڑے مصور صادقین کی تصویر کے نقوش یوں اجاگر کیے کہ وہ تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آنے لگی۔ مرزا سلامت علی دبیر کے زبردست شیدائی صادقین بہت پہلے جب ہندستان آئے تو لکھنؤ بھی آئے اور میں سب سے زیادہ ان کے ساتھ رہا۔ ان کے اعزاز میں خوب جلسے ہوئے، نشستیں ہوئیں جن میں انہوں نے اپنی بہت عمدہ رباعیاں سنائیں، داد لوٹی، سادہ کاغذوں پر مرقع سازی کی، بسم اللہ باتصویر لکھی اور میری کتاب ''اردو غزل میں علامت نگاری'' کا بہت جی لگا کر سرورق بنایا۔ دبیر کے مزار پر گئے، اس کی زبوں حالی دیکھ کر آبدیدہ ہوئے، مزار کی درستی کے لیے رقم کی پیش کش کی۔ دینی اداروں میں جا کر دیواروں اور کاغذوں پر قرآنی آیات لکھیں۔ مانگنے والوں کو اپنی بنائی ہوئی تصویریں عطا کیں۔ خوب شراب پی۔ خوب پیسے لٹائے۔ ایک معاون ساتھ میں تھا سب کچھ اسی کے ہاتھ میں تھا۔ میری کتاب کا سرورق بنانے سے پہلے شرط رکھی: ''پہلے مسوّدہ پڑھوں گا۔'' میں نے مسوّدہ لے جا کر دیا۔ لال باغ کے 'ایلورا' ہوٹل میں ایک ہی رات میں مسوّدہ پڑھ ڈالا۔ دوسرے دن ملا تو بولے: دو بڑی کارڈ شیٹس (Card Sheets) اور پنسلیں لے کر آیئے۔ میں دونوں چیزیں لے کر پہنچا تو دونوں پنسلیں اچھی طرح چھیل کر اور ان کی نوکیں مہین بنا کر انہیں ایک ساتھ اپنی دو انگلیوں میں پھنسایا اور پلک جھپکتے میں سرورق بنا کر میرے سامنے رکھ دیا اور رنگ بھی تجویز کر دیا۔ ''سیپیا۔''

یہی عہد ساز مصور جسے میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا، جسے میں نے لکھنؤ کی ساری تاریخی عمارتیں دکھائی تھیں۔ جسے لے کر میں درگاہوں اور کربلاؤں میں گیا تھا، اس وقت رسام کی گفتگو کا موضوع تھا اور وہ صحیح کہہ رہا تھا کہ صادقین پر ہمیشہ تخلیق کا جنون سوار رہتا تھا۔ رسام صادقین سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کر رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا کہ رسام نہیں بلکہ رسام کو سننے والا ان سے مل رہا ہے۔ کانفرنس کے پہلے دن اس نے رات کے پہلے پہر میں یوسفی کی بولتی ہوئی تصویریں یوں بنائی تھی کہ اس سے روشنی پھوٹنے لگی تھی اور دوسرے دن.... دن کے تیسرے پہر وہ صادقین کی شبیہہ یوں کھینچ رہا تھا گویا آفتاب اپنے کئی رنگوں میں ہمارے سامنے ہو۔ میں اس کے لفظ سن رہا تھا اور مجھے اس کا بولا ہوا ہر لفظ اس لیے سچ معلوم ہو رہا تھا کہ میں نے صادقین میں سب کچھ وہی دیکھا تھا جو وہ بیان کر رہا تھا۔ اور یوں وہ صادقین کے تشیے کا جز بن گیا تھا۔ صادقین سازی میں اپنا کمال دکھا کر یہ نوجوان سامعین سے داد لوٹتا ہوا اپنی کرسی پر آ کر بڑی بے نیازی سے بیٹھ گیا۔

اس کے بیٹھ جانے کے بعد میرے کان میں آواز آئی: ''اکبر بگتی جن دنوں اردو سے ناراض تھے......'' میں رسامیت کے اثر میں ڈوبا ہوا تھا لیکن یہ فقرہ سن کر چونکا اور خود سے گویا ہوا: ''ابھی ابھی تو اردو گئی ہے یہ پھر کہاں سے آ نکلی۔'' میں نے سر اٹھایا تو مائک پر اظہر عباس ہاشمی ایک مشاعرے کے حوالے سے بتا رہے تھے: ''اکبر بگتی جن دنوں اردو سے ناراض تھے، ہم نے انہیں ایک مشاعرے میں آنے کی دعوت دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انہوں نے اردو سے قطعِ تعلق کر رکھا تھا۔ وہ مشاعرے میں آئے، دیر رات تک شعر سنے اور جب اٹھ کر جانے لگے تو کہا کہ اس طرح کا مشاعرہ آپ کوئٹہ میں بھی کریں، انتظام ہم کریں گے۔'' اظہر عباس بتا رہے تھے کہ بگتی صاحب نے یہ کہنے کے بعد صفائی دی کہ ''میں اردو مخالف نہیں ہوں، میں نے تو ضیاء الحق کی وجہ سے یہ طے کیا تھا کہ جب تک وہ ہیں میں اردو نہیں بولوں گا۔'' یہ بتانے کے بعد انہوں نے سرشار صدیقی کی اردو پرستی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ زبان کے معاملے میں بڑے حساس تھے۔ کوئی غلط اردو بولتا تو اسے فوراً ٹوک دیتے۔'' یہ بات مجھے اس لیے صحیح معلوم ہوئی کہ ادبی پرچوں میں چھپنے والی ان کی جو نظمیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں زبان کی نوک پلک کا

خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ان کی ایک نظم جو شاید 'مکالمہ' میں چھپی تھی اس کی پیشانی والا مصرعہ مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا: ع میں فرشتہ ہوں نہ تم حور نہ دنیا جنت

سرشار صدیقی کی اردو سے محبت کا ذکر سننے کے بعد ہم نے آصف فرخی کا نام سنا جو اُس شاعر کی یادیں تازہ کرنے جا رہے تھے جس کی شاعری کے نیّر مسعود قائل تو بہت تھے لیکن یہ بھی کہا کرتے کہ اتنا اچھا شاعر ہونے کے باوجود اکثر اس کے مصرعے دولخت ہو جاتے ہیں۔ میں اس شاعر کا سادہ سی طباعت والا مختصر سا مجموعہ نیّر مسعود ہی سے لے کر آیا تھا اور میں نے اس کی شاعری میں ایک الگ طرح کا رنگ پایا تھا۔ آصف فرخی اسی شاعر یعنی محبوب خزاں کی شخصیت اور شاعری کے رنگ دکھانے آئے تھے اور جیسے جیسے آصف یہ رنگ دکھاتے گئے لوگ آبدیدہ ہوتے گئے۔ انہوں نے محبوب خزاں کا یہ مصرعہ: ع ''کم کہو اپنا کہو اچھا کہو'' پڑھ کر بتایا: ''محبوب خزاں عمر بھر اسی مصرعے کے اسیر رہے۔ انہوں نے کم کہا، اپنا کہا اچھا کہا۔ لیکن اچھا کہنے کے باوجود انہیں شاعری میں وہ مقام نہیں ملا جس کے حقیقتاً وہ مستحق تھے۔ ان کا نام پڑھنے والوں کے حافظے میں تو محفوظ ہے لیکن کسی نقاد نے ان پر قلم نہیں اٹھایا۔ وہ آپ اپنے نقاد تھے۔ ان کے سرمایۂ شعر میں ایک ہی کتاب تھی، اسی کتاب کو وہ زندگی بھر بدلتے رہے۔ اُن کی یہ کتاب اگرچہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے لیکن ان کی زندہ رہنے والی شاعری کبھی ختم نہیں ہوتی۔'' اس شاعر کے آخری دنوں کی تصویر آصف نے کچھ ایسے اثر انگیز لہجے میں اتاری کہ:

ع ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی

جذبات سے بھری ہوئی آواز میں آصف کہہ رہے تھے: ''آخری دنوں میں اپنا نام تک بھولنے لگے تھے، اپنے آپ کو بھی بھول گئے تھے لیکن پوری طرح نہ بھلا سکے۔ اپنا نام لکھا ہوا دیکھتے تو اپنے آپ کو یاد آنے لگتے۔''

آصف گفتگو بھی اچھی طرح کرتے ہیں اور مقالہ پڑھنے کے فن سے بھی خوب واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سامعین کو اپنے پرچے کی گرفت میں لے لیا اور محبوب خزاں کی شخصیت میں بہت سے پھول کھلا کر ان کے درختِ شاعری کو گل آثار کر دیا۔

یادِ رفتگاں کے اس سلسلے میں شفیع عقیل بھی شامل تھے۔ ان پر احفاظ الرحمٰن کو مضمون

پڑھنا تھا وہ نہیں آسکے سو اُن کا لکھا ہوا مضمون علی احمد خاں پڑھ کر چلے گئے۔

۷۰ء کے دہے میں سلیم احمد نے دنیائے ادب میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ ان کا جو مضمون یا کتاب چھپتی، گفتگو کا موضوع بنتی۔ وہ ہندستانی رسالوں میں خوب چھپ رہے تھے اور ہم انہیں خوب پڑھ رہے تھے۔ ''نئی نظم اور پورا آدمی''، ''نئی شاعری نامقبول شاعری'' کا نام ہر اُس شخص کی زبان پر تھا جسے ادب کے نئے مباحث سے دلچسپی تھی۔ ہم محمد حسن عسکری کی دھوم مچا دینے والی کتابیں ''انسان اور آدمی'' اور ''ستارہ یا بادبان'' پڑھے ہوئے تھے، اس لیے ان کے معنوی شاگرد کی تحریروں کے بھی شیدائی تھے اگر چہ اس گروہ کی حد سے بڑھی ہوئی فراق پرستی اور ایک مخصوص زاویۂ نگاہ سے ادب کو دیکھنے والی نظر کے ہم پوری طرح قائل نہ تھے لیکن اُن کے علم، اُن کی ذکاوت اور اُن کی وسعتِ نظر سے بہت متاثر تھے۔ فراست نے جب ہمیں بتایا کہ انہوں نے راتوں میں سلیم احمد کے ساتھ بہت انجمن آرائی کی ہے اور دنوں کا بہت وقت ان کے ساتھ گزارا ہے تو میں نے ان کی خوش بختی پر خوب رشک کیا۔

اردو کے اسی قدآور ادیب پر سر سے پا تک سفید پوش جاذب قریشی نے پوری سلیم الطبعی کے ساتھ اپنا مقالہ پڑھنا شروع کیا۔ صاف اور شفاف کرتے پاجامے میں ان کا گندمی رنگ چمک رہا تھا۔ ان کی مضمون خوانی سب سے الگ تھی۔ وہ ایک ایک جملے کو ایک خاص طرح کی دھمک کے ساتھ ادا کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہہ رہے ہوں:

ع   سر کو نہ سر نہ جان کو ہم جاں سمجھتے ہیں

قد ان کا بہت اونچا نہیں تھا لیکن جس اونچے قد کے آدمی پر وہ گفتگو کر رہے تھے اس کی اونچائی کو صحیح طرح سے ناپ رہے تھے۔ سلیم احمد کی شخصیت، اُن کی تنقید، اُن کی شاعری..... ان سب پر جاذب قریشی بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی باتیں کہہ رہے تھے اور ہم جنہوں نے سلیم احمد کو نہیں دیکھا تھا ان کی گفتگو سے خوب محظوظ ہو رہے تھے۔ جاذب قریشی کا ہنر یہ تھا کہ انہوں نے کم وقت میں پورے سلیم احمد کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کیا گویا وہ پورے سلیم احمد کو اپنے اندر جذب کر کے آئے ہوں۔

لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ پاٹ دار آواز میں اپنا مضمون پڑھتے ہوئے جاذب

ہمیں بتا رہے تھے کہ ''دیدہ ور نقاد سلیم احمد ادھورے آدمی کی بکھری ہوئی خواہشوں سے انسان کو بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی دیدہ ورانہ تحریروں کے ذریعے معاشرے کے بدنما چہرے کو بے نقاب کیا۔'' شاہد رسام اور آصف فرخی کی طرح انہیں بھی اپنے مضمون پر خوب داد ملی۔

شاہد رسام اور آصف فرخی نے فضا میں افسردگی پیدا کر دی تھی۔ جاذب قریشی نے اس پر دانشورانہ رنگ چڑھا دیا تھا۔ ایسے میں بہت نفیس سوٹ پہنے اور اس پر ایک اچھی سی ٹائی لگائے اپنی بھاری بھرکم شخصیت کے ساتھ سامعین سے روبرو ہوئے — عطاء الحق قاسمی۔ جاذب قریشی اور جنابِ قاسمی میں فرق یہ تھا کہ جاذب قوت لگا کر اپنی آواز میں زور پیدا کر رہے تھے اور عطاء الحق کی آواز طاقت صرف کیے بغیر پورے ہال میں گونج رہی تھی۔ وہ پاکستان کے ہمہ جہت ادیب احمد ندیم قاسمی کے بعض ایسے واقعات کی حرف بندی کر رہے تھے جنہیں سن کر محفل قہقہہ زار ہوئی جا رہی تھی۔ عطاء الحق قاسمی کا حافظہ بہت قوی ہے۔ شعر بہت یاد ہیں اور 'ہر طرح' کے یاد ہیں۔ ان 'ہر طرح' کے شعروں کو میں نے اُن سے اُس وقت سنا تھا جب میں ٹورنٹو میں ان کے ساتھ نیا گرا فال دیکھنے گیا تھا۔ انعام الحق جاوید اور ہلال نقوی بھی ساتھ تھے۔ ہلال رثائی ادب کے آدمی ہیں۔ شعر سنتے رہے اور اپنی ثقہ طبیعت کے باعث ہونٹوں کو خفیف سی جنبش دیتے رہے۔ ان 'الگ طرح' کے شعروں کے ساتھ الگ طرح کے لطیفے بھی عطاء الحق کی زنبیلِ ذہن میں بہت ہیں۔ چنانچہ ایوانِ غالب، دہلی میں ترقی پسند تحریک پر ہونے والے سیمینار میں جب وہ مقالہ پڑھنے آئے تو اس کا آغاز تحریک پر اس طنزیہ لطیفے سے کیا:

ایک دادا جان اپنے گھر میں بیٹھے ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ان کے پوتے نے دادا کو بہت غور سے کتاب پڑھتے دیکھ کر پوچھا:

''دادا جان یہ کون سی کتاب ہے؟''

''بیٹا تاریخ کی۔''

پوتے نے کتاب کو غور سے دیکھا۔ بولا: ''دادا جان یہ کتاب تو سیکس پر ہے۔''

دادا جان نے برجستہ کہا: ''بیٹا میرے لیے سیکس بھی تاریخ بن چکی ہے۔''

اگلی صف میں بہت سے غالی ترقی پسند بیٹھے تھے لیکن لطیفہ ایسا تھا کہ وہ بھی قہقہہ

لگائے بغیر نہ رہ سکے۔ اس وقت بھی عطاء الحق قاسمی بڑے قاسمی کی شخصیت کو لطیفوں سے روشن کر رہے تھے۔ کبھی پیر احمد شاہ والی کہانی سنا رہے تھے کبھی سجاد باقر رضوی کا قصہ اور کبھی کوئی اور واقعہ۔ لیکن ان سب قصوں اور واقعوں میں احمد ندیم قاسمی کی شخصیت مرکز میں تھی اور ان سب سے اس شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں ہو رہے تھے۔ عطاء الحق قاسمی لطیفہ سنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ اُن کی خوبی یہ ہے کہ اِن تبسم پوش لطیفوں کو سناتے وقت خود نہیں مسکراتے۔ کاغذ تو کہنے کو ان کے ہاتھ میں تھا، وہ اسے دیکھے بغیر سب کچھ کہہ رہے تھے اور سننے والے قہقہوں کے سیل میں بہہ رہے تھے۔

کانفرنس کا یہ دوسرا دن اس اعتبار سے بہت اہم رہا کہ آج کے تینوں اجلاس بہت کامیاب رہے۔ اردو کے نئے افسانوی ادب پر نئے زاویوں سے گفتگو کی گئی، اردو کو درپیش مسائل اور اس کے مستقبل کے بارے میں صاف اور دوٹوک لہجے میں اندیشہائے دور و دراز کا ذکر کیا گیا اور بڑے اہتمام سے گم شدگاں کے علم اٹھائے گئے۔

ہم اِن اجلاسوں کے مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر بہت سے لوگ تھے۔ مہمان بھی مندوبین بھی اور رضا کار بھی۔ ہم اُن سب سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اندر سے کسی نے آ کر بتایا کہ آج کا آخری یعنی چوتھا اجلاس شروع ہونے والا ہے۔ لیکن میں اندر نہیں گیا۔ مجھے اپنے ٹکٹ کی تاریخ بڑھوانے کی فکر تھی۔ فراست آج اسی کام پر لگے ہوئے تھے۔ بالآخران کا فون آیا کہ ''تاریخ بڑھ گئی ہے۔'' میں نے کہا: ''بڑھوانے میں جو پیسہ لگا ہو مجھ سے لے لیجیے مگر دریا دل فراست بھلا اس طرح کی بات کہاں سننے والے۔ میری بات کاٹ کر دوسری بات کرنے لگے۔

چوتھا اجلاس ''اردو کی نئی بستیوں میں ترجموں کی روایت'' سے متعلق تھا۔ الگ الگ ملکوں میں بسے ہوئے لوگ الگ الگ طرح سے اپنے اپنے علاقوں میں اردو کی صورتحال پر اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ ارشد فاروق جو ہوٹل میں عبید کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اور عبید جن کے چھت اڑا دینے والے خراٹوں سے بہت نالاں تھے، اس وقت پردے پر تصویریں دکھا کر سامعین کو فنِ لینڈ میں اردو کی صورتحال سے آگاہ کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ اس خطے

میں کس طرح خانہ بدوشوں کے ذریعے اردو پہنچی۔

ترکی کے خلیل طوقار اپنے مخصوص لہجے میں اپنی فکرمندی کا اظہار کر رہے تھے، کہہ رہے تھے: ''انگریزی کے اثر میں آئے ہوئے پاکستانی لوگ اردو نہ بول کر اردو کا بڑا نقصان کر رہے ہیں۔ اردو کو باقی رکھنے کے لیے ہمیں اپنے گھروں میں خود اردو بولنا پڑے گی۔'' انہوں نے بتایا: ''ترکی میں اردو اتنی ہی مقبول ہے جتنی دوسرے اسلامی ملکوں میں۔''

مصر کے ابراہیم محمد ابراہیم نے انکشاف کیا کہ ''مصر کی دانشگاہوں میں اردو پڑھانے والے بیشتر اساتذہ کراچی اور لاہور کے ہیں۔ مصر میں اردو کی صورتحال اطمینان بخش ہے۔ اصل مسئلہ کتابوں کا فراہم نہ ہو پانا ہے۔''

سعید نقوی بتا رہے تھے ''امریکہ میں اردو زبان و ادب کے نام پر جو کچھ ہے وہ پاکستان سے درآمد کیا ہوا ہے۔'' انہوں نے لاس اینجلیس کو اردو کی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔

اشفاق حسین ٹورنٹو (کناڈا) میں اردو کی مرکزی شخصیت ہیں۔ وہ اس ملک سے پوری دنیا میں اردو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پہلے پاکستان گئے، وہاں سے کناڈا۔ دو ہجرتوں نے انہیں بہت کچھ دکھایا ہے۔ ترقی پسندی کے ویران ہوتے ہوئے میدان میں سلیم احمد کے اس مصرعے 'شاید کوئی بندۂ خدا آئے' پر ایمان لا کر اب بھی ثابت قدمی سے جمے ہوئے ہیں۔ فیض پر بڑی اہم کتابیں مرتب کی ہیں اور اب ''میں گیا وقت نہیں ہوں'' کے نام سے اچھی اور خوشگوار شاعری سے بھرا ہوا ایک خوبصورت کلّیات بھی سامنے لے آئے ہیں جو کُل کا کُل نہیں ہے۔ یہ اشفاق حسین کناڈا میں اردو زبان و ادب کے فروغ پر مکالمہ کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ اردو کی نئی بستیوں میں ٹورنٹو کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ وہاں لکھنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے اور اب تک اردو کی تین سو سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میں ان کے شہر جا چکا ہوں اور وہاں کی ادبی تقریبوں میں اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کا جوش دیکھا ہے۔ اشفاق حسین جب کسی تقریب کا اہتمام کرتے ہیں تو آس پاس (امریکہ) کے لوگ (ولی شاہین، شاہد ہاشمی، سلطانہ مہر، جمال قادری، نسیم فروغ، ثریا خاں اور باقر زیدی وغیرہ) بھی اس کی رونق بڑھانے آ جاتے ہیں۔ اطہر رضوی (مرحوم) نے غالب اکاڈمی کے

ماتحت بہت عمدہ سیمیناروں اور مشاعروں کا انعقاد کیا ہے۔ ادھر کچھ زمانے سے تقی عابدی رثائی ادب کے میدان میں اس ولولے کے ساتھ وارد ہوئے ہیں کہ پچھلوں کو پچھاڑ کر محققِ بے بدل کا سہرا اپنے سر بندھوا کر رہیں گے۔

●

پانچویں اجلاس کو صفیہ اختر اور جاوید اختر سے مخصوص کیا گیا تھا اور اس اجلاس میں جاوید اختر کے مجموعے 'لاوا' کا اجرا بھی ہونا تھا لیکن جاوید اختر کے نہ آپانے کی وجہ سے یہ اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔

●

سارے اجلاسوں کے ختم ہونے کے بعد سب سے مل ملا کر میں بھابھی (نسیم نازش) کے ساتھ شعیب کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں شعیب اور ان کی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر ہم نے بہت دیر تک بہت سی باتیں کیں۔ ان باتوں میں چونکہ دو عورتیں موجود تھیں لہٰذا ہماری گفتگو زیادہ تر عورتوں کے پسندیدہ موضوعات پر ہوتی رہی۔ بہت دیر بیٹھنے اور طرح طرح کی باتیں کرنے کے بعد نسیم نازش نعمان گارڈن اپنے گھر کی طرف چلی گئیں اور میں شعیب کے ساتھ اپنے ہوٹل آ گیا۔ ہوٹل میں داخل ہو کر میں نے دیکھا کہ اس کے لاؤنج میں پاکستانی ادیب اپنی محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ میری آنکھیں ناصر عباس نیر سے چار ہوئیں۔ انہوں نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اور میں نے اس اشارے کے جواب میں اشارتاً کہا ''کمرے پر ہو کر آتا ہوں۔'' کمرے پر آ کر میں نے کپڑے بدلے، ترو تازہ ہوا اور نیچے لاؤنج میں آ گیا۔ یہاں ناصر عباس نیرؔ کے ساتھ افضال احمد سیّد، انور سن رائے، عذرا عباس، تنویر انجم، احمد فواد، ضیاء الحسن اور نجیب جمال کی بزم سجی ہوئی تھی۔ سب کے بیٹھنے کے لیے جگہ کم پڑی تو ایک اور میز کو پہلی والی میز سے ملا لیا گیا۔ انور سن رائے نے محفل کی میزبانی کی اور ہم سب کے لیے چائے منگوائی۔ چند رسمی باتوں کے بعد لاہور کے شاعر احمد فواد سے شعر سننے کی فرمائش کی گئی۔ گورے رنگ اور سفید بالوں والے احمد فواد وضع قطع سے واقعی شاعر لگ رہے تھے۔ انہوں نے جیب سے اپنی ڈائری نکالی اور ایک کے بعد ایک کئی نظمیں سناتے چلے گئے۔ بہت سی نظموں کی ان

سے فرمائش کی گئی مگران کے اندر زود خوانی کی وہی خصلت موجود تھی جس سے بہت کم شاعر خود کو بچا پاتے ہیں۔ سو جتنا ان سے کہا گیا اس سے کہیں زیادہ انہوں نے سنایا۔ ان کی انگلیاں ڈائری کی ورق گردانی کرتی جارہی تھیں اور یہ ورق گردانی اسی طرح ہوتی رہتی اگر ناصر عباس نیر کلام خوانی کی دعوت دوسروں کو نہ دیتے۔ میں نے احمد فواد کو پڑھا نہیں تھا اور اگر پڑھا ہو تو وہ حافظے میں محفوظ نہیں تھے لیکن جو کچھ اس وقت ان کی زبان سے سن رہا تھا وہ ایک الگ طرح کی شاعری تھی۔ ایک ایک کر کے سب نے اپنی چیزیں سنائیں۔ نثری نظم والے اکثریت میں تھے سو عذرا عباس اور تنویر انجم نے بہت سی نثری نظمیں سنائیں اور افضال احمد سید نے اپنی اصل روش سے ہٹ کر غزلیں سنائیں۔ ان غزلوں میں بہت نئی اور خوش آہنگ ترکیبیں استعمال کی گئی تھیں۔ افضال احمد سید فارسی کی اچھی استعداد رکھتے ہیں اور شاعرانہ ترکیبوں کو خوش آہنگ بنانا جانتے ہیں۔ غزل سنانے والوں میں ایک اور شاعر ضیاء الحسن بھی تھے۔ یہ محفل دیر تک جمی اور ابھی اور جمتی اگر ہوٹل والے ہمیں وقت زیادہ ہو جانے کا احساس نہ کرا دیتے۔ ہم اٹھے اور اُنہیں جو اس شہر میں اپنی قیام گاہوں سے یہاں آئے تھے، رخصت کیا۔ میں کمرے پر آیا تو قاضی صاحب موجود نہیں تھے۔ وہ کراچی میں اپنے ایک ہفتے کے قیام میں وقت نکال نکال کر اپنے عزیزوں سے مل رہے تھے۔

صبح سے شام تک اجلاسوں میں بیٹھے رہنے، آرٹس کاؤنسل سے شعیب کے گھر جانے، وہاں سے ہوٹل لوٹ کر آنے اور دیر تک چلنے والی نشست میں شعر سننے اور سنانے کی وجہ سے میرا پورا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ سو میں فوراً ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ قاضی صاحب رات میں کس وقت آئے، مجھے خبر نہیں۔ میں نے نیند میں دروازہ کھولا اور پھر لیٹ گیا۔

●

کنارِ بحر کے اِس شہر میں ہم پانچویں دن کا سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ مناظرِ قدرت سے ہمیشہ میری بڑی دل چسپی رہی ہے۔ صبح بہت صبح شاخوں سے اڑتے ہوئے پرندوں کی آواز جب میرے کانوں میں آتی ہے اور جب روشن ہوتے ہوئے آسمان کے پردے سے آفتاب نکلتا ہوا نظر آتا ہے تو چائے کے جرعہ ہائے گرم کا لطف دوبالا ہو جاتا

ہے۔ جوشؔ نے صحیح کہا تھا:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

دوسرے مصرعے کو ہم بہ تحریف یوں پڑھا کرتے ہیں:

ع اگر رسول نہ ہوتے تو چائے کافی تھی

ماریشس یونیورسٹی سے وابستگی کے دنوں میں جب مجھے سمندر سے قریب کے ہوٹل میں ٹھہرایا جاتا تو میں آخرِ شب سمندر کے سینے میں شور کرتی ہوئی موجوں کا تماشا ضرور کرتا۔ رات کے آخری پہر میں اٹھتی ہوئی موجیں پوری طرح تو نظر نہ آتیں لیکن اُن کی طغیانی سے پیدا ہونے والا شور میرے وجود میں بھی ایک ہلچل پیدا کر دیتا اور صبحِ کاذب گزر جانے کے بعد جب میں نور کے تڑکے میں ٹھہرے ہوئے سمندر کو دیکھتا تو اپنے اندر کی دنیا منور رہوتی ہوئی معلوم ہونے لگتی۔ یہاں اس ہوٹل میں ہم سمندر کے قریب تو تھے لیکن کنارِ آب کے منظر ہماری آنکھوں سے محو تھے۔ ہمارے کمرے میں ایک ہی کھڑکی تھی، جب ہم اسے کھولتے تو ہوٹل کا صحن نظر آتا اور وہ دو چار درخت جو دیوارِ صحن سے ملا کر لگا دیے گئے تھے۔ ہمارے اٹھتے اٹھتے یہ درخت پرندوں سے محروم ہو جاتے اور اُن پر دھوپ کے ٹکڑے رقص کرتے ہوئے نظر آنے لگتے۔ اس وقت بھی جب ہم نے بیدار ہو کر کھڑکی کے یہ پردے کھینچے تو وہی دھوپ کے ٹکڑے درختوں کی شاخوں پر ناچتے نظر آئے۔ میں نے چائے منگوائی۔ قاضی صاحب جاگ چکے تھے۔ روز کی طرح چائے پر باتیں ہوئیں۔ ٹی۔ وی کھول کر خبریں سنیں اور نیچے ڈائننگ ہال میں ناشتے کے لیے آ گئے۔ یہاں وہی صورتیں نظر آئیں جن سے ہم مانوس ہو چکے تھے۔ مسعود اشعر، انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ، عبداللہ حسین، ناصر عباس نیر ..... سب سے علیک سلیک کرتے ہم پھر انتظار صاحب کی میز پر جا بیٹھے۔ وہاں جا بیٹھنے کی وجہیں کئی تھیں۔ انتظار صاحب کی گفتگو اور اس گفتگو کا خاص انداز۔ تیکھی باتیں، ظریفانہ لہجہ، لاہور کی گلیاں اور کوچے، کافی ہاؤس کے قصے، جلسے اور نشستیں، ادیبوں اور شاعروں کی چشمکیں ــــ یہ سب ضمناً انتظار صاحب کی زبان پر آتے اور ہم اُن دنیاؤں کو دیکھ لیتے جو ہم

نے نہیں دیکھی تھیں۔ ناصر کاظمی ... جن کا ذکر سُن سُن کر ہم بڑے ہوئے، جن کی شاعری پڑھ پڑھ کر ہم نے الگ ہٹ کر شعر کہنا سیکھا وہ ناصر انتظار حسین کے حافظے میں ہر وقت حاضر رہتے۔ اس شاعر کے ساتھ انہوں نے رات کے اندھیروں میں لاہور کی ویران ہو جانے والی سڑکوں کو آباد کیا تھا، اسی شاعر کے ساتھ انہوں نے اس شہر میں روشن ہوتی ہوئی صبحیں دیکھی تھیں، کوئلوں کی کوک اور چڑیوں کی چہکار سنی تھی۔ اس شاعر کا ذکر جب اِن منظروں کے ساتھ اُن کی زبان پر آتا تو ناصر کی شاعری ایک خاص آہنگ کے ساتھ ہمارے ذہن میں گونجنے لگتی۔ یادوں کے یہ نایاب ذخیرے اُنہیں کے پاس ہیں۔ اِنہیں ذخیروں میں دمکتی ہوئی کچھ صورتیں دیکھ لینے کی حرص میں ہم ان کے پاس بیٹھتے۔ سو اس وقت بھی وہ ہمیں کچھ ایسی ہی صورتوں کے عکس دکھا رہے تھے اور عکاسی کے اس عمل میں مسعود اشعر بھی حصہ لے رہے تھے۔

میں انتظار صاحب کی میز پر سے اٹھا تو مجھے ڈاکٹر نجیبہ عارف اپنے شوہر کے ساتھ ڈائننگ ہال میں داخل ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے انہیں روک کر ان سے کہا: ''آپ کی باتیں اگرچہ بہت سخت تھیں لیکن مجھے دوسروں کی باتوں سے زیادہ اچھی لگیں۔'' پھر کہا: ''اردو کی بقا اور فروغ کے لیے آپ کی فکرمندی بجا لیکن آپ اس کی طرف سے زیادہ مایوس نہ ہوں کہ اس زبان میں ہر عہد کی بے اعتنائی کو انگیز کر لینے کی صلاحیت ہے۔'' یہ سن کر وہ مسکرائیں اور اپنے بیگ سے بہت ضخیم اور بہت خوبصورت چھپا ہوا رسالہ ''بنیاد'' نکال کر مجھ سے کہا: ''یہ آپ کے لیے ہے، کچھ اس کے لیے بھی لکھیے۔'' نجیبہ عارف اس رسالے کی مہمان مدیر ہیں۔ میں نے شکریے کے ساتھ وہ رسالہ ان سے لیا اور کہا: ''انشاء اللہ اس 'بنیاد' میں ایک اینٹ رکھنے کی کوشش میں بھی کروں گا۔''

آرٹس کاؤنسل کی گاڑیوں کے آنے کا وقت ہونے والا تھا۔ ہم سب اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں آئے تاکہ گاڑیاں آنے تک رضاکاروں کو تیار ملیں۔ گاڑیاں آ چکی تھیں۔ جو تیار ہو چکے تھے وہ ان میں بیٹھ کر جا چکے تھے۔ انہیں میں قاضی افضال بھی تھے۔ میں نیچے اترا تو پتہ چلا سب کے سب جا چکے ہیں۔ ایک خوش پوشاک خاتون اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ انتظار میں کھڑی ہوئی گاڑی کے ڈرائیور نے بتایا کہ یہ بھی آرٹس کاؤنسل جائیں گی۔ ہم دونوں گاڑی

میں بیٹھے تو انہوں نے اپنا تعارف کرایا:

''میں عشرت آفریں اور آپ؟''

''انیس اشفاق، لکھنؤ سے حاضر ہوا ہوں۔''

نام سن کر وہ چونکیں۔ بولیں: ''آپ کا تو نام بہت سنا ہے امریکہ میں۔ وہاں کچھ شاگرد ہیں آپ کے۔ برابر آپ کا ذکر کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر بتایا: ''ویسے تو میں امریکہ میں رہتی ہوں لیکن آج کل لاہور میں امریکن انسٹی ٹیوٹ میں پڑھا رہی ہوں۔''

''میں جب کناڈا میں تھا تو آپ کا ذکر سنا تھا اور وہاں سے جب امریکہ گیا تو وہاں بھی ذکر رہا آپ کا۔'' یہ کہہ کر میں نے انہیں بتایا: ''لکھنؤ میں امریکن انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے میں اسی خاکسار کا ہاتھ ہے۔''

کناڈا، امریکہ، لاہور اور لکھنؤ کی باتیں کرتے ہوئے ہم آرٹس کاؤنسل پہنچ گئے۔ ''گل رنگ'' میں مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ چائے کی پیالیاں کھنک رہی تھیں۔ کسی میز پر افتخار عارف اور عطاء الحق قاسمی بیٹھے تھے تو کسی پر انتظار حسین اور مسعود اشعر اور کوئی اور۔ کسی گوشے میں مبین مرزا اپنے سامنے ایک کاغذ رکھے ہوئے کسی کو کوئی نکتہ سمجھا رہے تھے۔ زاہدہ حنا احمد شاہ سے محوِ گفتگو تھیں۔ سفید فام احمد فواد چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے ہونٹوں سے نہیں آنکھوں سے کلام کر رہے تھے۔ اشفاق حسین کراچی کے دوستوں سے پرانی باتیں چھیڑے ہوئے تھے۔ ناصر عباس نیرؔ، ضیاء الحسن اور نجیب جمال یہاں بھی ایک ساتھ نظر آ رہے تھے اور دانائے صحافت عبید صدیقی دنیائے صحافت کی ہستیوں کے ساتھ برِصغیر کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ فراست نظر نہیں آ رہے تھے، شاید شبلی پر اپنے مضمون کی تیاری میں لگے تھے جسے اُنہیں کل کے پہلے اجلاس میں پڑھنا ہے۔ بھابھی آج قاضی افضال صاحب کی فرمائش پر ان کی اہلیہ کے لیے اپنے بھائی کی بیگم تحسین کے ساتھ خریداری کے لیے نکل گئی تھیں۔ قاضی صاحب دو ہی تین دن میں بھابھی کے قائل ہو گئے تھے اور انہوں نے اس خریداری کے لیے انہیں یہ کہہ کر کھلی چھوٹ دے دی تھی کہ آپ جو پسند کریں گی وہ میری اہلیہ کو پسند آ جائے گا۔ میزوں پر باتوں، بحثوں، لطیفوں اور قہقہوں کے درمیان احمد شاہ نے 'گل رنگ' میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو

بتایا کہ آج کا پہلا اجلاس شروع ہونے والا ہے۔اور ہم حسبِ معمول ہال میں آموجود ہوئے۔

اس پہلے اجلاس کا موضوع تھا ''اردو کا معاصر شعری تناظر'' اور اس میں آٹھ پرچے پڑھے جانے تھے۔فہرستِ صدور میں رسا چغتائی، کشور ناہید، پروفیسر سحر انصاری، افتخار عارف، امجد اسلام امجد اور جاذب قریشی کے نام شامل تھے۔ جب ہال میں سامعین اور مقالہ نگار آ گئے تو اراکینِ بزمِ صدارت کرسیوں پر رونق افروز ہونے لگے۔اس اجلاس میں نظم، غزل اور نثری نظم پر مقالے پڑھے گئے اور ایک۔دو مقالوں میں شاعری کی نئی جمالیات اور اس کے موضوعات کا محاکمہ کیا گیا۔ضیاء الحسن غزل بالخصوص پاکستانی غزل کے بدلتے ہوئے اسالیب کا دقیق مطالعہ پیش کر رہے تھے تو عبید صدیقی اکیسویں صدی کی غزل کا جائزہ لے رہے تھے لیکن ناصر پسندی کے اثر میں آکر وہ ناصر کاظمی کا ذکر زیادہ کرنے لگے اور یوں ان کی گفتگو میں بہت سے وہ شاعر آنے سے رہ گئے جنہوں نے اکیسویں صدی کی غزل کو نیا رنگ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ناموں کے چھوٹ جانے میں کچھ قصور وقت کی اس شمشیر کا بھی تھا جو مقالہ خوانوں کے سر پر لٹک رہی تھی۔

جاذب قریشی اس وقت بھی اُسی بلند آوازی کے ساتھ اپنا مضمون پڑھ رہے تھے جیسے انہوں نے سلیم احمد کو یاد کرتے وقت ''یادِ رفتگاں'' میں پڑھا تھا اور یہاں بھی سلیم احمد ہی ان کا موضوع تھے۔ وہ ''معاصر نظم کے اسلوبیاتی مطالعے'' کے ضمن میں سلیم احمد کی طویل نظم ''مشرق ہار گیا'' کا بڑی گہرائی سے اسلوبیاتی جائزہ لے رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ یہ نظم اپنے موضوع کی ندرت اور اپنی اسلوبیاتی خصوصیتوں کی بنا پر نظم نامۂ جدید میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ جاذب قریشی دلائل کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور انہیں اپنے موقف کو منوا لینے کا ہنر آتا ہے۔

نجیب جمال نئی شعری جمالیات کے دریچے کھول رہے تھے اور اپنے نام کی مناسبت سے اس جمالیات میں نجابتِ جمال کی جستجو کر رہے تھے۔

اس یادنامے کے گزشتہ اوراق میں کہیں پر میں کہہ چکا ہوں کہ اصلی اور سچی نثری نظم پاکستان میں کہی جا رہی ہے۔اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ادبی رسالوں کے صفحات نثری

نظموں سے پٹے پڑے ہیں لیکن ان میں کتنی نظمیں ہیں جنہیں واقعی نثری نظم کہا جا سکے۔ یہ نثر میں بے آہنگ لفظوں کی سپاٹ بیانی ہے۔ مردہ لفظوں کو عروض سے آزاد قالب میں جمع کر دینے سے معنی کا جامہ نہیں تیار کیا جا سکتا۔ لیکن عذرا عباس اور تنویر انجم کی نظموں میں یہ سپاٹ بیانی اور معنی سے محروم حرف موجود نہیں ہے۔ اکیسویں صدی کی نثری نظم کو مستحکم کرنے میں ان دونوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ دونوں شاعرات اس وقت اپنی ہی صنف پر گفتگو کر رہی تھیں۔ عذرا عباس 'اکیسویں صدی میں نثری نظم کے خدوخال' نمایاں کر رہی تھیں تو تنویر انجم اس نوع کی نظم کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں:

> ''جب نثری نظم کا ورود ہوا تو ہر طرف سے مخالفت کا شور بلند ہوا لیکن رفتہ رفتہ اسے قبولیت حاصل ہوتی گئی۔ انیس ناگی، قمر جمیل، عذرا عباس اور سارا شگفتہ کی نسل نے جو نثری نظمیں لکھی ہیں وہ نہ صرف نثری نظم کے زندہ رہنے کی ضمانت ہیں بلکہ انہیں نظموں کی بنیاد پر نثری نظم اکیسویں صدی کی نمایاں نظم قرار پائے گی۔''

تنویر انجم کا مقالہ ختم ہونے کے بعد میں کسی کام سے باہر نکلا اور بڑی دیر تک باہر رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ صدور کی صف میں سے کون اٹھ کر آیا اور کس نے اپنے صدارتی کلمات میں ان مقالوں کے مشتملات کا احاطہ کیا۔

اس اجلاس کے بعد ہم کھانے کے لیے ''گل رنگ'' میں جمع ہوئے۔ میں اس وقت کراچی کی سرزمین پر دو مصیبتوں میں مبتلا تھا ایک تو سینہ جکڑا ہوا تھا دوسرے دانتوں کے زخم جن کے مندمل ہونے سے پہلے مجھے کراچی آنا پڑا۔ نہ میں ٹھنڈا پانی پی سکتا تھا نہ سخت چیزیں کھا سکتا تھا۔ سو میں چاول کی مختلف شکلوں سے اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔ آج بھابھی میرے لیے گھر سے کھچڑی پکا کر لائی تھیں اور اس وقت میں 'گل رنگ' میں ان کے ساتھ بیٹھا وہی کھا رہا تھا۔ آرٹس کاؤنسل کی چہار دیواری میں اس وقت ہر طرف لوگ نظر آ رہے تھے۔ لوگوں کی اس اُمڈی ہوئی بھیڑ کا سبب معلوم کرنے پر معلوم ہوا کہ اسی احاطے کے ایک حصے میں عیسائیوں کا بڑا جلسہ ہو رہا ہے۔ نوجوان عیسائی لڑکے لڑکیاں اردو میں بلّے لگائے چاروں طرف گھوم رہے تھے

اوران کے جلسے میں تقریریں بھی اردو ہی میں ہو رہی تھیں۔ ہندستان میں یہ عیسائی یا تو انگریزی بولتے ہیں یا اردو آمیز ہندی۔

کھانا ختم ہو چکا تھا اور آڈیٹوریم میں آج کے دوسرے اجلاس میں ''اردو اور پاکستانی زبانوں کے رشتوں ناتوں'' پر گفتگو ہو رہی تھی۔ بولنے والے بہت جوش میں بول رہے تھے۔ کمیل قزلباش جو شاید بلوچستان سے آئے تھے کہہ رہے تھے: ''کچھ عناصر زبان کی بنیاد پر نفرت پھیلا رہے ہیں۔ لسانی عصبیت کا یہ جنون خطرناک ہے۔ اردو والے ایک جگہ پر اردو کی وجہ سے جمع ہوتے ہیں۔ اس زبان کا حال اس ماں کی طرح ہے جو ہر ظلم کو خندہ جبینی کے ساتھ سہہ لیتی ہے۔ ہر قوم کا تشخص اس کی زبان ہے اور زبان کا چھن جانا تشخص کا ختم ہو جانا ہے۔''

خیبر پختون کے نذیر تبسم زور دے کر کہہ رہے تھے کہ ''اردو دوسری تمام زبانوں کے لیے ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ عوامی سطح پر یہ ایک مشترک زبان ہے۔''

مظہر جمیل پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں کو بھی قومی زبان تسلیم کیے جانے کی پرزور وکالت کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ''اردو اور سندھی کے رشتے بہت بنیادی ہیں۔ سندھی کے اہلِ قلم اب ایک سے زیادہ زبانوں میں لکھ رہے ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں۔'' مہتاب اکبر راشدی بتا رہی تھیں کہ ''لسانی اعتبار سے بہت سی چیزیں اردو اور سندھی میں حیرت انگیز طور پر مشترک ہیں۔'' مظہر الحق صدیقی نے مادری زبان کے احترام کو لازم جانا تو امداد حسین نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ''ہماری زبانوں کو ایک خاص طرح کی ذہنیت سے خطرہ ہے۔'' لیکن انہوں نے اس ذہنیت کو صاف صاف ظاہر نہیں کیا۔

پہلے ہی دن سے کانفرنس کی زبردست کامیابی کے نشے میں سرشار احمد شاہ نے اجلاس کے صدر امر جلیل کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے خاص انداز میں کہا: ''آج کے اجلاس میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی شرکت اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شہر ابھی مرا نہیں ہے، یہ تہذیب ابھی مری نہیں ہے۔ یہاں لوگ ابھی زندہ ہیں اور اردو سے اپنی محبت کا ثبوت دے رہے ہیں۔'' اردو اور سندھی کی قربت کا ذکر کرتے ہوئے احمد شاہ نے سامعین کو بتایا کہ ''اردو سے امر جلیل اور دوسرے سندھی ادیبوں کی محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔''

احمد شاہ کے اِن تہنیتی کلمات کے بعد اجلاس کے ناظم ایوب شیخ نے کرسیِ صدارت پر متمکن امر جلیل کو خطاب کی دعوت دی۔ وہ مائک پر آئے اور کہنا شروع کیا:

''اردو زبان کسی جغرافیائی خطّے سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ پوری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ آج ہندستان میں سالانہ ایک ہزار سے زیادہ فلمیں بنتی ہیں، انہیں لاکھ ہندی کہا جائے لیکن ان کی زبان اردو ہے۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور جہاں تک اردو کا تعلق ہے تو یہ زبان قدرت کا کرشمہ ہے۔''

مختلف زبانوں کے مابین یگانگت پر اصرار، لسانی عصبیت سے گریز اور اردو کی طاقت کے اعتراف کے زوردار ذکر کے بعد یہ اجلاس کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

اس اجلاس کے خاتمے کے بعد میں تازہ ہوا کے لیے پھر ہال سے باہر نکل آیا۔ میری طرح اور لوگ بھی کمر سیدھی کرنے کی غرض سے اٹھ کر باہر آ گئے تھے۔ انہیں لوگوں سے میری باتیں ہونے لگیں۔ بہت دیر بعد میں اندر پہنچا تو ''زبان اور ذرائع ابلاغ'' پر گفتگو کرنے والے حضرات اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے اس طرف دیکھا تو وہاں زبان کا علم اٹھانے والے بارہ افراد موجود تھے اور ان کے ساتھ ہنستی مسکراتی فوزیہ خان۔ احمد شاہ، مسعود اشعر، حارث خلیق، نذیر لغاری، فرہاد زیدی، انتظار حسین، رضا علی عابدی، اصغر ندیم سیّد، عبید صدیقی، مجاہد بریلوی اور کوئی اور .... یہ سب حضرات ذرائع ابلاغ کی زوال آمادہ صورتحال پر نوحہ کناں تھے۔ نذیر لغاری اس بات پر حیرت ظاہر کر رہے تھے کہ: ''خبر میں آنے والے حرف کو سمجھنے کا معاملہ پڑھنے، دیکھنے اور سننے والے پر چھوڑ کر ہم نے خود کو اس سے الگ کر لیا ہے۔ انہوں نے میڈیا سے متعلق افراد کی تاریخ ناشناسی کا سخت الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ حضرات اس شہر میں جوش اور غالب کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ (انہیں معلوم ہی نہیں کہ یہ لوگ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔)

صحافت کے مردِ میدان عبید صدیقی کا فرمانا تھا کہ'' ذرائع ابلاغ میں استعمال کی جانے والی زبان عام زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد ہے ترسیل۔ اور ترسیل کے اس عمل میں ہم عام زبان کی سی آزادیاں حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم یہاں اپنے سامعین کے

طبقے اور سطح کو سامنے رکھ کر زبان کا استعمال کرتے ہیں۔'' عبید کا کہنا تھا کہ ''زبان اپنے آپ میں مشکل یا آسان نہیں ہوتی، اس کا آسان یا مشکل ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ ہم کس نوع کے سامع تک اپنی بات پہنچا رہے ہیں۔ مختلف درجوں اور سطحوں کے ساتھ مکالمے کے دوران ہماری زبان ان کی صلاحیتِ فہم کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔''

اصغر ندیم سیّد ادیب بھی ہیں، شاعر بھی اور ڈرامہ نگار بھی۔ انہوں نے پاکستانی ٹیلی ویژن کے لیے بہت مقبول ڈرامے لکھے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ ڈراموں میں استعمال کی جانے والی زبان سے اپنی بے اطمینانی اور ناخوشی کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ''ہمیں جاننا چاہیے کہ کون سی ڈسپلن میں کس طرح کی زبان استعمال کی جائے۔ ڈرامہ ایک تخلیقی اور بصری صنف ہے۔ اس کا سارا دارومدار مکالموں پر ہے اور یہ مکالمے ایسے ہونا چاہیے جیسے بندہ بندے سے بات کرتا ہے۔''

برقی میڈیا میں بہت دنوں تک اپنی آواز کا جادو جگانے والے رضا علی عابدی اس زبان کا قصیدہ پڑھ رہے تھے جو اُن تک ان کی ماں سے منتقل ہوئی تھی۔ اُن کی باتوں کا نچوڑ یہ تھا کہ: ''بولی جانے والی زبان میں بولا جانا چاہیے۔ غالبؔ نے خطوں میں بات چیت کی زبان استعمال کی ہے، اس لیے میں انہیں اپنا امام مانتا ہوں۔''

آغا ناصر خراب ہوتی ہوئی زبان پر برہمی کے ساتھ تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ''اب زبان سکھانے والا کوئی نہیں۔ زیڈ۔ اے۔ بخاری، اشفاق احمد، قمر جمیل اور فرہاد زیدی بولتے بھی اچھا تھے اور لکھتے بھی اچھا تھے۔ یہ سب نو آموزوں کے لیے ایک تربیت گاہ تھے۔''

مسعود اشعر نے ان دو چار دنوں میں ہوٹل میں ہونے والی گفتگو کے دوران بگڑتی ہوئی زبان پر جس طرح اپنی فکرمندی ظاہر کی تھی اور جس طرح زبان کے غلط استعمال پر افسوس کیا تھا، اس سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ شخص زبان کے معاملے میں بہت حساس اور محتاط ہے۔ اس وقت بھی وہ میڈیا کو اپنی سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہہ رہے تھے: ''زبان کو بگاڑنے کے لیے میڈیا کو آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' مجاہد بریلوی ظفر علی خاں کے سلسلے کی صحافت کو یاد کرتے ہوئے اس عہد میں صحافت کے گرتے ہوئے معیار پر بصد رنج و ملال شکوہ کناں تھے۔

انتظار حسین باتوں کو سمیٹنے اور انہیں مخصوص طریقے سے کہنے کے ماہر ہیں۔ انہوں نے سب کی باتوں کو سمیٹتے ہوئے کہا:

''زبان کے تعلق سے فقط ابلاغیات کے محکمے کو نہ بدنام کیا جائے۔ معاشرے کا ہر شعبہ زوال پذیر ہے۔ اخلاقیات اور زبان دونوں تباہ ہو رہے ہیں۔ آج اردو (لطافت کے بجائے) کثافت کا شکار ہے۔ زبان کی طہارت اور اس کی درستی ہمارے معاشرے سے رخصت ہو چکی ہے۔''

اجلاس کی نظامت کے فرائض انجام دینے والی شگفتہ رو فوزیہ خان اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں جس خندہ لبی سے شرکائے گفتگو کو مائک پر آنے کی دعوت دے رہی تھیں اسی خندہ روئی سے انہوں نے اجلاس کے خاتمے کا اعلان کیا۔ وہ پوڈیم سے ملی ہوئی کرسی پر احمد شاہ کے پہلو میں ہلکے آسمانی رنگ کا سوٹ پہنے بیٹھی تھیں اور اپنے سنہرے بالوں کی بہت سی لٹیں داہنے بازو پر آگے کی طرف ڈالے مسکرا مسکرا کر سب طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس اجلاس میں دو آوازوں کا بول بالا تھا۔ ایک قدرت کی طرف سے ودیعت کی ہوئی پختہ اور منجھی ہوئی آواز جو رضا علی عابدی کے اندر سے نکل رہی تھی اور دوسری فوزیہ خان کی جو بہت منجھی ہوئی تو نہیں تھی لیکن جب حلقۂ لب سے باہر آتی تو خوش تاثیری کے ساتھ سماعتوں میں اتر جاتی۔ یہ دونوں ہی آوازیں انیسؔ کے اس مصرعے کا مصداق تھیں: ع کانوں کو حسنِ صوت سے حظ برملا ملے

صبیح و شکیل فوزیہ خان کے زیر نظامت اس اجلاس میں انتظار صاحب کو سامنے بیٹھا دیکھ کر مجھے وہ دن یاد آ گیا جب انتظار صاحب ہمارے شعبے میں 'مسعود حسن رضوی ادیب ہال' کا افتتاح کرنے آئے تھے۔ اس وقت اُنہیں جن لوگوں نے گلدستے پیش کیے تھے وہ سب اتفاق سے لڑکیاں ہی تھیں۔ یہ دیکھ کر ایک طالب علم آزردہ ہو گیا۔ شام کو ہوٹل میں وہ انتظار صاحب کے کمرے میں منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ اُسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر انتظار صاحب نے اس سے پوچھا: ''کیوں میاں ایسے کیوں بیٹھے ہیں؟'' اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا میں نے کہا:

''اِنہیں شکایت ہے کہ سب گلدستے لڑکیوں نے دیے، لڑکا کوئی نہیں تھا۔''

یہ سن کر انتظار صاحب برجستہ بولے: ''میاں پھول تو لڑکیوں ہی کے ہاتھ سے اچھے لگتے ہیں۔''

اور اس وقت بھی ان کے سامنے ایک خاتون ہی تھیں جن کے دہانِ صبیح پر تخنبائے گل رنگ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا: یہ منظر پہلے ہی کی طرح اس وقت بھی انتظار صاحب کو یقیناً اچھا لگ رہا ہوگا۔

●

چوتھا اجلاس شروع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ بہت سے لوگ ہال سے باہر نکل گئے تھے اور کچھ وہیں ایک دوسرے سے محوِ گفتگو تھے۔ مجھ پر ہلکی سی غنودگی طاری تھی اس لیے میں نے کرسی سے پشت لگا کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر بعد کسی نے بہت آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے بیدار کیا:

''میں جمال نقوی۔ ایک گزارش ہے آپ سے۔''

''جی فرمائیں۔''

''اس کے بعد جو اجلاس ہے، 'اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات۔' میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس میں کچھ فرمائیں۔''

''مگر میں تو........'' میں کہتے کہتے رکا۔ مطلب میرا یہ تھا کہ ترقی پسندی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

''کچھ کہہ دیجیے۔ بھارت کی نمائندگی ہو جائے۔''

ان کے محبت بھرے لہجے میں ایسا انکسار آمیز اصرار دیکھ کر میں انکار نہ کر سکا۔ پھر

ع جناب پیرِ خراباتِ لکھنؤ نکلے

ہم وطنی نے جوش مارا اور میں نے ان کی دعوت قبول کرلی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ہندستان کی طرح پاکستان میں بھی ترقی پسندی کی لو مدھم پڑ چکی ہوگی۔ لیکن ایک بڑی کانفرنس میں اس تحریک پر ایک پورے اجلاس کا رکھا جانا بتا رہا تھا کہ کچھ لوگ اس چراغ کو ابھی روشن رکھنا چاہتے ہیں۔ ہندستان کے ترقی پسند ابھی تک نئے علوم کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں اور تازہ افکار

سے بے خبری کی بنا پر اس حقیقت سے بھی لاعلم ہیں کہ عالمی سطح پر مارکسی فلسفے کا قلب کس کس طرح تبدیل ہوا ہے۔ ان کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ترقی پسندی کو تاریخ جان کر اب انہوں نے پالا بدلا تو علمداری کے منصب سے محروم ہونا پڑے گا۔ پاکستان کے ترقی پسند علوم کی تازہ ہواؤں میں سانس لے رہے ہیں یا نہیں اس کی مجھے کوئی خبر نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہاں کے ترقی پسندوں میں انسانی اقدار کو اپنی ہی جاگیر سمجھے رہنے کا مخمصہ ٹوٹا یا نہیں اور وہ اس حقیقت پر ایمان لائے یا نہیں کہ فن پارے کی تحسین و تعبیر میں اصل کارفرمائی آخر ادبی قدر ہی کی ہے۔

اجلاس کا وقت ہو چکا تھا۔ کشور ناہید، زاہدہ حنا، سحر انصاری، صبا اکرام، اشفاق حسین، مسلم شمیم، مظہر جمیل اور جمال نقوی اسٹیج پر آ چکے تھے۔ اجلاس کے ناظم نے موضوع کی تمہید باندھ کر شرکائے گفتگو کو مائک پر بلانا شروع کیا۔ یہ سب ایک کے بعد ایک پر جوش لہجے میں تحریک کے ادبی اور سماجی خدمات کا بڑی تفصیل و توصیف کے ساتھ ذکر کر رہے تھے اور یہ سب اس طرح بول رہے تھے جیسے کسی بوڑھے مرد کو جوانمرد بنانے پر تلے ہوں۔ آخر انہوں نے اپنے زورِ بیان سے تحریک کی جانِ ناتواں میں جان پیدا کر ہی دی اور اس سے پہلے کہ زاہدہ حنا اس میں اور جان ڈالتیں، میں نے ناظم کی طرف دیکھ کر خود کو بلانے کا اشارہ کیا اور زاہدہ حنا سے کہا: ''آپ کے بعد میرا بولنا بے ادبی ہے۔'' مائک پر آ کر میں نے سامعین کو بتایا کہ محبی جمال نقوی نے کس طرح مجھے سوتے سے جگا کر سوئی ہوئی اس تحریک کو جگانے کی دعوت دی۔

میں نے ترقی پسند تحریک کی قد آور شخصیتوں کی گرانمایہ تحریروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

> ''میں ترقی پسند نہیں ہوں لیکن اُن سماجی اور انسانی اقدار کو آج بھی اہم جانتا ہوں جن کی تبلیغ و اشاعت کے لیے یہ تحریک وجود میں آئی تھی۔ تحریک سے میرا اختلاف فن پارے میں ان اقدار کی پیش کش کے طریقۂ کار سے ہے۔''

افتخار عارف اور عرفان صدیقی کے شعروں کو مثالاً پیش کرتے ہوئے میں نے یہ بھی کہا:

''آج شاعری کا یہ مزاحمتی لہجہ وجود میں نہ آتا اگر فیض، مخدوم اور

سرداراس لہجے کی تعمیر نہ کرتے۔ المیہ تو یہ ہے کہ ایسی اہم تحریک کے
گرانقدر ادبی سرمائے کی معنویت کا محاکمہ کرنے میں خود ترقی پسند
نقاد ناکام نظر آرہے ہیں۔ ایسی تمام تحریروں کی ایک نئی قرأت کی
ضرورت ہے تا کہ اس عہد میں اِن کی نئی معنویتیں روشن ہوسکیں۔''

میری تقریر طولانی ہوتی جارہی تھی اور وہ کشور ناہید جن کے لیے مشہور ہے:

ع دیکھا غضب سے جس کی طرف زرد ہوگیا

میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ مطلب یہ تھا کہ بہت ہو چکا اب ختم کرو۔ سو میں نے اپنی بات ختم کی اور اطمینان مجھے اس بات پر ہوا کہ سامعین نے میرے معروضات کو توجہ کے ساتھ سن لیا۔ صبا اکرام، اشفاق حسین اور جمال نقوی تو سکہ بند ترقی پسند ہیں سو انہوں نے تفصیل سے تحریک کی فضیلتیں بیان کیں اور اس کے فتوحات کے قصیدے پڑھے جن میں غلو بھی تھا اور صداقت بھی۔

زاہدہ حنا اپنی تحریروں میں اُنہیں ترقی پسند اقدار کی نمائندگی کرتی رہی ہیں جن پر لب کشائی کے لیے اس وقت وہ سامعین کے سامنے موجود تھیں۔ لیکن اقدار کی اس ترجمانی میں انہوں نے کہانی کے ہنر کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دیا اور اس حرمت کو قائم رکھا جو احتجاج کے اکہرے پن سے مجروح ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے پرچے میں عالمانہ متانت کے ساتھ ترقی پسند اقدار کی معنویت پر گفتگو کر رہی تھیں اور بتا رہی تھیں کہ معاشرے کے موجودہ آشوب میں یہ اقدار آج بھی بامعنی ہیں۔

اپنے ملک میں انسانی اقدار کا علم بلند کرنے والی اور مردوں پر عورتوں کی سبقت کا پرچم لہرانے والی کشور ناہید بہ صورتِ صدر اس اجلاس کی آخری مقرر تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں، مائک پر آئیں اور حسب روایت تیکھی اور تیکھی باتوں کے ذریعے اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کا دیانتدارانہ اعتراف کیا۔

میں اسٹیج سے اتر کر آیا تو بہت سے لوگوں نے بہت پر جوش طریقے سے میری تقریر کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے یہ کہہ کر ان کا شکریہ ادا کیا کہ بھائی میں ترقی

پسند نہیں ہوں لیکن اس تحریک کے اہم اور قیمتی سرمائے کا منکر بھی نہیں۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ:

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اس اجلاس کو دیکھ کر ایک بات مجھے تسلیم کرنا پڑی۔ وہ یہ کہ ہندستان میں ترقی پسندوں کی اچھی خاصی تعداد ہے اور یہاں بڑے غالی ترقی پسند موجود ہیں لیکن اُن کے جلسوں میں میں نے ایسا جوش اور ایسی بامعنی اور کار آمد گفتگو ہوتے نہیں دیکھی۔

●

ادھر کچھ برسوں سے جب سے شمس الرحمٰن فاروقی نے داستان پر کام کرنا شروع کیا ہے، ہندستان میں داستان گوئی کے فن کا احیا ہوا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے بھتیجے محمود فاروقی نے داستان کے شائقین کو اس فن سے عوامی سطح پر متعارف کرانے میں دوبارہ پہل کی ہے۔ محمود فاروقی اور دانش حسین کی جوڑی نے ہندستان کے مختلف شہروں میں بلکہ بیرونِ ہند بھی اس فن کا مظاہرہ کیا ہے اور کچھ اور نوجوانوں کو بھی اس معدوم ہوتے ہوئے ہنر کی تعلیم دے کر تیار کیا ہے۔ فاروقی نے داستان پر بہت دیدہ ورانہ کام کیا ہے لیکن ایک بات جو مجھے پریشان کرتی رہی ہے وہ یہ کہ داستان پر لکھنے اور داستان سنانے والوں نے کیا کبھی کسی داستان گو کو داستان سناتے دیکھا ہے۔ یہ فن اصلاً لکھنؤ میں پروان چڑھا اور اس کے پروان چڑھنے میں سب سے نمایاں کردار لکھنؤ کے اُس دربار نے ادا کیا جہاں بادشاہوں کے حضور بہت سے تفریحی فنون کے مظاہروں میں سے ایک مظاہرہ یہ بھی تھا۔ لکھنؤ کے داستان گویوں نے اس فن میں کمال پیدا کیا اور پھر تو گھر گھر طلسمِ ہوشربا اور دوسری داستانیں سنائی جانے لگیں۔ میرا تعلق لکھنؤ کے اُس علاقے سے ہے جو اصل لکھنؤ کہلاتا ہے۔ میری والدہ کے بچپن میں لکھنؤ میں ایسے داستان گو موجود تھے جو اپنی ضعیفی کے باوجود اکثر اس فن کا مظاہرہ کرتے تھے اور میری والدہ ان سے سنی ہوئی داستانوں کے قصے سناتی تھیں۔ سلسلۂ کلام کو منقطع کیے بغیر داستان کو تین دن تک ایک ہی مقام پر روکے رکھنے کا ایک قصہ وہ اس طرح سناتی تھیں:

''ایک قصہ گو دربار میں قصہ سنا رہا تھا۔ اُسے تین دن کے لیے کسی

کام سے باہر جانا پڑا۔ اس نے بادشاہ سے باہر جانے کی اجازت لی اور اس کے حضور عرض گزار ہوا: ''یہاں سے آگے کا قصہ میرا بیٹا سنائے گا۔'' قصہ گو نے قصہ جہاں پر چھوڑا تھا اس کا محل یہ تھا کہ شہزادے کی بارات محل کے دروازے سے بس نکلنے ہی والی تھی۔

تین دن بعد جب قصہ گو لوٹ کر آیا اور جب اس نے بیٹے سے پوچھا:

''جانِ پدر قصہ کس محل پر ہے؟''

تو بیٹے نے جواب دیا:

''ابا جان شہزادے کی بارات محل کے دروازے سے ابھی باہر نکلی نہیں ہے۔''

میں نے اپنی ماں سے جاڑے کی سرد راتوں میں کوئلے کی دہکتی ہوئی انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر ان داستانوں کو خوب سنا ہے۔ دن میں چوسر پچیسی کھیلنے کے ساتھ لکھنؤ کی بڑی بوڑھیوں کا ایک تفریحی مشغلہ رات میں داستان سننے سنانے کا بھی تھا۔ لیکن ان کے داستان سنانے میں نہ اشاروں کا دخل تھا نہ جسم کے حرکات وسکنات کا۔ سارا کرشمہ لہجے کے زیر و بم اور لفظوں کی قوت سمجھ کر ان کی ادائی کا تھا۔ لکھنؤ کی مرثیہ خوانی میں بھی سارا کمال آواز اور لہجے کا تھا۔ یہاں شیعہ گھرانوں میں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ اگر جناب سیّدہ کی کہانی کی جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آئی ہے، منت مان لی جائے تو مراد ضرور پوری ہوتی ہے۔ یہ کہانی جس میں سنارنی، یہودی کی لڑکی، شہزادی اور وزیرزادی کے قصے ہیں، بزرگ خواتین اُسی لہجے میں سناتی ہیں جس لہجے میں ہمارے داستان گو داستان سناتے تھے۔ میرے شہر کے آخری داستان گویوں میں منجھو صاحب سوزخوان تھے۔ آرزو لکھنوی کے لیے بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کچھ داستانیں لکھی بھی تھیں اور وہ داستان سناتے بھی تھے۔ واللہ اعلم۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے گھر کا ایک حرف ناشناس ملازم وزیر علی اعضائے جسم کو حرکت دیے بغیر یوں داستان سناتا کہ سماں بندھ جاتا۔ ان سب نے اور ہماری بڑی بوڑھیوں نے داستان سنانے میں نہ دھڑ پنج کی نہ ہاتھ پیروں کو چلایا، ہمیشہ لہجے اور آواز کے تغیر سے ہی سب کچھ سنایا۔ یہ متحارب انہ انداز تو آلہے کا ہے کہ وہ ایک رزمیہ ہے۔

داستان گوئی کو زندہ کرنا ایک لائق تحسین قدم ہے۔ یہ مرتے ہوئے بلکہ مر جانے والے فنون میں سے ایک ہے لیکن اس کا مظاہرہ اس کی اصل شکل میں نہیں ہو رہا ہے۔ نئی طرح سے داستان سنانے والے فاروقی کے تربیت یافتہ نوجوان ایک زمانے تک داستان کے اہم کردار عمرو عیار کے عمرو کو واوِ اضافی کے ساتھ ادا کرتے رہے جبکہ ادائی میں اس کا تلفظ عمرو نہیں واؤ کے حذف کے ساتھ عمرٗ ہے۔ یہ واوِ غیر ملفوظ اس غرض سے اضافہ کیا گیا تھا کہ عُمرَ اور عمر میں امتیاز کیا جا سکے۔ بہر حال کسی بھی شکل میں سہی اس کا احیا لائقِ تحسین ہے۔

آرٹس کاؤنسل کے دعوت نامے میں جب مجھے عقیل عباس جعفری کی کتاب ''میر باقر علی داستان گو'' کی رسمِ رونمائی کی تقریب میں داستان گوئی کا جز بھی شامل نظر آیا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ہندستان میں دوبارہ اپنے پاؤں جماتا ہوا یہ فن پاکستان بھی پہنچ گیا۔ آج کے چوتھے اجلاس کے بعد پہلے عقیل عباس جعفری کی کتاب 'میر باقر علی داستان گو' کے اجرا کی رسم انجام دی گئی۔ صاحبِ کتاب نے اس موقع پر میر باقر علی اور داستان گوئی کے فن پر اظہارِ خیال کیا، پھر دو نوجوان ـــ فواد خاں اور نذر الحسن اس چھوٹے سے اسٹیج پر آئے جو اس فن کے مظاہرے کے لیے اپنے متعلقات کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ دونوں نے بڑی مہارت کے ساتھ داستان گوئی کے فن کا مظاہرہ کیا۔ یہ دونوں نوجوان اس فن کے مظاہرے میں دوسروں سے کسی بھی طرح کم نہ تھے۔ ان کی پیش کش کے دوران اُن کے ہنر سے خوش ہو کر سامعین تالیاں بجانے لگتے۔ واضح رہے کہ اس فن کے مظاہرے میں داد کا یہ طریقہ خلافِ تہذیب بھی ہے اور داستان گوئی کے عمل میں حارج بھی کہ اس طرح داستان سنانے والوں کی یکسوئی قائم نہیں رہ پاتی۔

●

داستان گوئی ختم ہوئی۔ عقیل عباس جعفری، فواد خاں اور نذر الحسن کو نامہ نگاروں نے گھیرا۔ ان کی تصویریں اتاریں۔ ان سے کچھ سوال کیے۔ ہال سے کچھ لوگ باہر نکلے، کچھ اندر آئے۔ اسی بیچ رخسانہ صبا نے ڈائس پر پہنچ کر پانچویں اجلاس کا اعلان کیا۔ یہ اجلاس تین کتابوں کے اجرا کی تقریب سے متعلق تھا۔ یہ کتابیں تھیں: 'رونقِ بزمِ جہاں'، 'درد کی قندیل' اور 'یگانہ'۔ عمدہ خاکوں سے متعلق ڈاکٹر اسلم فرخی کی کتاب رونقِ بزمِ جہاں پر پروفیسر سحر انصاری نے

اظہارِ خیال کیا اور اس کی خوبیوں کو اجاگر کیا۔

فراست رضوی کی رباعیات کا مجموعہ ''درد کی قندیل'' مجھے بہت پہلے مل چکا تھا اور میں فراست کو ان رباعیوں کی داد بھی دے چکا تھا۔ میں کیا ہندوستان میں جن جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ مجموعہ پہنچا، ان سب نے دل کھول کر اس کی داد دی۔ اس ملک میں عروض سے واقفیت رکھنے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ نیّر مسعود اور شمس الرحمٰن فاروقی دو ایسے اشخاص ہیں جن کی عروض پر گہری نظر ہے۔ ان دونوں ہی نے رباعیاتِ فراست کی تحسین کی اور فاروقی نے 'شب خون' کے ضمیمے میں اس پر توصیفی تبصرہ بھی کیا۔ رباعی گوئی سے فاروقی کو خاص شغف ہے۔ 'چار سمت کا دریا' کے عنوان سے ان کی رباعیوں کا ایک مختصر سا مجموعہ بہت پہلے شائع ہوا تھا اور مجھے اس مجموعے کے سلسلے میں یہ شرف حاصل ہے کہ اس مجموعے کی ساری رباعیاں سب سے پہلے میرے غریب خانے پر پڑھی گئی تھیں۔ مجھے رضا علی عابدی کے ساتھ فراست کے اس مجموعے کی رونمائی کی رسم بھی ادا کرنا تھی اور اس پر بات بھی کرنا تھی۔

فراست کی طرح عروض سے میری کامل واقفیت نہیں ہے۔ البتہ میرا اٹھنا بیٹھنا عروضیوں میں بہت رہا ہے اس لیے زحافات کا تھوڑا بہت فرق سمجھ لیتا ہوں۔ انیس، یگانہ، جوش اور جگت موہن لال رواں کی رباعیاں پڑھ رکھی ہیں اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ فراست نے اپنی رباعیوں میں لائقِ تحسین اجتہادات کیے ہیں۔ اس نے رباعی کو بہت سنجیدہ اور حکیمانہ موضوعات کے حصار سے نکال کر اس کے دائرے کو وسیع کیا ہے اور وہ جو چوتھے مصرعے کی قوت ہے اسے ہر جگہ باقی رکھا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تنوعات کے اعتبار سے اردو میں ایسی رباعیاں اس سے پہلے نظر نہیں آتیں۔ اس کی ساری رباعیاں پڑھ کر ایک منظر اس طرح مجسم ہوتا ہے:

بیٹھا ہے کس شکوہ سے پہنے ہنر کا تاج
اک شاہزادہ ملکِ رباعی کے تخت پر

میں نے یہ بھی کہا کہ فراست نے اس مجموعے میں فن پر بھی اپنی گرفت مضبوط رکھی ہے۔ یہی چند باتیں میں نے اپنی مختصر سی تقریر میں کہیں اور علامہ طالب جوہری کے اس مقدمے کی تحسین بھی کی جو فراست کی رباعیوں کی خصوصیتوں کو نمایاں کرنے کے لیے بڑی دقتِ نظر سے لکھا گیا

ہے۔ کچھ منتخب رباعیاں میں نے سامعین کو سنائیں بھی اور یوں میرے معروضات کے وسیلے سے فراست ایک بار پھر تحسین یاب ہوئے۔

یگانہ والی کتاب مجھے ڈاکٹر نجیب جمال سے اجلاس والے دن ہی ملی تھی۔ انہوں نے کتاب پر میرا نام لکھے بغیر یہ کتاب مجھے مرحمت فرمائی تھی (پاکستان میں کتاب پر نام لکھ کر دینے کا رواج ذرا کم ہے۔ نہیں معلوم کہ یہ مسئلہ انانیت کا ہے یا بے خیالی کا) اور یہ بھی کہا تھا کہ میں اس پر کچھ بولوں بھی۔ لیکن عین وقت پر نہ جانے کیا ہوا کہ نام زاہدہ حنا کا پکارا گیا۔ میں نے سوچا کہ عین وقت پر تبدیلی کا سبب کہیں یہ نہ ہو کہ میں کتاب کے تعلق سے ایسی باتیں نہ کہہ جاؤں جو صاحبِ کتاب کو اچھی نہ معلوم ہوں۔ لکھنؤ کے اس متنازعہ شاعر پر لکھنؤ میں اور لکھنؤ کے باہر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ راقم الحروف نے یو۔ پی اردو اکادمی کے لیے یگانہ کا انتخاب کیا اور اس پر مقدمہ لکھا۔ مجھ سے پہلے راہی معصوم رضا اور نیر مسعود نے بہت وقیع اور اہم کتابیں لکھیں اور مشفق خواجہ نے تو کلیاتِ یگانہ کے نام سے نو سو ساٹھ صفحات والی اپنی کتاب میں سب کچھ سمیٹ لیا۔ سابقین (سوائے من) کے ان لائقِ تحسین کارناموں کے باوجود نجیب جمال کے پانچ سو صفحے کے اس تحقیقی مقالے کی معنویت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور زاہدہ حنا نے یہی کام کیا۔ انہوں نے یگانہ کی شاعری کے تیکھے تیوروں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف کی محنت، عرق ریزی، مواد کی جمع آوری اور کتاب کی تہذیب و ترتیب کی پذیرائی کی اور بجا کی۔ نجیب جمال اس پذیرائی سے خوش ہوئے اور ان کی خوشی دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔

رضا علی عابدی، قاضی افضال حسین اور جاذب قریشی نے مشترکہ طور پر اس اجلاس کی صدارت کی لیکن کلمۂ صدارت کو بہ صد تحسین و آفریں ادا کرنے کا فریضہ انجام دیا رضا علی عابدی نے۔

جشنِ لیلۃ الشعر

فراست اس اجلاس کے بعد میانِ سامعین اپنی رباعیوں پر سب سے داد وصول کر رہے تھے اور دلدادگانِ شعر کتاب کے اجرا پر انہیں تہنیت پیش کر رہے تھے۔ بھابھی اس داد و تہنیت سے خوش ہو رہی تھیں۔ سامعین ہال سے باہر نکل کر جتھوں کی شکل میں عشائیے کے لیے 'گل رنگ' کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں اس وقت لوگ بہت زیادہ تھے۔ ان میں کچھ وہ بھی

تھے جو آئے تو تھے جشنِ لیلتہ الشعر (مشاعرہ) میں شرکت کرنے لیکن 'گل رنگ' میں اپنی جان پہچان کے لوگوں سے ملنے چلے آئے تھے۔ یہاں روز کی طرح میزوں پر گرما گرم گفتگو ہو رہی تھی۔ پھر کھانا شروع ہوا۔ میری قسمت میں صرف چاول تھے سو میں نے اسی پر قناعت کی۔ فراست اور بھابھی کھانا ختم ہوتے ہی اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ دونوں میاں بیوی اگر چہ بہت اچھے شاعر ہیں لیکن مشاعرے میں یہ دونوں نہ تو شاعر کی حیثیت سے شریک ہوئے نہ بہ حیثیتِ سامع۔

ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی لوگ مشاعروں میں بہت شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ آرٹس کاؤنسل کا احاطہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے مشاعرے کے شائقین سے بھر چکا تھا۔ ایک بہت خوبصورت شامیانۂ شب تاب کے نیچے نور برساتی ہوئی روشنیوں میں سامعین کی دمکتی ہوئی شکلیں اس شعرگاہِ شب افروز کی رونقیں بڑھا رہی تھیں۔ مشاعرے کا اہتمام نیشنل بینک آف پاکستان کی جانب سے کیا گیا تھا اور کلام خوانی کے بعد ہر شاعر کو اسی بینک کی طرف سے ایک نشانِ تقریب (میمنٹو) بھی پیش کیا گیا تھا۔ مشاعرے کے اسٹیج کی آرائش اس طرح کی گئی تھی کہ اونچی سی جگہ پر کرسیاں رکھ کر شاعروں کے بیٹھنے کا اہتمام کیا گیا تھا اور اسی کے نیچے شعر خوانی کے لیے دو فٹ کی ایک چوکی رکھ کر اُسی کے پہلو میں مائک رکھ دیا گیا تھا۔ چوکی کے پیچھے تکیے اور گدّے لگا دیے گئے تھے۔ ہر شاعر آتا اور انہیں تکیوں، گدّوں سے لگ کر اپنا کلام سناتا۔ اسی حصے میں داہنی طرف اسی طرح کا انتظام مشاعرے کے ناظم کے لیے تھا۔ اسٹیج کے سامنے والے حصے میں کچھ دور تک فرش بچھا دیا گیا تھا اور اس پر کچھ کچھ فاصلے پر گاؤ رکھ دیے گئے تھے اور اس کے بعد احاطے کی دیوار تک کرسیوں کی قطاریں تھیں۔ روشنیوں سے بھرے ہوئے اس پورے حصے کی آرائش اور سامعین کی نورانی شکلیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا گویا:

ع سونے کی ہے زمیں تو ستاروں کا فرش ہے

مشاعرے کی نظامت عنبریں حسیب عنبر کر رہی تھیں جو خود بھی ایک شاعرہ ہیں۔ انہوں نے اپنی کھنکتی ہوئی آواز اور دل فریب لہجے میں تمہید باندھ کر مشاعرے کے آغاز کا اعلان کیا اور شاعروں کے نام لے لے کر انہیں شہ نشین پر آنے کی دعوت دی۔ شاعروں نے اپنے ناموں کے اعلان کے ساتھ اپنی کرسیاں سنبھال لیں اور جب میرا نام پکارا گیا تو میں شہ نشین کی

طرف قدم بڑھانے کے بجائے سامعین کی صف میں آصف فرخی کے پہلو والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ آج کل کے مشاعروں سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ جب میں شیعہ کالج میں طلبہ کی یونین کا صدر تھا تو میں نے ''سب مشاعروں سے ہٹ کر ایک مشاعرہ'' کے عنوان سے ایک ایسا مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں سنجیدہ ادبی رسالوں میں چھپنے والے شاعروں کو مدعو کیا تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے اپنے سولہ سالہ عہدِ صدارت میں میں نے پاکستان سے آنے والے ہر بڑے شاعر کے اعزاز میں کامیاب نشستیں منعقد کیں لیکن شعبے میں کسی مشاعرے کا اہتمام نہیں کیا۔ ہندستانی مشاعروں میں بہت کم شاعر اپنا کہا ہوا کلام پڑھتے ہیں اور جو اپنا پڑھتے بھی ہیں تو اس کا معیار بہت پست ہوتا ہے۔ پاکستان کی صورتحال کا مجھے پوری طرح علم نہیں۔ بھارت میں خوش لحنی کا بول بالا ہے اور خواتین اس خوش لحنی میں دوسروں کے دیے ہوئے کلام کو پڑھ کر بہت مقبول ہیں۔ اور اب تو غزل والی خوش لحنی بھی غائب ہے۔ ہندستانی مشاعروں میں نشور واحدی اور خمار بارہ بنکوی وغیرہ جب رات کے آخری پہر میں غزلیہ لحن کے ساتھ اپنی غزل پڑھتے تھے تو کلیجے میں ہوک سی اٹھنے لگتی تھی۔ اب غزل سے غزل کے مزاج والا یہ ترنم غائب ہے۔ محض خوش الحانی غزل خوانی کا حق ادا نہیں کرتی۔ یہ غزلیہ ترنم جگر اور خمار وغیرہ سے مخصوص تھا۔ مستزاد یہ کہ اب شاعر بہ طرزِ گدائی یہ کہہ کر داد طلب کرتے ہیں کہ اگر آپ نے اس شعر پر داد نہ دی تو میرا کشکولِ دادخواہی تہی رہ جائے گا۔ پہلے کے مشاعروں میں داد طلبی کا یہ عامیانہ انداز نہیں تھا۔ اُس عہد کے صفِ دوم کے شاعر بھی اس بات کو سمجھتے تھے:

خالص اگر ہے مشک تو بو آشکار ہے
چمکے گا آپ وہ جو دُرِ آبدار ہے

اب اُس زمانے کے سامعین ان گداگرانِ داد کو آکر سمجھائیں کہ:

آگے نہ اور دستِ گدائی کریں دراز
باز آئیں ایسی شعبدہ بازی سے شعر باز

ترنم بازی کے اس تماشے میں تحت کا فن بھی غائب ہوتا جا رہا ہے۔ اب تحت کے نام

پر اداکاری کی جاتی ہے۔ کیفی اعظمی بہت بڑے ترقی پسند شاعر نہ سہی لیکن جب تحت میں کلام پڑھتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا اور سردار کو تو تحت خوانی میں کمال حاصل تھا۔ سردار کی سی تحت خوانی ان کے بعد کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ بھلا ہو افتخار عارف کا کہ انہوں نے تحت خوانی میں ایک نیا لہجہ نکالا اور یہ لہجہ نکلتے ہی مقبول ہو گیا۔ ایک بار پھر ہمیں لکھنؤ پر فخر کر لینے دیجیے کہ ان تینوں شاعروں کی اصل تربیت گاہ ہمارا ہی شہر ہے۔

ایک اور بات ...اب ہمارے مشاعروں سے ظریفانہ ہوٹنگ کا رواج بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اور سبب اس کا یہ ہے کہ اب باذوق سامعین مشاعروں میں آتے ہی نہیں۔ اس ظریفانہ ہوٹنگ کے ایک۔ دو واقعے سُن لیجیے، ممکن ہے یہ پہلے سے آپ نے سُن رکھے ہوں:

نوح ناروی کسی مشاعرے میں بہت زور لگا کر شعر پڑھ رہے تھے۔ ایک شعر انہوں نے اتنا زور لگا کر پڑھا کہ ان کی بتیسی باہر آ گئی۔ سامعین میں سے کسی نے کہا:

''نوح صاحب واہ! خالص زبان کا شعر ہے۔''

نذیر بنارسی بہت چھوٹے قد کے شاعر تھے۔ ایک مشاعرے میں پڑھنے کھڑے ہوئے تو کسی نے آواز لگائی:

''قبلہ! کھڑے ہو کر پڑھیے۔''

فراق گورکھپوری کی عادت تھی کہ وہ شعر کا پہلا مصرعہ پڑھنے کے بعد اسے سامعین سے اٹھواتے تھے۔ رائے بریلی کے ایک مشاعرے میں اگلی صف میں اسّی۔ پچاّسی برس کے ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ فراق نے مصرعہ پڑھا اور غلّہ ایسی آنکھیں نکال کر اُن بزرگ کو گھورتے ہوئے کہا: ''اٹھاؤ مصرعہ۔''

وہ بزرگ برجستہ بولے: ''اماں ہم کوئی آپ کے باپ کے نوکر ہیں، مصرعہ آپ کا ہے، آپ اٹھائیے۔''

اسی طرح مجاز اپنی نظم 'نورا' ممبئی کے کسی مشاعرے میں پڑھ رہے تھے۔ جب انہوں نے یہ مصرعہ پڑھا:

ع گھڑی سوز تھی وہ گھڑی ساز تھی وہ

تو ایک سامع نے جھوم جھوم کر کہنا شروع کیا: مجاز صاحب پھر پڑھیے۔ گھڑی ساز تھی وہ۔ گھڑی ساز کا جواب نہیں۔

کبھی کبھی جواب الجواب کی ہوٹنگ بھی ہوتی اور اس ہوٹنگ میں فریقین حدّ ادب سے آگے نکل جاتے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مشاعرے میں باریش شاعر فنا نظامی کانپوری کے ایک اچھے شعر پر آگے بیٹھے ہوئے طالب علم نے اس طرح داد دی:

''واہ کیا شعر ہے۔جی چاہتا ہے منہ چوم لوں۔''

فنا بولے: ''چوم لو پیارے۔''

لڑکے نے کہا: ''ڈاڑھی میں کیا مزہ آئے گا۔''

فنا فوراً بولے: ''تمہیں نہیں ہمیں تو آ جائے گا۔''

ایک مشاعرے میں فراق کلام سنانے آئے تو سامعین میں سے کسی نے کہا: ''باندھ دو جانے نہ پائے۔''

فراق فوراً بولے: ''کیا کوئی مضبوط کھونٹا ہاتھ لگ گیا ہے۔''

میں جب لکھنؤ میں رختِ سفر باندھ رہا تھا اس وقت فراست نے مجھے بتایا کہ آپ کو مشاعرے میں بھی پڑھنا ہے۔ میں نے انکار کیا لیکن پھر یہ سوچ کر راضی ہو گیا کہ پاکستان کے مشاعروں کا معیار بہت بلند ہوتا ہوگا اور وہاں شاعروں کے سامنے شعر نافہم سامعین کم رہتے ہوں گے۔ راضی ہو جانے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ میں نے ایرپورٹ پر چھ گھنٹے کی تاخیر والے وقفے میں اپنا ایک منظوم تعارف نامہ کہہ لیا تھا۔ اسے کہہ لینے کے بعد میں نے سوچا بس اسی کو مشاعرے میں سنا دوں گا۔

بزرگ اور کہنہ مشق شاعر رسا چغتائی کی صدارت میں چالیس شاعروں پر مشتمل آرٹس کاؤنسل کے احاطے میں ہونے والے اس مشاعرے کی نظامت کا فریضۂ احسن، بتایا جا چکا ہے، پروفیسر سحر انصاری کی بنتِ باہنر عنبریں حسیب عنبر انجام دے رہی تھیں۔ ہندستان میں مشاعرے کی نظامت کا پیشہ بہت پھل پھول رہا ہے لیکن اب تک یہاں کسی خاتون نے اس منصب کو بہ طرزِ اولیٰ نہیں سنبھالا ہے۔ عنبریں حسیب عنبر ایک منجھے ہوئے ناظم کی طرح برمحل

فقروں اور منتخب لفظوں کے ساتھ ہر شاعر کو اس کے محلِ آمد کے مناسب جواز کے ساتھ مدعو کررہی تھیں۔یعنی وہ کسی کی زمین کا حوالہ دے کر اسے بلا رہی تھیں تو کسی کا مقبولِ عام شعر پڑھ کر۔اور کسی کا شاعرانہ منصب بتا کر اسے دعوتِ سخن دے رہی تھیں۔ ہر لحظہ وقت کا لحاظ رکھنے والے سخت گیر منتظم احمد شاہ نے مشاعرے کی ناظم کو شاعروں سے ایک ہی غزل پڑھوانے کی ہدایت دی تھی اور وہ اس ہدایت کی پابندی نہ کرنے والے شاعروں کو صفِ سامعین میں بیٹھے خود بھی ٹوک رہے تھے۔مقامی شاعروں سے شعر خوانی کا آغاز ہوا۔رُک رُک کر واہ واہ کا شور بلند ہوا۔پھر بھارت کے نوجوان شاعروں کی باری آئی۔کسی کی تحسین ہوئی، کسی پر خاموشی رہی۔ میں نے بغل میں بیٹھے ہوئے آصف سے کہا:''مشاعرہ اٹھ نہیں رہا ہے۔'' پھر ایک جواں سال شاعر عباس تابش آئے۔ انہوں نے پیشہ ور ہندستانی شاعروں کی طرح مشاعرے کی نبض سمجھ کر مشاعرے کو اٹھانے کا ایک حربہ یہ اختیار کیا کہ چل جانے والے ایک ایک۔دو دو شعر پڑھے اور واقعی وہ چلے۔لیکن جب یہ قطرے زیادہ ٹپکنے لگے تو احمد شاہ نے انہیں بارش میں تبدیل ہونے سے روک دیا۔اور اسی وقت عباس تابش ماں سے متعلق شعر پڑھنے لگے اور تب میں نے جانا کہ ہندستانی مشاعروں کی ماں پاکستان پہنچ کر وہاں کے سامعین سے بھی داد طلب کر لیتی ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ مشاعروں میں یہ ماں کب تک داد خواہی کا وسیلہ بنتی ہے۔میرا خیال ہے کہ اس ''کثرتِ مدحِ مادر'' میں افتخار عارف کو بہت پہلے کہا ہوا اپنا یہ شعر دیوان سے خارج کر دینا چاہیے:

گھر سے نکلے ہوئے بیٹوں کا مقدر معلوم
ماں کے قدموں میں بھی جنّت نہیں ملنے والی

عبّاس تابش کے بعد دوسرے شاعر آتے گئے، کلام سناتے گئے۔اسی بیچ عنبریں حسیب عنبر نے تقدیم و تاخیر کی قید اٹھا کر عطاء الحق قاسمی سے کلام خوانی کی گزارش کی۔ وہ کرسی نشینوں کی صف سے اٹھے، مسند شعر خوانی کی طرف بڑھے، بیٹھے، مائک کا رخ اپنی طرف کیا اور مشاعرے کا مزاج سمجھ کر چھوٹی بحروں والی غزلوں کے شعر پڑھنا شروع کیے۔حربہ کارگر رہا اور صفِ سامعین سے واہ واہ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ان آوازوں میں فوزیہ خان کی آواز بہت نمایاں تھی۔وہ اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ سب سے آگے بیٹھی تھیں۔وہیں کہیں پر احمد شاہ بھی

تھے جو پسند آ جانے والے شعروں کو اپنی لگائی ہوئی شرط توڑ کر مکرّر پڑھنے کی فرمائش کر رہے تھے۔ چھوٹی بحروں کی نئی اور عمدہ زمینوں میں سہلِ ممتنع کے انداز والے شعروں پر عطاء الحق قاسمی کو خوب داد ملی۔ انہوں نے مشاعرہ لوٹا اور داد دینے والوں کی جیب ہائے تحسین خالی کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن ہوٹل میں صبح کے ناشتے پر جب میں نے ان سے کہا کہ آپ نے اچھا کیا کہ اپنے مقام سے پہلے پڑھ کر چلے گئے تو وہ بولے: ''میاں تجربے سے یہی سیکھا ہے۔ لوگ اٹھنے لگے تھے میں نے سوچا کلام سنانے کا یہی مناسب موقع ہے۔'' عطاء الحق قاسمی کے بعد کچھ اور شاعر آئے۔ یہاں وہاں سے واہ واہ کی سوئی ہوئی آوازیں اٹھیں پھر عنبریں حسیب عنبر نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ بیٹھا ہوا مشاعرہ اٹھ گیا۔ سننے والوں سے انہیں خوب داد ملی۔ رات گزرتی جا رہی تھی اور خوانندگانِ شعر ابھی اچھی خاصی تعداد میں کرسیوں پر موجود تھے۔

مشاعرے کی ناظم نے اب احمد فواد کو زحمتِ سخن دی۔ وہ کلام سنانے آئے تو احمد شاہ نے ان سے ایک نظم 'صبا بادِ صبا' سنانے کی فرمائش کی جو شاید ان کے طالب علمی کے زمانے کی تھی۔ یہ نظم میں اُن سے ہوٹل کے لاؤنج والی نشست میں سن چکا تھا۔ نظم بہت طویل تھی جس میں صبا بادِ صبا کی تکرار تھی۔ قلندر صفت احمد فواد مشاعرے کے موڈ کو نہیں پہچان سکے اور انہوں نے اس طویل نظم کو مختصر نہیں کیا۔ سامعین محظوظ ہونے کے بجائے اکتانے لگے۔ ان کے جانے کے بعد ایک دو شاعر اور آئے پھر مجھے دعوتِ سخن دی گئی۔ میں حلقۂ سامعین سے نکل کر سیدھا مقامِ شعر خوانی پر جا پہنچا، جیب سے پرچہ نکالا اور اپنے تازہ کہے ہوئے شعر سنانا شروع کیے:

صفِ ستم سے نہ فوجِ عدو سے آئے ہیں
تمہارے شہر میں ہم لکھنؤ سے آئے ہیں

سامعین کی صف میں سناٹا رہا۔ بہت دور سے واہ کی ایک دبی دبی سی آواز آئی۔ ناظمِ مشاعرہ نے بھی واہ کی آواز بلند کی لیکن واہ کی یہ آواز مشاعرے کے ہر ناظم کی مجبوری ہے۔ شعر اُسے پسند آئے یا نہ آئے یہ واہ اضطراراً اس کے حلق سے نکل ہی جاتی ہے۔ میں نے دوسرا شعر پڑھا:

تمہاری یاد کے آہو جہاں رمیدہ ہیں
ہم اِس گلی میں اُسی دشت ہو سے آئے ہیں

پھر سناٹا.... فوزیہ خان جو بڑھ بڑھ کر شعروں پر داد دے رہی تھیں وہ بھی خاموش اور ان کے ساتھ والے بھی چپ۔ میں نے تیسرا شعر پڑھا:

محبتوں کی پری جس میں غسل کرتی ہے
بدن یہ دھو کے اُسی آبجو سے آئے ہیں

پھر وہی سکوت۔ مروتاً واہ کی اکا دکا آوازیں۔ عدمِ تحسین کی اس فضا میں میں نے اس بار یہ شعر یہ سوچ کر پڑھا کہ مہاجرین اس مجمعے میں بہت ہوں گے اس لیے اس پر داد ضرور ملے گی:

اے شہرِ گل کے رفیقو! تمہاری بستی میں
تمہارے چھوڑے ہوئے کاخ وکو سے آئے ہیں

مگر اس پر بھی تحسین کی آوازیں نہیں اٹھیں۔ میں نے رفتارِ قرأت میں تیزی پیدا کی اور جلدی جلدی یہ سب شعر سنا ڈالے:

جہاں کی روشنی تم کو تلاش کرتی ہے
اُسی ستارہ گہِ جستجو سے آئے ہیں
رہیں گے سبز گلستانِ گفتگو کے شجر
خبر یہ سن کے ہوائے نمو سے آئے ہیں
ہے دوستی کی مہک جن ہوا کے جھونکوں میں
وہ سب ہمارے گلِ آرزو سے آئے ہیں
نہ ہوں گے جنگ سے فیصل معاملے دل کے
سخن یہ لوح پہ لکھ کر لہو سے آئے ہیں
برائے خاطرِ آزردگانِ تیغِ ستم
سجا کے پیرہن اپنا لہو سے آئے ہیں
اکیلے خون میں تم ہی نہیں ہو تر کہ یہ تیر
ہمارے جسم پہ بھی چار سو سے آئے ہیں

یہ شعر پڑھنے کے بعد میں وہیں آکر بیٹھ گیا جہاں سے اٹھ کر گیا تھا۔ نیشنل بینک کے

ایک کارکن میرے پیچھے پیچھے وہ میمنٹو لیے ہوئے آئے جو ہر شاعر کو اس کی شعر خوانی کے بعد دیا جا رہا تھا۔ بغیرِ حصولِ تحسین اپنے شعر سنانے اور سامعین کی صف میں آ بیٹھنے کے بعد مجھے اپنے ایک دوست کی بات یاد آئی۔ وہ کہا کرتا تھا مشاعرے کا میدان بالکل الگ ہے۔ یہ ایک ایسی تماشا گاہ ہے جس میں تفریح پسند سامعین دل بہلاوے کے لیے آتے ہیں اور گلے بازوں اور شعبدہ سازوں کے آسانی سے سمجھ میں آ جانے والے شعروں پر داد دے کر چلے جاتے ہیں۔ اسی ضمن میں وہ اپنا کہا ہوا ایک شعر بھی سنایا کرتا تھا:

کبھی ملے نہ جنہیں صاحبانِ ذوق سے داد
مشاعروں میں وہی شعر خوب چلتے ہیں

سو میں نے داد نہ ملنے پر افسوس کرنے کے بجائے سوچا:

ع اگر ہوتے یہاں عرفان صدیقی تو کیا ہوتا

رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ سامعین اب بھی کئی بزرگ اور برگزیدہ شاعروں کو سننے کے منتظر تھے۔ میں رسا چغتائی، افتخار عارف، انور شعور اور امجد اسلام امجد کو سننا چاہتا تھا لیکن مجھے ڈر تھا کہ اگر یہاں بیٹھا رہ گیا تو نیند نہیں پوری ہوگی اور کل کے اجلاسوں میں غنودگی کا عالم رہے گا۔ اس لیے میں مشاعرہ گاہ سے باہر نکل آیا اور آرٹس کاؤنسل کی گاڑی میں بیٹھ کر ہوٹل چلا آیا۔ کمرے پر پہنچا تو قاضی افضال نے گہری نیند سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات کیے بغیر اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔

●

صبح میں دیر سے جاگا۔ آج کانفرنس کا آخری دن ہے۔ دھوپ پوری طرح نکل چکی ہے، دن چڑھ رہا ہے۔ چائے ہمارے کمرے پر آ چکی ہے۔ قاضی صاحب چائے کے گھونٹوں کے ساتھ شبلی پر لکھے ہوئے اپنے مضمون پر نظرِ ثانی کر رہے ہیں جو آج کے پہلے اجلاس میں انہیں پڑھنا ہے۔ میں نے ان کے مضمون بلکہ مضمون سے زیادہ اس کے صفحات پر ترچھی نگاہ ڈالی۔ اجلاسوں میں مضمونوں اور تقریروں کو مختصر کیے جانے کی ہدایت بار بار دی جا رہی تھی اور کسی کسی کو تو مقررہ وقت گزر جانے کے بعد آگے پڑھنے سے روک بھی دیا گیا تھا۔ جی میں آیا کہ قاضی صاحب

سے کہوں کہ مضمون مختصر کرلیں پھر سوچا کہ یہ مداخلت بیجا بجا نہیں۔ وہ مضمون دیکھتے اور یہاں وہاں سے اسے ٹھیک کرتے رہے۔ آج گیارہ کے بجائے بارہ بجے سے اجلاس شروع ہونا تھا اس لیے ہمیں عجلت زیادہ نہیں تھی۔ بھابھی نے کل ہمیں اطلاع دی تھی کہ آج دو بجے میٹرو چینل پر میرا اور قاضی صاحب کا ایک ایک گھنٹے کا انٹرویو ہونا ہے۔ آج انہوں نے اس کی یاددہانی بھی کرائی۔ اسی کے ساتھ یہ اچھی خبر بھی سنائی کہ فراست نے شبلی پر اپنا مضمون مکمل کرلیا ہے۔ ہم اطمینان سے تیار ہوئے اور نیچے آکر ناشتے پر دیر تک مختلف موضوعات پر مہمانوں سے گفتگو کرتے رہے۔

آرٹس کاؤنسل کی گاڑیاں آچکی تھیں۔ ہم ان کی طرف قدم بڑھا ہی رہے تھے کہ دیکھا عبید صدیقی ہاتھوں میں ایک بہت خوبصورت پنجرہ لیے ہوٹل کے احاطے میں داخل ہورہے ہیں۔ پوچھا یہ کیا؟ بولے: ''ہندستان میں بہت ڈھونڈا، نہیں ملا، یہاں مراد برآئی۔ کل اپنے ایک شناسا کے ساتھ پوچھتا پاچھتا ایمپریس مارکیٹ گیا تو وہاں پٹھانوں کی دکانوں پر مل گیا۔'' پھر انہوں نے پنجرے کی تفصیل میں بتایا کہ تیتر کے ایسے پنجرے آسانی سے نہیں ملتے۔ اور تب مجھے یاد آیا کہ انہوں نے مجھ سے ایسا پنجرہ لکھنؤ میں ڈھونڈنے کے لیے کہا تھا اور جب میں نے پرندوں کے بازار میں جاکر صاحبانِ قفس سے ان کی بات کرائی تو پنجرہ ان کی طلب کے مطابق نہیں نکلا۔ لیکن ان کی خوش بختی کہ یہاں کوچۂ صیادگانِ کراچی میں انہیں اپنے پرندے کو قید میں رکھنے کا سامان فراہم ہوگیا۔ اب ہندنژاد پرندہ باشندگانِ پاک کے پنجرے میں اُسی طرح تیلیاں گنے گا جیسے ہر پنجرے میں گنتا ہے۔ پرندہ کہیں کا ہو اسے ٹھکانے سے مطلب ہے، ٹھکانہ ساز سے نہیں۔ جن تیلیوں سے اس کا پنجرہ بنتا ہے اگر اُن پر مہرِ ملکیت ہو بھی تو مقامِ شکر ہے کہ پرندہ اسے پڑھ نہیں سکتا۔

ہم آرٹس کاؤنسل پہنچ کر روز کی طرح 'گل رنگ' میں داخل ہوئے۔ وہاں لوگ آنا شروع ہوگئے تھے۔ بھابھی اور فراست بھی آگئے۔ شوہر کی مقالہ خوانی کو دوبالا کرنے کی غرض سے آج بھابھی پیکرِ جمال بن کر آئی تھیں۔ بہت عمدہ ہلکے سبز رنگ کا سوٹ، اودے رنگ کا ڈوپٹہ اور سنہری فریم والا چشمہ۔ اُن کے روئے زیبا کو دیکھ کر فراست کا رخِ روشن اور بھی روشن ہورہا تھا۔ کھنکتی ہوئی چائے کی پیالیوں، سگریٹوں کے دھوئیں اور گونجتی ہوئی آوازوں کے

درمیان اجلاس کے شروع ہونے کی خبر دی گئی اور 'گل رنگ' میں فروکش سب کے سب مہمان خراماں خراماں آڈیٹوریم کی طرف بڑھنے لگے۔ جب ہال میں لوگ جمع ہوگئے تو فاطمہ حسن نے اجلاس کی نظامت کے لیے مائک سنبھالا اور اجلاس کے صدور اور مقالہ خوانوں کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ انتظار حسین، افتخار عارف، قاضی افضال حسین، فراست رضوی اور نعمان الحق یکے بعد دیگرے اسٹیج پر آکر بیٹھ گئے۔ فاطمہ حسن نے اجلاس کے موضوع پر تمہیداً اظہار خیال کرتے ہوئے حالی اور شبلی کے خدمات اور ان کی اہمیت و معنویت کا مختصراً ذکر کیا اور فراست رضوی سے مقالہ خوانی کی درخواست کی۔ بہت اجلا اور دیدہ زیب لباس پہنے فراست راتوں رات لکھا ہوا اپنا مقالہ لے کر مائک پر آئے اور شفاف آواز میں اسے پڑھنا شروع کیا۔ وہ مشرقی شعریات کی روشنی میں شبلی کا محاکمہ کر رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ مشرقی افکار و نظریات کو نگاہ میں رکھ کر شبلی نے کس طرح اپنی شعریات وضع کی اور کس طرح اس شعریات سے مشرقی ذہن کو روشن کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''شبلی کی شاعری میں گرمی اُس انگارۂ عشق سے پیدا ہوئی جو عطیہ کے لیے ان کے دل میں روشن تھا۔'' اس ضمن میں انہوں نے عطیہ کے خطوں کی مخصوص عبارتوں کے حوالے بھی دیے۔ مضمون ختم کرتے کرتے انہوں نے بہت یقین کے ساتھ کہا:

> ''شبلی کے انتقال کو سو برس ہو چکے ہیں، زمانہ بدل چکا ہے، نقد و نظر کا انداز بدل چکا ہے لیکن شبلی کا قائم کیا ہوا نقش آج بھی اُسی طرح چمک رہا ہے۔''

فراست دلیلوں کے ساتھ اپنی مخصوص قرأت کے ذریعے دانشورانہ انداز میں اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے اور میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی نسیم نازش کا چہرہ خوشی سے چمکتا جا رہا تھا۔ اس چہرے کی چمک اس وقت ماند پڑ گئی جب احمد شاہ نے فراست کو مضمون ختم کرنے کا اشارہ کیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے آخری جملے ادا کرتے انہیں مضمون پڑھنے سے روک دیا۔ نسیم نازش کبیدہ خاطر ہوئیں۔ بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا، اُٹھیں اور تیزی سے ہال سے باہر نکل گئیں۔ میں نے فراست کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا:

ع رخ تمتما گیا ہے ترے آفتاب کا

بھابھی کے پیچھے پیچھے میں بھی باہر نکلا کہ انہیں انیس کا یہ مصرعہ:

ع میلے نہ ہوں تیور یہ سپاہی کے ہنر ہیں

سنا کر اندر لے آؤں لیکن وہ نظر نہیں آئیں۔ اگر نظر آ جاتیں تو میں ان سے یہ بھی کہتا:

ع میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

میں اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس بیچ ڈاکٹر نعمان الحق نے ''حالی سے تجدید ملاقات'' کے موضوع پر بولنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں بہت سے کاغذ تھے جنہیں وہ بڑی بے ترتیبی سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے۔ کبھی ان کاغذوں کو دیکھ کر بولتے کبھی دیکھے بغیر۔ وہ بول زیادہ رہے تھے پڑھ کم رہے تھے۔ بولنے میں بھی ربط نہیں تھا۔ سننے والا سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ وہ کراچی یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے اس لیے ان کی اردو ان کی انگریزی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اپنی گفتگو میں کچھ تاریخی حوالے بھی دے رہے تھے لیکن سامعین کو اِن حوالوں میں شک تھا اور اس شک کا اظہار دبی دبی سی آوازوں میں ہو رہا تھا۔ نعمان الحق اپنے ہاؤ بھاؤ سے پکے دانشور بلکہ گم کردۂ دانش معلوم ہو رہے تھے، اسی لیے ان کے یہاں پاشاں بیانی زیادہ تھی۔ بہر حال کم پڑھ کر اور بہت بول کر انہوں نے اپنا مقالہ ختم کیا۔

پروفیسر قاضی افضال نے اپنا مقالہ ''اردو تنقید پر شبلی کے اثرات'' پڑھنا شروع کیا تو سامعین ان کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔ بڑی محنت سے لکھے ہوئے اپنے مقالے میں انہوں نے بتایا کہ اردو تنقید کہاں کہاں اور کس کس طرح شبلی کے تنقیدی فرمودات سے متاثر ہوئی ہے۔ انہوں نے وقت کا لحاظ رکھ کر اپنے مقالے کو مختصر کر دیا تھا لیکن جتنی دیر انہوں نے پڑھا، سامعین نے اسے توجہ سے سنا۔

ان سب کے بعد افتخار عارف نے اپنے صدارتی کلمات میں حالی و شبلی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

''اردو میں ان دونوں کا سا کوئی ادیب پیدا نہیں ہوا۔ یہ دونوں سرسیّد کی ادبی تحریک کی توسیع ہیں اور انہوں نے سرسیّد ہی کی علمی اور ادبی مہم کو آگے بڑھایا۔

شبلی کے عشق بلاخیز کا ذکر کرتے ہوئے افتخار عارف نے بتایا:

''عطیہ فیضی سے ان کے شدید عشق کو دیکھنا ہوتو اُن کی فارسی شاعری کو دیکھیے۔ عشق سے متعلق ایسی بے باکانہ گفتگو کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔'' انہوں نے یہ بھی کہا:

''شبلی کا اہم ترین کارنامہ وہ کتابیں ہیں جو انہوں نے تاریخِ اسلام سے متعلق تصنیف کی ہیں۔ دوسری طرف حالی کی غزل کو دیکھیے۔ کیا کمال کی غزل ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ شاعری کی تاریخ میں اپنی غزل ہی کی وجہ سے یادر کھے جائیں گے۔''

●

اجلاس ختم ہوتے ہوتے لنچ کا وقت ہوگیا۔ مجھے اور قاضی صاحب کو دو بجے میٹرو چینل کی ریکارڈنگ کے لیے پہنچنا تھا۔ چینل والوں کی گاڑی آرٹس کاؤنسل ہمیں لینے آگئی تھی۔ شوہر کی مقالہ خوانی کے دوران جو کچھ ہوا تھا اس سے برہم اور آزردہ ہو جانے والی بھابھی کا موڈ اب ٹھیک ہو چکا تھا۔ وہ بار بار ہم سے چلنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ ہم فراست کو وہیں چھوڑ کر بھابھی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کا سفر طے کرنے کے بعد گاڑی ڈیفنس کے علاقے میں ایک بڑے سے خوبصورت مکان کے سامنے جا کر رک گئی۔ بھابھی ہمیں بتا چکی تھیں کہ ریکارڈنگ کسی اسٹوڈیو میں نہیں بلکہ ایک صاحبہ کے گھر پر ہوگی۔ جہاں گاڑی رکی تھی یہ انہیں صاحبہ کا مکان تھا۔ ہم گاڑی سے اتر کر بھابھی کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور ایک چھوٹے سے کمرے میں جسے عارضی بیٹھک کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا، بیٹھ گئے۔ اس عارضی بیٹھک میں میز تھی، کرسیاں تھیں اور ایک طرف گجراتی وضع کا ایک جھولا پڑا تھا۔ یہاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہمیں ایک بڑے اور شاہانہ ڈرائنگ روم میں لے جایا گیا جو بہت قیمتی ساز وسامان سے آراستہ تھا اور جس میں بہت خوبصورت قالین پر بہت اعلیٰ قسم کے صوفے پڑے تھے۔ یہاں ٹی۔وی والوں کی ٹیم کے ساتھ بھارت سے گئے ہوئے سب (عبید صدیقی کے سوا) شاعر موجود تھے۔ قاضی صاحب انہیں دیکھ کر ٹھٹکے۔ انہوں نے جانا کہ بات چیت میں یہ سب بھی شامل

رہیں گے۔ ٹی۔وی والے اُن کے تیور سمجھ گئے اور ہمیں بتایا گیا کہ شاعروں سے ہماری گفتگو کا کوئی تعلق نہیں ہے، اُن کی ریکارڈنگ الگ ہوگی اور ہماری ایک ایک گھنٹے والی ریکارڈنگ الگ۔ ہم پھر باہری بیٹھک میں واپس آ گئے۔ شاعر حضرات اپنا کلام ریکارڈ کرانے کے بعد اوپر کی منزل میں چلے گئے اور صاحبِ خانہ جو ابھی تک نیچے نہیں آئی تھیں اُن کی آؤ بھگت میں لگی رہیں۔ اندر ڈرائنگ روم میں ٹی۔وی والوں نے اپنے کیمرے مناسب زاویوں سے لگائے اور بات چیت کے لیے پہلے مجھے بلایا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھا تو انہوں نے مجھے صحیح رخ سے بٹھا کر کیمرے کے زاویوں کو پھر تھوڑا بہت بدلا اور سلمان صدیقی نے جنہیں یہ انٹرویو کرنا تھا، مجھے بتایا کہ '' 'سلسلہ تکلم کا' اس گفتگو کا عنوان ہے جس کے ماتحت ہم ہندوپاک کے معروف ادیبوں سے گفتگو کرتے ہیں۔'' یہ بتا کر انہوں نے مجھ سے مختصراً میری سوانح معلوم کی، میری لکھی ہوئی کتابوں کے نام پوچھے، ان کے موضوعات کے بارے میں دریافت کیا اور پھر منجھے ہوئے انداز میں بڑی سہولت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سوالوں کے ذریعے مجھ سے بات کرنا شروع کی۔ ایک گھنٹے کی اس بات چیت میں شعروادب کے بہت سے پہلوؤں پر بات ہوئی اور میرے اصل میدان یعنی علامت نگاری کے بارے میں زیادہ گفتگو ہوئی۔ زیرِ قلم کتابوں کا ذکر آیا اور ہندوپاک کی ادبی صورتحال پر مکالمہ ہوا۔

میرے بعد قاضی افضال صاحب اندر گئے اور اُن سے بھی طویل گفتگو ہوئی۔ قاضی صاحب کے اندر جانے کے بعد اوپر کی منزل سے گول چہرے اور سفید ڈاڑھی والے سانولے رنگ کے ایک صاحب نیچے اترے۔ نیچے اترتے اترتے میں نے انہیں پہچان لیا۔ یہ محمود شام تھے جو کشور ناہید اور دوسروں کے ساتھ میرے شعبے میں آ چکے تھے۔ تقریر بھی کی تھی، کلام بھی پڑھا تھا، داد بھی حاصل کی تھی۔ لیکن محمود شام مجھے فوراً نہیں پہچان سکے۔ بھابھی نے تعارف کرایا تو اُنہیں سب یاد آیا۔ وہ گجراتی وضع کے جھولے پر بیٹھے ہلکے ہلکے پینگ لیتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ بڑی دیر بعد خاتونِ خانہ اُن شاعروں کے ساتھ جن کی مدارات میں وہ مصروف تھیں، نیچے اتر کر یوں ہمارے سامنے آئیں:

ع زیور سے جیسے ہوتی ہے آراستہ دلہن

سلیقے سے شانہ کیے ہوئے تا بہ کمر لمبے سیاہ بال۔ دونوں آنکھوں میں سرمے کی باریک لکیریں کھنچی ہوئی۔ ہونٹوں پر پوشاک سے میل کھاتی ہوئی خوش رنگ لپ اسٹک۔ اچھے رنگ کا شلوار سوٹ، کانوں میں سونے کے اچھی ڈیزائن والے آویزے اور گلے میں زریں ہار۔ قد ان کا میانہ، رنگ کھلتا ہوا، صورت وہ جس پر نگاہ ٹھہرے۔ بھابھی نے اُن سے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''اور یہ ہیں سیمن سیف۔ بہت اچھی شاعرہ۔'' اور تب میں نے جانا کہ وہ شاعروں پر اتنی مہربان کیوں تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا اور پھر اُن شاعروں کو جن کے ہاتھوں میں ان کے دیے ہوئے تحائف تھے رخصت کرنے چلی گئیں۔ واپس آکر وہ کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھیں پھر انہیں ہماری خاطر کا خیال آیا۔ پھر وہ اوپر گئیں اور نیچے آکر اپنا تازہ شعری مجموعہ 'مجھے تنہا ہی رہنے دو' ہمیں یہ کہہ کر دیا کہ اسے پڑھیے گا ضرور۔ میں نے اُس دوران جب بھابھی اُن سے مصروفِ گفتگو تھیں بے ارادہ اس کی ورق گردانی کی تو وہ اختر شیرانی کے زمانے کی خالص رومانی شاعری معلوم ہوئی۔

ایک بڑے تاجر کی بیوی ہونے اور نکھ سکھ سے درست رہنے کے باوجود سیمن سیف سادہ لوح تھیں۔ وہ ہم سے بڑی معصومیت سے گفتگو کر رہی تھیں اور اس بات پر بڑا فخر محسوس کر رہی تھیں کہ شاعروں نے ان کی چوکھٹ پر قدم رکھا ہے۔ قاضی صاحب کی گفتگو ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے جو کچھ ہمارے سامنے رکھا تھا اسے تکلفاً چکھا اور چلنے کے لیے پہلو بدلا۔ اس پروگرام کی وجہ سے ہم آج کے دو اہم اجلاسوں میں شریک نہیں ہو سکے تھے اور اب آخری اجلاس کو جس میں ضیاء محی الدین کی پڑھت کا مظاہرہ ہونا تھا، چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ سو ہم اٹھے، محمود شام اور خاتونِ خانہ سے رخصت طلب کی اور چونکہ وہ گاڑی جو ہمیں یہاں چھوڑنے آئی تھی، شاعر حضرات کو لے کر چلی گئی تھی، اس لیے ہم سیمن سیف کی گاڑی میں بیٹھ کر آرٹس کاؤنسل آ گئے اور 'گل رنگ' پہنچ کر آج کے آخری اجلاس کا انتظار کرنے لگے۔

سحر گاہِ صوت

سورج رفتہ رفتہ ڈوب رہا ہے اور شام اپنے رخ کو روشن کر رہی ہے۔ آرٹس کاؤنسل کی چہار دیواری میں روشنیاں چمکنے لگی ہیں اور اسکے بہت بڑے صحن میں لوگ آ آ کر بیٹھنے لگے

ہیں۔ کچھ لوگ صحن سے پہلے والی کشادہ جگہ میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کرر ہے ہیں۔ فراست اُن لوگوں سے جن سے میں اب تک نہیں ملا ہوں، مجھے ملوار ہے ہیں۔ یہ محموداحمد خاں ہیں آرٹس کاؤنسل کے نائب صدر، یہ ڈاکٹر قیصر سجاد ہیں ناک، حلق، گلے اور کان کے بہت مشہور ڈاکٹر، یہ انیس جعفری ہیں آرٹس کاؤنسل کے رکن، یہ شاہد محی الدین وغیرہ وغیرہ۔ وہ سب مجھ سے بڑے تپاک سے مل رہے ہیں اور میں بھی اتنی ہی گرمجوشی دکھار ہا ہوں۔ مجمع بڑھتا جارہا ہے۔ لوگ جوق در جوق آرہے ہیں۔ احمد شاہ کبھی یہاں نظر آتے ہیں کبھی وہاں۔ بھابھی کسی مقامی شخصیت کو اپنے ساتھ لارہی ہیں اور فراست ہی کی طرح مجھے اس سے ملوارہی ہیں۔ اس ہماہمی میں احمد شاہ کی آواز گونجی:

ع جنگل میں جیسے گونجتا ہے کوئی شیرِ نر

اجلاس کے شروع ہونے کا اعلان ہوا۔ 'گل رنگ' میں صحن میں، آڈیٹوریم میں احمد شاہ کی آواز جب جب گونجتی مجھے ایسا لگتا جیسے یہ آواز یہاں کی اینٹ اینٹ میں بیٹھی ہے اور احمد شاہ نہیں بول رہے ہیں بلکہ آرٹس کاؤنسل کی چہار دیواری بول رہی ہے۔ روشنی میں نہایا ہوا آرٹس کاؤنسل کا صحن اپنے مہمانوں کے نورانی چہروں کے ساتھ اور بھی نورفشاں ہوگیا ہے۔ میں، فراست، بھابھی اور شعیب پچھلی صفوں میں ایک ساتھ بیٹھے ہیں۔

ضیا محی الدین اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں۔ ارشد محمود اُس شخصیت کا جو محتاجِ تعارف نہیں ہے، تعارف کرار ہے ہیں۔ ضیا صاحب نے اُن متون کو اپنے سامنے رکھ لیا ہے جنہیں وہ پڑھنے والے ہیں۔ ان کے الفاظ اُن کی سحر گاہِ صوت سے نکل کر ہم تک پہنچنے لگے ہیں۔ سامعین ہمہ تن گوش ہیں۔ وہ فسانۂ عجائب اور میر باقر علی کی داستان کے اقتباسات پڑھ رہے ہیں۔ میرا جی اور عشرت آفریں کی نظموں کی قرأت کرر ہے ہیں۔ ان سب کو پڑھنے اور سنانے کے بعد انہوں نے مشتاق احمد یوسفی کی تحریر کی پڑھت شروع کی ہے۔ ساعتیں ان کی ضیاباریوں سے منور ہورہی ہیں۔ پورا صحن قہقہوں سے گونج رہا ہے۔

ضیاء محی الدین اپنی قرأتوں کا جادو جگا کر فاتحانہ انداز میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے ہیں اور اب احمد شاہ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ ضیاء محی الدین کی ثناخوانی کرر ہے ہیں، کہہ رہے

ہیں: ''ضیاء محی الدین کی شرکت سے عالمی اردو کانفرنس کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے....''
سامعین اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے ہیں، انہوں نے دیر تک تالیاں بجا کر ضیاء محی الدین کی
قرائتوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

اے فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے

رقص کرتی ہوئی روشنیوں میں سامعین سے چھلکتا ہوا آرٹس کاؤنسل کا صحن اور زیادہ
چھلکنے لگا تھا۔ احمد شاہ اختتامی اجلاس کا اعلان کر رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہاں کہاں سے کس کس
نے اس کانفرنس میں شرکت کی ہے اور کس طرح اپنی خیال افروز تحریروں اور تقریروں سے اس کی
رونق میں اضافہ کیا ہے۔ کتنی کارآمد اور مفید بحثیں ہوئی ہیں۔ کتنے بامعنی مکالمے ہوئے ہیں اور کیسی
رنگارنگ تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ وہ زحمتیں اٹھا کر یہاں آنے والے بزرگ ادیبوں کے تئیں
سراپا سپاس تھے۔ بولتے بولتے گلا بیٹھ جانے کے باوجود ان کی آواز میں وہی تب و تاب تھی اور
اسی تب و تاب کے ساتھ وہ اس اجلاس کے صدور کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دے رہے تھے۔
انتظار حسین، افتخار عارف، اسد محمد خاں، امینہ سیّد، مسعود اشعر، رضا علی عابدی، انیس اشفاق،
امجد اسلام امجد، حسینہ معین، فرہاد زیدی، سحر انصاری اور پروفیسر اعجاز احمد فاروقی۔ یہ سب ایک ایک
کر کے اسٹیج پر پہنچنے لگے اور جب صدور کی صف آراستہ ہوگئی تو اظہارِ تاثرات کا سلسلہ شروع ہوا۔
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی مینجنگ ایڈیٹر اور کراچی کی بااثر خاتون امینہ سیّد کہہ رہی تھیں:

''اس بین الاقوامی کانفرنس میں پوری اردو دنیا کی نمائندگی ہوتی ہے
اور اس نے دنیا کو بتایا ہے کہ ادبی سطح پر کراچی کی اہمیت کیا ہے۔''

انہوں نے احمد شاہ کو اپنی دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا:

''یہ ادب اور ثقافت کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ایک مستحسن
کوشش ہے۔ اس کانفرنس میں طرح طرح کے ثقافتی رنگ روشن
ہوئے ہیں اور یہ رنگ آئندہ بھی اسی طرح روشن رہیں گے۔''

رضا علی عابدی نے اپنی مقناطیسی آواز میں سامعین سے ہمکلام ہوتے ہوئے کہا:
''ایک احمد شاہ وہ تھا جس نے میر کا نگر اجاڑا اور ایک احمد شاہ نے میر کا نگر آباد کیا۔'' شاعری

میں سپاہیانہ تیور دکھانے والے یگانہ چنگیزی اور احمد شاہ کے درمیان دیوانگی کے عنصر کو مشترک قرار دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''یہ دونوں دیوانے ہیں اور دیوانگی کے بغیر کوئی بڑا کام انجام نہیں پاتا۔''

اور جب میرا نام لیا گیا تو میں نے سامعین کو ایک خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا: ''صاحبو! آرٹس کاؤنسل کی اس چہار دیواری میں ایک جن ہے۔'' یہ کہہ کر میں رُکا۔ سامعین چونکے اور تب میں نے اُنہیں بتایا: ''اور اس جن کا نام ہے احمد شاہ۔'' مائک پر آتے آتے میں نے ایک شعر احمد شاہ کے لیے کہہ لیا تھا مگر دورانِ تقریر اسے بھول گیا اس لیے پڑھ نہیں سکا۔ شعر یہ تھا:

پلک جھپکتے میں کر ڈالتا ہے سارے کام
یہ آدمی تو نہیں کوئی جن ہے احمد شاہ

احمد شاہ پہلے دن سے جس برق روی اور خوش انتظامی کے ساتھ اس کانفرنس کے امور کو انجام دے رہے تھے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کتنے کار آگاہ اور کار آزمودہ ہیں۔ پوری کانفرنس میں ان کا حال یہ تھا:

ع ٹھہریں کہاں قرار کہاں لیں تھمیں کدھر

مہمانوں کی مدارات، مدعوئین کی ضیافت، شرکاء کا خیال، اجلاسوں کی نظامت، فنکاروں کی پذیرائی، رضاکاروں کو ہدایتیں، عہدہ داروں سے مشورے۔۔۔ان کے دائرۂ عمل میں سب کچھ شامل تھا اور سب کچھ حسنِ عمل کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ایسے میں اگر ان سے کوئی جارحانہ عمل سرزد ہو جائے تو اسے کارگاہِ نظم و عمل کا لازمہ جان کر دل میلا نہیں کرنا چاہیے۔

میں نے سامعین کو بتایا:

''میں نے بہت سی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے لیکن ایسا ہجوم، ایسا جوش، ایسا نظم و ضبط اور ایسی گہما گہمی کہیں نہیں دیکھی اور یہ بھی نہیں دیکھا کہ دنیائے شعر و ادب کی ایسی جید اور قد آور شخصیتیں ایک ساتھ اس طرح ایک جگہ پر جمع ہوئی ہوں۔''

اوروں کی طرح میں نے بھی احمد شاہ کو میدان فتح کرنے کی مبارک باد دی اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

میری ہی طرح مسعود اشعر بھی احمد شاہ کے لیے سراپا تحسین تھے۔ انہوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ دیا کہ ''لاہور میں بھی ادبی کانفرنسیں ہوتی ہیں لیکن وہاں یہ ہجوم اور یہ جوش نظر نہیں آتا۔ یہ کانفرنس دوستوں اور بیرونِ ملک سے آنے والے ادیبوں سے ملنے کا وسیلہ بھی ہے۔'' جذبات سے مغلوب آواز میں انہوں نے کہا کہ ''میں یہاں سے خوش گوار یادیں لے کر جارہا ہوں۔''

شعر کو ایک نئی قرأت کے ساتھ پڑھنے اور بالکل نئی طرح سے شعر کہنے والے اس عہد کے سب سے نمایاں اور نامور شاعر افتخار عارف کا اندازِ تکلّم سب سے الگ ہے۔ وہ بہت نرم لہجے میں چنے ہوئے لفظوں کے ساتھ اپنی بات کہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے شاد پیرو میر نے کہا تھا:

ع فصیح کیوں نہ ہوں ہم اہلِ لکھنؤ اے شادؔ

میں نے ان چار دنوں میں جب جب انہیں سنا تب تب یہ سوچ کر خوش ہوا کہ لکھنؤ کا لہجہ ان کے لبوں پر اُسی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اِسی تابندہ لہجے میں وہ احمد شاہ کو تہنیت پیش کرتے ہوئے کہہ رہے تھے:

> ''اس کانفرنس میں لوگوں کا ذوق و شوق دیدنی تھا۔ جو کام یونیورسٹیوں اور سرکاری اداروں کو کرنا چاہیے تھا وہ آرٹس کاؤنسل نے کر دکھایا۔ احمد شاہ نے اس نوع کے اجتماعات کی لائقِ تحسین پہل کی ہے۔ دوسرے افراد اور اداروں کو اس کی تقلید کرنا چاہیے۔ یہ ایک مثالی قدم ہے۔''

اور اب وہ شخص اپنی جگہ پر کھڑا ہوا:

ع حاصل ہیں سینکڑوں شرف جس آفتاب کو

سامعین جس کے لیے سراپا انتظار تھے۔ یہ وہ تھا جو کہانی میں کہانی کو واپس لایا۔ جس کے حرف کا نقش ورقِ افسانہ پر دیر تک روشن رہے گا۔ جس کا بولا ہوا لفظ روشنی دینے لگتا ہے۔ جو اپنی

کہانیوں کے طلسم میں دنیا کے طلسموں کی سیر کراتا ہے۔ وہ شخص اٹھا اور سامنے بیٹھے ہوئے سامعین سے گویا ہوا:

''جس سال احمد شاہ نے اس کانفرنس کا ڈول ڈالا تھا، کراچی کے حالات بہت سنگین تھے، اس بار بھی صورتحال ویسی ہی تھی لیکن کانفرنس کی زینت و رونق میں کوئی کمی نہیں تھی۔ یقیناً یہ ایک یادگار کانفرنس تھی اور اس کی گونج سال بھر تک سنائی دے گی۔ تنوع اور رنگارنگی کے اعتبار سے یہ پہلے والی کانفرنسوں سے کئی قدم آگے تھی کہ اس میں ادب اور ثقافت کے نئے رخوں کو روشن کیا گیا۔''

قلمروِ افسانہ کے فرماں روا انتظار حسین نے یہ اور اس سے زیادہ باتیں کہہ کر سلسلۂ کلام کو ختم کیا تو احمد شاہ ایک پرچہ لے کر اٹھے اور مشوروں اور مطالبوں کی شکل میں اُن قرار دادوں کو پڑھنا شروع کیا جن پر اجلاس عام کو صاد کرنا تھا۔ حکومت کو پیش کی جانے والی یہ قرار دادیں کچھ اس طرح تھیں:

پاکستان کی ساری زبانوں میں ابتدائی تعلیم کی سہولت فراہم کی جائے۔ ☆ جو ادارے معطّل ہیں انہیں فعال بنانے کے لیے اُن میں لائق اور کارآزمودہ افراد کا تقرر کیا جائے ☆ شہر کی ایک بڑی شاہراہ کو شارعِ اردو کے نام سے منسوب کیا جائے۔ ☆ ادیبوں اور فنکاروں کے مابین مکالموں کا اہتمام کیا جائے اور ان کے تصنیفات کے تراجم کرائے جائیں۔ ☆ دوسری زبانوں میں لکھی ہوئی مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے صوبائی سطح پر دارالتراجم قائم کیے جائیں۔ ☆ ہندو پاک کے درمیان ترسیلِ کتب کا نظام اور بہتر بنانے کے لیے ڈاک خرچ کم کیا جائے۔ ☆ دونوں ملکوں کے مابین ویزا کی فراہمی کو آسان کیا جائے اور یہ ویزا پولیس رپورٹنگ سے مستثنٰی ہو۔ ☆ نوجوانوں کو تہذیبی اور ثقافتی اقدار سے روشناس کرانے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں۔

جب یہ قرار دادیں پیش کی جارہی تھیں، میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ قرار دادیں تو بڑی شد ومد کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں لیکن جب حکومت کے حضور پہنچتی ہیں تو سردخانے میں ڈال

دی جاتی ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر میں نے سوچا کہ احمد شاہ جیسے جری، فعال اور طرار منتظم جہاں ہوں وہاں سرد خانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا، وہ حکومت سے ان قراردادوں پر عمل درآمد کرا کر ہی چھوڑیں گے۔

سامعین نے ان قراردادوں کو بیک زبان منظور کیا۔ قراردادیں پڑھنے اور انہیں منظور کرانے کے بعد احمد شاہ نے کہنا شروع کیا: ''چار دن کی اس کانفرنس میں جن جن لوگوں نے قلمے، قدمے اور شخنے اپنا تعاون دیا ہے ان کا شکریہ۔'' ان کی آواز کبھی گلوگیر ہوتی کبھی کڑ کنے لگتی۔ انہیں کانفرنس کی اتنی شاندار کامیابی کی امید نہیں تھی۔ وہ لوگوں کے خلوص، اُن کے اشتیاق اور اُن کے جوش کی مدح سرائی کر رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں:

> ''اس سے ہمارا حوصلہ بڑھا ہے اور ہمیں ایک نئی طاقت کے ساتھ کام کرنے کی تحریک ملی ہے۔ آئندہ انشاء اللہ اس سے زیادہ شاندار کانفرنس ہوگی اور آپ سب اس میں اسی ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوں گے۔''

اور اب شربتی آنکھوں، اچھے ناک نقشے اور گورے رنگ والے ایک شخص نے مائک سنبھالا۔ یہ تھے آرٹس کاؤنسل کے صدر پروفیسر اعجاز احمد فاروقی جو بہت نرم اور آہستہ لہجے میں کانفرنس کی ان آخری ساعتوں میں اپنے الوداعی کلمات اس طرح ادا کر رہے تھے:

> ''حاضرین! یہ کامیاب کانفرنس احمد شاہ کی مساعیِ جمیلہ کا ثمرہ ہے۔ ہم سب نے بڑی کاوشوں سے چار دن کی اس محفل کو آراستہ کیا۔ چار دن تک ہم ایک جگہ جمع رہے۔ بحثیں کیں، گلے ملے، رقص دیکھا، موسیقی سنی،''۔۔ یہ کہتے کہتے ان کی آواز گلوگیر ہوگئی...... لیکن آج.... یہ رونقیں رخصت ہو رہی ہیں، یہ محفل برہم ہو رہی ہے، ہم بچھڑ رہے ہیں، لیکن انشاء اللہ ہم پھر ملیں گے۔ یہ رونقیں پھر لوٹیں گی، یہ انجمن آرائی پھر ہوگی۔ آپ سب کا شکریہ کہ آپ نے چار دن تک آرٹس کاؤنسل کی اس چہار دیواری کو آباد رکھا۔''

پروفیسر اعجاز فاروقی کے اس کلمۂ تشکر کے بعد ہم اپنی کرسیوں سے جیسے ہی اٹھے، احمد شاہ لپکتے ہوئے ہماری طرف آئے اور ہمیں اسٹیج سے نیچے اترنے سے روکا۔ پھر مائک کی طرف گئے اور کہا: ''کانفرنس کی یہ زبردست کامیابی ہمارے اُن رضا کاروں کی بدولت ہے جو بے لوث و بے غرض رات دن کام کرتے رہے ہیں۔ یہ مختلف اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ہیں اور یہ سب سے زیادہ شکریے کے مستحق ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مہمانوں کے ساتھ ان کی ایک اجتماعی تصویر اتاری جائے۔'' سو ہم سب نے ان بہت سے رضا کاروں کے ساتھ تصویر کھنچوائی اور اسٹیج سے نیچے اتر آئے۔

روشنیوں سے بھرے ہوئے آرٹس کاؤنسل کے اس وسیع احاطے میں بھری ہوئی بھیڑ دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے، آئندہ ملنے کے وعدے لے رہے تھے، تصویریں کھنچوائی جا رہی تھیں، تعارف ناموں کے تبادلے ہو رہے تھے۔ سیماب صفت فراست کبھی اِدھر جا رہے تھے کبھی اُدھر۔ کبھی اس سے مل رہے تھے کبھی اُس سے۔ رضا کار ہم سب سے 'گل رنگ' کی طرف چلنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ سب سے ملتے ملاتے ہم 'گل رنگ' میں آئے۔ احمد شاہ اُن لوگوں سے جنہیں آج چلا جانا تھا بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہو رہے تھے اور کامیابی کے ساتھ کانفرنس کے اختتام پذیر ہونے پر مبارکبادیں قبول کر رہے تھے۔ شادمانی کے اس ماحول میں ہمیں کچھ باتوں کا رنج بھی تھا: جمیل الدین عالی کا نام کانفرنس کے شرکاء میں شامل تھا لیکن وہ نہیں آئے، جمیل جالبی، اسلم فرخی اور شمیم حنفی بھی اپنی علالت کی وجہ سے نہیں آسکے۔ آتے تو کانفرنس کی رونق میں اضافہ ہوتا۔ انور سجاد کو بہت پہلے دہلی میں دیکھا تھا۔ دعوت نامے میں ان کا نام دیکھ کر جی خوش ہوا لیکن یہاں وہ موجود نہیں تھے۔ حسن منظر کے افسانے پڑھ کر ان سے ملنے کا اشتیاق تھا، ناول اور افسانے والی نشست میں وہ نہیں تھے، ہوتے تو اچھا لگتا۔

'گل رنگ' میں اس وقت صحافی بھی تھے ادیب بھی، انتظام کار بھی تھے آرٹس کاؤنسل کے عہدہ دار بھی۔ میں ان مہمانوں کو جو میرے ساتھ نہیں ٹھہرے تھے، گلے مل کر رخصت کر رہا تھا۔ بہت سے وہ لوگ جو لکھنؤ کے تھے یا لکھنؤ میں کبھی رہ چکے تھے، مجھ سے کہہ رہے تھے نیرّ صاحب (نیر مسعود) کو سلام کہیۓ گا، عابد سہیل کو پوچھ دیجیے گا۔ یہ کتاب اگر

آپ لے جاسکیں تو راجہ صاحب (راجہ محمود آباد) کو دے دیجیے گا۔ فرنگی محل کی طرف جانا ہو اور متین میاں سے ملاقات ہو تو میرا اسلام کہیں۔ لکھنؤ بہت یاد آتا ہے۔ اگر کچھ دن اور رکیں تو ایک وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ میں ایک طشتری میں میٹھی کوفتیوں والے چاول لے کر ایک کونے میں آ کھڑا ہوا ہوں اور سوچ رہا ہوں: ''ہم سب اُن پرندوں کی طرح ہیں جو اپنے آشیانوں پر لوٹ آنے کے لیے اڑانیں بھرتے ہیں۔ 'گل رنگ' میں یہ ہمارا آخری آب و دانہ ہے۔ کل یا اُس کے بعد ہم پھر اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ جائیں گے۔'' باقی کا ایک شعر رہ رہ کر میرے دماغ میں گونج رہا تھا:

ہمیں لپکتی ہوا پر سوار لے آئی
کوئی تو موج تھی دریا کے پار لے آئی

اور وہ موجِ محبت جو ہمیں اس پار لے آئی تھی، یہاں آ کر اس کی طغیانی بڑھ گئی ہے۔ کراچی والوں کی عنائتیں، نوازشیں، تپاک، دلداری۔ اس شہر میں ہمیں سب کچھ ملا اور خوب ملا۔ ہم یہاں سے جائیں گے تو یہ سب ہمیں بہت یاد آئیں گے۔

کھانا ختم ہو چکا ہے۔ 'گل رنگ' سے لوگ باہر نکل رہے ہیں۔ انتظار حسین، افتخار عارف، عبداللہ حسین، مسعود اشعر، رضا علی عابدی، سحر انصاری اور دوسرے اور بہت سے لوگ ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے رخصت ہو رہے ہیں۔ انور شعور لڑکھڑا رہے ہیں:

ع آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے

کرسی سے اٹھتے ہیں پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ نامہ نگار 'گل رنگ' سے نکلتے وقت مجھ سے پوچھ رہے ہیں: آپ ابھی ہیں؟ کہاں ٹھہریں گے؟ کچھ دیر آپ کے ساتھ بیٹھنا ہے۔ بھابھی اور فراست اپنے گھر جا رہے ہیں۔ اشفاق حسین کچھ لوگوں کے ساتھ تصویر کھنچوا رہے ہیں۔ میں آرٹس کاؤنسل کے دروازے تک آ گیا ہوں۔ کچھ نوجوان بڑے اشتیاق سے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں: ''آپ کی باتیں بہت اچھی لگیں۔'' قاضی افضال اس وقت ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ وہ ٹی۔ وی والے انٹرویو کے بعد اپنے عزیزوں سے ملنے چلے گئے ہیں۔ میں اپنے ہوٹل آ گیا ہوں۔ کچھ دیر بعد قاضی صاحب بھی آ گئے ہیں اور آتے ہی اپنا سامان باندھنے

لگے ہیں۔ یہی کام عبید اپنے کمرے میں کر رہے ہیں۔ ان دونوں کو سورج نکلنے سے پہلے اس ہوٹل سے نکل جانا ہے۔

صبح کی اذان سے پہلے دروازے پر دستک ہوئی۔ قاضی صاحب اپنا سوٹ کیس اٹھا کر بہت آہستہ سے کمرے کے باہر نکل گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ ان کے نکلتے وقت میں جاگ رہا تھا یا سو یا رہا۔ جب صبح ہوئی اور سورج پوری طرح نکل آیا تو میری آنکھ کھلی۔ میں نے چائے منگوائی، کھڑکی کے پردے کھینچے۔ ہوٹل کی دیواروں پر اتری ہوئی دھوپ نہ معلوم کیوں مجھے آج زیادہ زرد نظر آ رہی تھی۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔ مجھے بھی سمندر کنارے کا یہ ہوٹل آج چھوڑ دینا ہے۔ کل ناشتے پر انتظار صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ بھائی وہ میری کتاب (اپنی دانست میں) کی ایک ہی کاپی بچی ہے، لے لو ورنہ کوئی اور اُچک لے گا۔ میں نے جلدی جلدی سامان سمیٹا۔ کتابیں بہت ہوگئی تھیں، ان سب کو جگہ بنا بنا کر سوٹ کیسوں میں ٹھونسا اور ناشتہ کرنے سے پہلے انتظار صاحب کے کمرے پر دستک دی۔ انہیں بھی آج دن کی کسی پرواز سے لاہور جانا تھا، اس لیے وہ بھی اپنا سامان باندھ رہے تھے اور مسعود اشعر اس میں ان کی مدد کر رہے تھے۔ انتظار صاحب نے مجھے دیکھا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے میری آمد کا مطلب سمجھ کر میز پر سے کتاب اٹھائی، اس پر میرا نام لکھا اور مجھے مرحمت فرمائی۔ پھر مجھ سے کہا: ''نیر صاحب کو پوچھ دیجیے گا۔'' پھر پوچھا: ''آپ تو ابھی رکیں گے۔''

''جی۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، انہیں اور مسعود اشعر کو سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی شعیب کا فون آیا: ''تیار ہو''؟

''بس ناشتہ کرنا ہے۔ تم آؤ۔'' وہ آج مجھے ہوٹل سے اپنے گھر لے جائے گا۔

کمرے پر آ کر میں تیار ہوا۔ ناشتہ کرنے کے لیے نیچے ڈائننگ ہال میں آیا۔ ہال میں جانے سے پہلے میں نے ہوٹل کے عقبی حصے کا ایک چکر لگایا۔ پھولوں کو دیکھا، اور اُن پر جا بجا گہر ہائے آبدار کو، روشوں پر نگاہ ڈالی، ان جہازوں کو دیکھا جو بہت دور سمندر کے پانی میں لنگر انداز تھے۔ اُن اونچے درختوں کو دیکھا جن کی شاخوں سے برگہائے خزاں رسیدہ

رخصت ہو رہے تھے۔ اس گیاہِ سبز کو دیکھا جو دہانِ بحر کے بوسے لے رہی تھی اور اُس خیمۂ فلک کو دیکھا جو دور تک چوبوں کے بغیر سمندر کے سینے پر تنا ہوا تھا۔ پھر ہال میں واپس آ کر ناشتہ کیا۔ یہاں لاہور سے آنے والے وہ نوجوان موجود تھے جنھیں آج یا کل جانا تھا۔ اُن سے ملے، باتیں کیں، دوبارہ ملنے کی خواہش کی۔ اسی بیچ شعیب کا فون آیا کہ ہوٹل کے صحن میں اس کی گاڑی آ چکی ہے۔ میں اپنا بندھا ہوا سامان ہوٹل کے معاون کے ساتھ نیچے لایا۔ چک آؤٹ کے وقت کاؤنٹر پر دو نوعمر لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک نے رجسٹر میری طرف بڑھا کر رخصت والے خانے میں میرے دستخط کرائے۔ میں نے اس لڑکی سے پوچھا:

''وہ کاظمی......''

''آج اُن کی رات کی ڈیوٹی ہے۔''

''جب آئے تو کہیے گا لکھنؤ والے نے سلام کہا ہے۔''

میرا سامان گاڑی میں رکھا جا رہا تھا اور میری آنکھیں اُن خوبصورت خاتون کو ڈھونڈ رہی تھیں جو ہر صبح سیاہ سوٹ میں ملبوس ہوٹل کے عملے کو ہدایتیں دیتے ہوئے نظر آ جاتی تھیں۔ لیکن آج وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں شعیب کی گاڑی میں بیٹھا اور اُن خاتون کو دیکھے بغیر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

حیدر ولا

شعیب نے اپنے گھر 'حیدر ولا' (عسکری۔۴) میں لا کر اس کی اوپری منزل کے ایک بڑے اور بہت اچھے سے کمرے میں بقیہ سات دنوں تک میرے رہنے کا انتظام کر دیا۔ میں نے اپنا بندھا ہوا سامان ابھی پوری طرح کھولا بھی نہیں تھا کہ لاہور کے 'ایکسپریس' اخبار کے نامہ نگار اقبال خورشید کا فون آ گیا:

''انٹرویو کے لیے آ جاؤں؟''

''آ جائیے۔''

''کہاں قیام ہے آپ کا؟''

''عسکری۔۴۔ لیجیے ان سے پتہ سمجھ لیجیے۔'' یہ کہہ کر میں نے فون شعیب کی طرف

بڑھا دیا۔ شعیب نے انہیں پتہ سمجھا دیا۔ وقت طے ہوگیا اور اقبال خورشید صاحب اپنے فوٹوگرافر اشرف میمن کے ساتھ مقررہ وقت پر آ پہنچے۔ اقبال خورشید کی عمر تو زیادہ نہیں تھی لیکن وہ ایک منجھے ہوئے صحافی معلوم ہو رہے تھے۔ انٹرویو شروع ہونے سے قبل میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ متنازعہ سوال مجھ سے نہ پوچھیں۔ سو انہوں نے پہلے میری ادبی زندگی اور میری تصنیفات کے بارے میں سوال کیے، کراچی کے سفر اور کانفرنس کے متعلق تاثرات معلوم کیے۔ پھر عام سوالوں پر آ گئے اور ہندوپاک کے سیاسی معاملات پر خاص طرح کے سوال کرنے لگے۔ میں سیاست نا آشنا ایک ادنیٰ سا ادیب بھلا ان سوالوں پر اپنا منہ کیا کھولتا۔ میں سنبھل سنبھل کر جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ اُن کے کام کا نہیں تھا۔ ایک پختہ اور تجربہ کار صحافی کی طرح وہ مجھ سے اپنی ہی بات کہلوانا چاہ رہے تھے۔ میرے کترانے اور متنازعہ سوالوں سے بچ کر نکل جانے کے باوجود انہوں نے بہت دیر تک اپنے سوالوں کے رخ نہیں بدلے اور اس پوری گفتگو نے چھپتے وقت کون سا رخ اختیار کیا، مجھے نہیں معلوم۔ گفتگو کے دوران ان کے فوٹوگرافر نے میری اور میری تصنیفات کی تصویریں لیں اور اس کے بعد وہ دونوں یہ کہہ کر چل دیے کہ یہ انٹرویو بہت جلد شائع ہوگا۔

شعیب کے ڈرائنگ روم میں ہونے والے اس تفصیلی انٹرویو کے بعد ہم نے کھانا کھایا، آرام کیا اور سہ پہر کے بعد نارتھ ناظم آباد جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ یہاں ڈی بلاک میں رہنے والے جن صاحب سے مجھے ملنا تھا اُن سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ میرے بڑے بھائی کے ہم زلف تھے اور لکھنؤ سے چلتے وقت میرے بھائی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان سے ضرور ملوں۔ کراچی آنے کے بعد اِن صاحب کا جن کا نام صفدر رضا تھا، کئی بار فون آیا اور گھر آنے کا اصرار ہوا۔ سو آج وقت ملا تو ہم اُس طرف چل پڑے۔ عسکری۔۴ سے نکلنے کے بعد ہم نے راستے سے فراست کو لیا اور شعیب کی گاڑی نارتھ ناظم آباد کی طرف بڑھنے لگی۔ جب ہم کراچی کے بیرونی علاقے لالوکھیت سے گزرنے لگے تو شعیب نے مجھے اس کی جغرافیائی نوعیت کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ میں سنتا رہا، اطراف کے علاقوں کو دیکھتا رہا۔ لالوکھیت کا نام ہم نے بچپن سے سن رکھا تھا۔ اس علاقے سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ہم نارتھ ناظم آباد کی سرحد میں داخل ہوئے اور بلاک ڈی کے راستوں کے بارے میں شعیب اور فراست

میں بحث ہونے لگی کہ اصل مکان تک پہنچنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔ اس علاقے کے اندرونی راستوں سے گزرتے وقت فراست یہ بتانا نہیں بھول رہے تھے کہ یہاں کون کون رہتا ہے۔ اسی بتانے میں انہوں نے بتایا کہ جمیل جالبی بھی یہیں رہتے ہیں اور پوری ایک سڑک ان کے نام سے منسوب ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ سڑک ہمارے سامنے آگئی۔ اور ہم نے جمیل جالبی کے نام کا بورڈ بھی دیکھ لیا۔ یہاں سے نکل کر فراست نے دو ایک دوکانداروں سے ڈی۔۵۴ کا پتہ پوچھا۔ اور اُسی وقت صفدر رضا صاحب کا فون آیا: ''کہاں پر ہیں؟''

''فلاں گلی سے نکل کر فلاں راستے پر۔'' فراست نے کہا۔

''چلتے چلے آیئے۔ میں آپ کو مکان کے باہر کھڑا مل جاؤں گا۔''

''کس رنگ کی گاڑی ہے؟''

''فلاں رنگ کی۔ نمبر یہ ہے۔''

ذرا سی دیر بعد صفدر صاحب ہمیں اپنے مکان کے باہر کھڑے نظر آ گئے۔ ہم ان کے مکان میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنے بڑے سے سبزہ زار پر ہمارے بیٹھنے کا اہتمام کیا تھا۔ ہم وہاں بیٹھے تو ناشتے کی چیزیں لائی گئیں اور ایک کشتی میں روح افزا کا شربت دیکھ کر روح میری تازہ ہوگئی کہ ہم لکھنؤ میں گرمیوں کی سہ پہر میں یہی شربت پیتے ہیں۔ صفدر صاحب نے اپنی بیوی کی بہن اور بچوں کی خیریت معلوم کی، پھر اپنے عزیزوں کے بارے میں پوچھا۔ مجھے جتنا معلوم تھا میں نے بتایا۔ ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اذان سنتے ہی صفدر صاحب نے مجھ سے ایک غیر متوقع سوال کیا:

''کیا ہندستان میں بھی اسی طرح اذان ہوتی ہے؟''

''کیوں؟ کیا وہاں مسلمان نہیں رہتے؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے خود اُن سے سوال کر لیا۔ وہ کچھ خفیف ہوئے تو میں نے کہا: ''وہاں اذان بھی ہوتی ہے اور نماز بھی۔''

یہ کہہ کر میں نے سوچا جب سالوں برسوں بعد ہم ایک دوسرے کی زمین کو دیکھیں گے تو بے خبری کا یہی عالم رہے گا۔ کچھ دیر بعد میں ان کی بیوی گلناز سے جنہیں میں نے لکھنؤ میں ان کی شادی سے پہلے دیکھا تھا، ملنے اندر گیا۔ اس وقت اُن کی صورت بہت اچھی تھی، لیکن

اِس وقت اُنہیں دیکھ کر افسوس ہوا۔ عمر اُن کی ڈھل چکی تھی اور حسن اُن کا پھیکا پڑ گیا تھا۔ انہیں دیکھ کر میرے ذہن میں فوراً احمد مشتاق کا یہ شعر آیا:

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کر اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

گلناز نے مجھے بٹھا کر اپنی بہن اور اُن کے بچوں کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اُنہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان کے گھر کا آدھا حصہ بک چکا ہے اور انہیں یہ بھی بتایا جا چکا تھا کہ آدھے بچے ہوئے حصے میں ان کی بہن اپنے دو بیٹوں اور بہوؤں کے ساتھ بڑی تکلیف سے رہ رہی ہیں۔ انہیں اپنی بیس سالہ بھانجی ثنا انجم کے مرجانے کی خبر مل چکی تھی لیکن ویزا نہ مل پانے کی وجہ سے وہ اس کی موت کے بعد والی کسی رسم میں شریک نہیں ہو سکی تھیں۔ ایک ایک کر کے سب کا حال پوچھنے کے بعد انہوں نے اپنی بھانجی کے بارے میں جسے وہ بہت عزیز رکھتی تھیں اور جس کے لیے آتے جاتوں کے ہاتھ ہمیشہ بہت سے کپڑے بھیجتی تھیں، پوچھا:

''ہوا کیا تھا اُسے؟''

''بچوں کو پڑھا رہی تھی اسکول میں، محرم کی بائیس تاریخ تھی شاید، چکر آیا، قریب کے ہسپتال میں لے جائی گئی۔ ڈاکٹروں نے جان بچانے کی پوری کوشش کی..... لیکن بچ نہیں سکی۔''

یہ سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ان کے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر میری آنکھوں میں ثنا کی موت کے منظر گھومنے لگے۔ اُس دن چکر آنے کے بعد جب اسے ہسپتال لے جایا گیا تو میرے بھائی نے بڑی گھبراہٹ کے عالم میں مجھے فون کیا۔ میں انہیں لے کر فوراً ہسپتال پہنچا۔ اس وقت ڈاکٹر ثنا کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور جب یہ کوشش ناکام ہوگئی تو انہوں نے اسے مردہ قرار دے دیا۔ بھائی میرے ڈھے گئے۔ شام کو اُس کی تدفین کے وقت ایک بار انہیں پھر غش آیا۔ وہ قبر میں اتاری گئی اپنی جوان بیٹی کی صورت دیکھ سکے نہ اسے مٹی دے سکے۔ میں نے یہ ساری باتیں گلناز کو بتائیں اور یہ بھی بتایا کہ اس کی موت کے بعد اس کی ماں شام ہوتے ہی درگاہوں اور کربلاؤں کی طرف چلی جاتی ہیں اور رات گئے واپس آتی ہیں اور کبھی کبھی پوری رات انہیں جگہوں پر گزار دیتی ہیں۔ یہ سب سن کر گلناز اور آبدیدہ ہوئیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے اپنی بیٹی کو بُلا کر مجھے اس سے ملوایا اور میں نے اس کی

صورت میں شادی سے پہلے والی اُس گلناز کو دیکھا جو بہت اچھی شکل کی تھی اور اسی اچھی شکل کی وجہ سے اسے کراچی سے آئے ہوئے اپنے ایک عزیز سے بیاہ دیا گیا تھا۔

''کچھ سامان ہے لے جاسکیں گے اپنے ساتھ۔'' گلناز نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت زیادہ تو نہیں۔''

''نہیں بہت زیادہ نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے وہ سامان مجھے دکھایا اور بتایا کہ یہ فلاں کے لیے ہے اور یہ فلاں کے لیے۔ اور پھر ایک چھوٹا سا بیگ الگ سے دیتے ہوئے کہا:

''اُس میں ایک جوڑا ہے اور کنگھی چوٹی کا کچھ سامان۔ باجی سے کہیے گا کہ ثنا کی اگلی برسی میں اسے فاتحہ کے سامان میں رکھوادیں۔ ہم زندہ رہے تو کوشش کریں گے کہ برسی میں ہم بھی شریک ہوں۔''

یہ کہہ کر پھر ان کی آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔ اُن کی بیٹی نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی۔ میں سامان لے کر چلنے لگا تو وہ بولیں: ''آپ اتنی جلدی میں آئے ہم آپ کی کچھ خاطر بھی نہیں کر سکے۔''

''کوشش کیجیے کہ آپ لوگ ثنا کی برسی میں شریک ہو جائیں، ابھی تو کافی دن ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کوشش تو پوری کریں گے۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''اب تو ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے جانے کب سانس رک جائے۔'' یہ کہہ کر بولیں:

''باجی سے کہیے گا جو کپڑے ان کے پوتوں کے لیے بھیج رہے ہیں انہیں اپنے پوتوں کو پہنا کر ان کی تصویریں بھجوائیں۔''

شام ہونے لگی تھی۔ میں گلناز سے رخصت ہو کر باہر آیا، کچھ دیر صفدر رضا صاحب سے باتیں کیں اور جب اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تو ہم لوگ وہاں سے چل پڑے۔

شعیب نے فراست کو ان کے گھر سے قریب کی جگہ پر اتارا اور ہم لوگ 'حیدر ولا' آگئے۔ میں نے کچھ دیر کمرے پر آرام کیا پھر کپڑے بدل کر نیچے اتر آیا اور شعیب کے ساتھ بیٹھ کر اپنے شہر میں ایک ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی باتیں کرنے لگا۔ کچھ مجھے یاد آتا، کچھ اسے۔ اور کچھ باتیں ہم دونوں کو ایک ساتھ یاد آتیں:

''یار وہ تمہیں یاد ہے جب ہمارے گھر کے پیچھے، تقی صاحب کے امام باڑے کے باہر والے میدان میں ہم لوگ میچ کھیل رہے تھے۔'' شعیب کو یاد آیا۔'' تمہارا سر پوری طرح منڈا ہوا تھا، کتنی تیز شاٹ والا کیچ تم نے ایک ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔''

''یاد ہے۔یاد ہے۔''

''اور تمہیں وہ یاد ہے۔'' میں نے کہا۔'' جب ہم لوگ چوک سے کیپٹل سنیما تک آٹھ منٹ میں سائیکل سے پہنچ گئے تھے۔''

''نہیں آٹھ نہیں کچھ زیادہ لگے تھے۔''

''ہوسکتا ہے کچھ زیادہ لگے ہوں۔ میرے ذہن میں آٹھ ہی بیٹھا ہوا ہے۔''

''کیپٹل سنیما ابھی موجود ہے؟''

''کیپٹل ہے۔ میفیئر، اوڈین، جے ہند اور وہ اپنا چوک والا اشوک سب ختم ہو گئے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''پرنس اور فلمستان کے نام بہت پہلے بدل گئے تھے۔ الفسٹن آنند ہو گیا۔ بہت سے نئے کھل گئے ہیں۔ اور اب تو ملٹی پلیکس کا زمانہ آ گیا ہے۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شعیب کی چھوٹی بہن انجم اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آ گئی۔ وہ بیٹھی تو شعیب نے اس سے پوچھا:

''انہیں پہچانا؟''

''انیس بھائی۔'' اسے میرے آنے کی خبر مل چکی تھی۔

وہ کچھ ہی دیر بیٹھی لیکن اس تھوڑی سی دیر میں مسجد تحسین علی خاں والے مکان کی بہت سی باتیں حافظے سے نکل نکل کر باہر آنے لگیں اور چوک والی گلی کے منہ پر واقع اس مکان کی بھی جس میں شعیب اُس سے پہلے رہتا تھا۔ شعیب کے خاندان کی رہائش یہاں ایک مکان کے اوپری حصے میں تھی۔ اس کے نیچے والے حصے میں کھانے کا ایک مشہور 'ایرانی ہوٹل' تھا۔ اسی مکان کے پہلو میں مشہور طبلہ نواز احمد جان تھرکوا کے رشتہ داروں کی رہائش تھی۔ یہاں جب شعیب کی والدہ گھر پر نہ ہوتیں تو ہم لوگ کچھ اور دوستوں کے ساتھ لوڈو کھیلتے اور وہیں سے

کمپنی باغ فٹ بال کھیلنے چلے جاتے۔ انجم کے جانے کے بعد بھی یہ باتیں ہوتی رہیں:

''وہ لا مارٹینیر والی بات یاد ہے؟''

''وہی جو ہم پیدل گئے تھے وہاں تک۔ تمہارے احسن بھائی سے یہ پوچھنے کہ کرکٹ کا سامان کہاں رکھا ہے۔ ساتھ میں مظفر بھی تھا۔ ٹانگیں درد کرنے لگی تھیں۔ بزازے سے دس میل دور تھا۔''

''تمہارے احسن بھائی حکیم صاحب عالم کے نواسے تھے؟''

''ہاں، حکیم صاحب کراچی آ گئے تو یہ لوگ سامنے افضل محل کے اوپر کے حصے میں کرائے پر رہنے لگے۔ یہ کہہ کر میں نے اسے بتایا:

''حکیم صاحب کی چھوٹی بیٹی، بڑی کا وہیں انتقال ہو گیا، یہیں کراچی میں ہیں، کل پرسوں میں ان سے ملنے جانا ہے۔''

احسن بھائی کے بڑے بھائی ہمایوں.........؟

''اُن کا انتقال ہو گیا۔ دل کی بیماری میں۔ دونوں بھائی کالج کے ہوسٹل میں رہتے تھے۔''

''یار وہ فٹ پاتھ پر کرکٹ کھیلنے کا بھی اپنا مزہ تھا۔''

''لیکن اب سڑک ہی سڑک ہے۔ فٹ پاتھ غائب ہو چکی ہے۔''

''ان دنوں ہم شیعہ کالج کے برابر، دولہا صاحب کے ہوٹل میں کمنٹری سنا کرتے تھے۔''

''بہت بدمزاج تھے۔''

''لیکن کرکٹ کے بہت شوقین تھے۔''

''جب پاکستان سے میچ ہوتا تو کیسے ریڈیو سے لگ کر سنتے تھے کمنٹری۔''

''ہاں، اور وہ تم نے اڑادی تھی کہ امتیاز وکٹ کیپر کے ایکشن کو دیکھنے کے لیے لندن میں کیمرے لگا دیے جاتے تھے۔''

''اڑا کیا دی۔ کسی نے ہم سے کہا، ہم نے یقین کر لیا۔''

''ایک فضل محمود تھے، پاکستانی ٹیم میں، فاسٹ بالر۔''

''بہت غصیلے تھے۔''

''بھائی بتاتے تھے کہ امتیاز وکٹ کیپر شاعری بھی کرتے تھے۔''

''اچھا!!''

''اماں خوب یاد آیا۔ اپنے وکٹ کیپر سیّد کرمانی کو بھی میں نے پچھلے سال ٹیلی ویژن پر ایک مسالمے میں سلام پڑھتے دیکھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ باقاعدہ مذہبی شاعری کرتے ہیں۔ اور ایک بات........'' میں نے شعیب کو بتایا۔ ''حسیب احسن، پاکستانی کھلاڑی کے بارے میں نیرّ مسعود کے چھوٹے بھائی نے بتائی۔''

''وہ کیا؟''

''وہ فارسی کے طالب علم تھے۔ پشاور یونیورسٹی میں نیرّ مسعود کے بڑے بھائی اختر مسعود کے شاگرد تھے۔''

''ریڈیو کی کمنٹری کا بھی کیا مزہ تھا۔ وِزی کی کمنٹری سننے کے لیے ہم لوگ بے چین رہا کرتے تھے۔'' یہ کہہ کر شعیب نے پوچھا: ''یہ بتاؤ دولہا صاحب زندہ ہیں؟''

''مر چکے بہت پہلے۔''

''اور وہ تمہاری گلی کے نکڑ پر جو آرا مشین تھی؟''

''زمانہ ہوا ختم ہو گئی۔''

ہم بہت دیر تک یہ باتیں کرتے رہے۔ پھر فراست ہم سے ملنے آ گئے۔ وہ ہمارے ساتھ بیٹھے تو کرکٹ سے بات لکھنؤ کے گلی کوچوں کی طرف مڑ گئی:

''یہ بتایئے وہ رشید قریشی کے کیا حال ہیں۔ وہ جو کچہری روڈ والی سڑک سے اندر کی طرف گلی گئی ہے، اسی میں رہتے تھے۔''

''ٹھیک ہیں۔ ایک رسالہ نکالتے ہیں۔ 'لاریب'۔''

''اور ہمارے بیچارے سلمان عباسی۔ بڑا افسوس ہوا اُن کا سُن کر۔''

''ہاں۔ تمہیں تو معلوم ہے۔ بہت پہلے عادت پڑ گئی تھی پینے کی۔ چھوٹی نہیں۔ اسی میں جان گئی۔''

''رہتے وہیں تھے نئے گاؤں میں؟''

''بہت زمانے تک وہیں رہے۔ پھر پیپر مِل کالونی میں ایک اچھا بڑا مکان مل گیا، وہیں رہنے لگے، اسی مکان میں انتقال ہوا۔''

''اُن کو تو ملازمت مل گئی تھی یونیورسٹی میں۔''

''فارسی کے شعبے میں لیکن نوکری ملنے کے ایک ہی سال بعد انتقال ہو گیا۔''

''اچھا وہ ہمارے شہنشاہ مرزا۔؟ رات رات بھر گھومتے تھے ان کے ساتھ۔''

''دل کے مرض میں گئے۔''

''اور بلوچ پورے والے محمد احمد خاں ادیب، امین آباد میں ان کی ٹارچ والی دکان پر روز بیٹھتے تھے ہم۔''

''ماشاءاللہ ٹھاٹھے ہیں۔ ملاقات ہو جاتی ہے جلسوں میں۔''

''سلیم عمر کے مرنے کا بڑا افسوس رہا۔ بہت وقت گزارا تھا اُن کے ساتھ۔''

''اچھے بھلے تھے۔ اچانک ایک دن چل بسے۔''

''مولوی گنج میں وہ گلی جو اندر اندر اصطبل چار باغ کی طرف جاتی ہے، عادل رشید بھی وہیں کہیں رہتے تھے، اسی گلی کے ایک مکان کے اوپری حصے میں رہتے تھے سلیم بھائی۔ ان سے تو روز ہی ملتے تھے۔''

باتیں نکلتی گئیں۔ واقعے یاد آتے گئے۔ جب رات زیادہ ہونے لگی تو فراست یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ کل 'جنگ' والے آئیں گے آپ کا انٹرویو کرنے۔ فراست کے جانے کے بعد ہم نے کھانا کھایا اور اس کے بعد بھی بہت دیر تک باتیں کیں۔ پھر ہم سونے چلے گئے۔

●

صبح میری آنکھ کھلی تو میں دھوپ کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکا۔ اس کمرے میں جہاں میں سوتا تھا، کوئی کھڑکی ایسی نہیں تھی جہاں سے آپ باہر کے منظروں کو صاف طور پر دیکھ سکیں۔ سو میں دھوپ دیکھے بغیر صبح کی چائے پینے کے لیے نیچے اتر آیا۔ شعیب کے نوکر نے مجھے اچھی سی چائے پلائی۔ چائے نوشی کے دوران میں نے پاکستانی اخبارات کا مطالعہ کیا، طرح طرح کی خبریں دیکھیں۔ آج پہلی بار میں بہت اطمینان سے اِن اخباروں کو دیکھ رہا تھا۔ انہیں دیکھتے

وقت مجھے حیرت ہوئی کہ ان میں بالی ووڈ اور وہاں کے ستاروں کی تازہ ترین خبریں ان کی تصویروں کے ساتھ تھیں۔ یہی حال ٹیلی ویژن کے چینلوں کا بھی تھا۔ بعض چینل تو صرف ہندستانی فلموں کے لیے مخصوص تھے۔ وہ سب فلمیں جو ہم ہندستان میں دیکھ چکے تھے یا ابھی حال میں دیکھ کر آئے تھے، یہاں بھی دکھائی جارہی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر میں نے سوچا: ''ساری آفت کتابوں پر ہے، وہ بھی ادبی کتابوں پر۔ ایک طرف سے دوسری طرف جانے میں انھیں زمانہ لگ جاتا ہے اور وہ بھی بہت مہنگے ڈاک خرچ پر۔'' میں عالمی کانفرنس میں پیش کی جانے والی قراردادوں میں سب سے زیادہ اُس قرارداد پر خوش ہوا تھا جس میں ڈاک خرچ کم کیے جانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

شعیب اٹھ چکا تھا لیکن صبح کی چائے سے اسے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ اپنے قویٰ کو مضبوط رکھنے کے لیے اب دودھ پینے لگا تھا۔ اس لیے اُس نے دودھ پیا اور میں نے چائے کے بعد ناشتہ کیا۔ میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ فراست کا فون آ گیا: ''آداب۔ وہ 'جنگ' والے آنا چاہتے ہیں انٹرویو کے لیے۔''

''میں ناشتہ کر چکا ہوں، ان سے کہیے آجائیں۔''

''میں بھی آرہا ہوں ان کے ساتھ۔''

''آئیے آئیے۔''

تھوڑی دیر بعد ''جنگ'' کے نامہ نگار اختر سعیدی ایک فوٹو گرافر کے ہمراہ وارد ہوئے۔ ان کے ساتھ فراست بھی تھے۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ اختر سعیدی کے پاس سوالوں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ میں نے ان سے بھی گزارش کی کہ سوال ایسے نہ پوچھیں جن سے الجھنیں پیدا ہوں۔ انہوں نے بہت اچھی طرح اپنے سوال تیار کیے تھے۔ ان سوالوں کے دائرے میں شعروادب سے متعلق ہرنوع کی گفتگو آ گئی تھی۔ انہوں نے پہلی بار میرے پاکستان آنے کے بارے میں پوچھا: ''یہ تجربہ کیسا رہا نیز یہ کہ عالمی اردو کانفرنس کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟''

میں نے کہا: ''ایسی محبتیں مجھے کہیں نہیں ملیں۔ ایسی پذیرائی بھی میری

کہیں نہیں ہوئی اور ادبی اجتماعات میں ایسا جوش و خروش بھی میں
نے کہیں نہیں دیکھا۔''

انہوں نے یہ بھی پوچھا کہ بھارت کی جامعات میں ہونے والی ادبی تحقیق کا معیار کیا ہے۔ پھر یہ کہہ کر کہ اچھی نثر ہندستان میں لکھی جارہی ہے اور اچھی شاعری پاکستان میں ہورہی ہے، مجھ سے دریافت کیا کہ عرفان صدیقی کے بعد کیا ہندستان میں بڑی شاعری ہورہی ہے؟

جب میں ان سوالوں کے جواب دے چکا تو انہوں نے ہندستان میں اردو کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے استفسار کیا کہ لکھنؤ زبان و ادب کا گہوارہ ہے، وہاں کے لوگ اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ میں نے اس سوال کا بہت گھما کر جواب دیا۔ سیدھا جواب دیتا تو لکھنؤ کے وہ لوگ معرضِ خطر میں آجاتے جنہوں نے ایک کمیٹی بنا کر ایک بڑے سرمایہ دار کے صرف سے پہلے پورے اتر پردیش میں اردو کے حقوق کی بازیابی کا نعرہ بلند کیا، پھر حکومت کے پھینکے ہوئے لقموں کو منہ میں ڈال کر اردو سے متعلق بڑے اداروں کی اُن کرسیوں پر بیٹھ گئے جن پر بیٹھنے کی پہلی شرط زبان کا بند رکھا جانا ہے۔ درس و تدریس کے پیشے سے متعلق یہ حضرات جنہیں پڑھنے پڑھانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس مہم میں پیش پیش تھے۔ لیکن حکومتِ وقت کے وزیروں نے ان کی رسیاں اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھیں سو وہ وہی کرتے رہے جو حکومت چاہتی رہی اور وہ خلق جو اردو کی شیدائی تھی کراہتی رہی۔ میں نے بے ضمیر اردو فروشوں کا نام لیے بغیر صرف اتنا کہا: ''حکومت سے ہمارا مطالبہ ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عملی طور پر دیا جائے اور اسے ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے، یہی اردو کا اصل تحفظ ہے۔''
پاکستان میں میرے ناولٹ ''دکھیارے'' کے بہت زیادہ پسند کیے جانے کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ میں پاکستان کے قارئین کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس ناولٹ کو اتنا زیادہ پسند کیا۔

پوچھا گیا ناولٹ کا محرک کیا تھا؟ میں نے کہا: ''کچھ نہیں۔ سوچا غلط زبان بہت لکھ چکے اب ٹھیک ٹھاک زبان کا ایک تجربہ کیا جائے سو ایک سیدھی سادھی کہانی لکھ ڈالی۔ لوگوں نے اس کی زبان بہت پسند کی۔ اُن کا شکریہ۔'' کچھ رثائی ادب کا بھی ذکر آگیا اور مرثیے کے

زوال کے اسباب کی بات بھی آئی۔ میں نے بتایا کہ مرثیے پر بہت کام ہو رہا ہے۔ مرثیے کہے بھی جا رہے ہیں اور مرثیے پر لکھا بھی جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان میں بھی مرثیے پر لائقِ تحسین کام ہوا ہے۔ جب انہوں نے یہ پوچھا کہ پاک۔ بھارت تعلقات کی بہتری کے لیے ادیب و شاعر کیا کردار ادا کر سکتے ہیں تو میں نے صاف صاف کہا کہ سیاست داں مصلحت سے کام لیتے ہیں، ادیب اور شاعر صاف دلی سے خیر اور صداقت کی بات کرتے ہیں۔ یہ انٹرویو دیر تک چلا۔ فوٹو گرافر نے میری بہت سی تصویریں لیں اور اختر سعیدی میرے جوابوں کا پٹارا لے کر رخصت ہو گئے۔

خانۂ دوست میں ہے دوست کی مہماں داری

آج ہمیں ارتضٰی عباس کے یہاں دن کے کھانے پر مدعو کیا گیا تھا سو ہم انٹرویو سے فرصت پا کر رضویہ کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچے تو ارتضٰی ہمارا انتظار کر رہے تھے اور ہمارے ساتھ ایک علامہ کا بھی جو ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ ہم ان کی بیٹھک میں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور کھانے کی میز پر طرح طرح کے کھانے لگائے جاتے رہے۔ سب کھانوں کے چنے جانے کے بعد بھی علامہ ہنوز ارتضٰی کے گھر سے دور تھے۔ مجھے ان کے آنے میں تاخیر پر اس لیے حیرت ہو رہی تھی کہ کھانے سے مولوی کا مقناطیسی رشتہ ہے۔ منبر پر صبر و شکر کا سارا ذکر وہ امام کے لیے کرتے ہیں، اپنے طعام کے لیے نہیں۔ خاصے انتظار کے بعد ان حضرت کا ورود ہوا۔ نام ان کا علی کرار نقوی تھا۔ ہم نے کچھ ادبی اور کچھ مذہبی باتوں کے درمیان کھانا شروع کیا۔ یہاں بھی میں نے اُنہیں قابوں کی طرف ہاتھ بڑھایا جن میں وہ کھانے تھے جنہیں میں آسانی سے کھا سکتا تھا۔ اس دسترخوان پر مجھے دوسری بار حیرت اس وقت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ مولانا علی کرار عام مولویوں کی طرح ہاتھ بڑھا بڑھا کر مقدار کا لحاظ کیے بغیر چیزیں اپنی طشتری میں نہیں رکھ رہے ہیں اور طعمِ طعم کا وہ لطف نہیں لے رہے ہیں جسے مولویانِ دین اپنا حقِ شکم جان کر اس سے کبھی دستبردار نہیں ہوتے۔ مولانا نے دوسرے مولویوں کے برخلاف حصّہ بقدرِ جثّہ پر اکتفا کی۔ بڑی محبت سے پکا ہوا بہت خوش ذائقہ کھانا کھا کر ہم نے اپنی پشت صوفے سے لگائی اور تھوڑی دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ فراست دیر سے آنے والے مولانا سے اپنے

مسلک کی مقامی سیاست کے پیچ وخم پر گفتگو فرماتے اور اس گفتگو سے اپنا دل بہلاتے رہے۔

محرم کے بس دو۔چار دن رہ گئے تھے۔رضویہ میں عزادار بہت رہتے ہیں۔ارتضیٰ کے گھر سے نکلتے ہی میں نے کئی سیاہ پوش بیبیوں کو ایک گھر سے دوسرے گھر میں جاتے دیکھا۔ یہ چہل پہل شاید استقبالِ عزا کی سرگرمیوں کا حصہ تھی۔محرم کی اسی آمد کی بنا پر آج فراست کو پی ٹی وی پر اپنے مرثیے کی ریکارڈنگ بھی کرانا تھی۔اس لیے ہم ارتضیٰ کو ساتھ لے کر فراست کی گاڑی میں یہاں سے پی ٹی وی پہنچے۔فراست نے ٹیلی ویژن سنٹر کے باہر اپنی گاڑی کھڑی کی۔ مسلح پہرہ داروں کو اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ مجھے اور ارتضیٰ کو لے کر اندر داخل ہوئے اور جب وہ اس کھڑکی پر گئے جہاں داخلے کا پروانہ دیا جاتا ہے تو کھڑکی پر بیٹھی ہوئی خاتون نے جن کے ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگی تھی، مسکرا کر انہیں دیکھا۔فراست نے ظریفانہ انداز میں ان سے کہا:

''خاکسار فراست رضوی، مقصد مرثیے کی ریکارڈنگ، پتہ گلشنِ اقبال....''

وہ خاتون پھر مسکرائیں۔''ارے ارے۔آپ کو کون نہیں جانتا۔''انہوں نے جلدی سے پروانہ فراست کے ہاتھ میں دیا۔فراست اندر داخل ہوئے اور مجھ سے اور ارتضیٰ سے یہ کہہ کر ریکارڈنگ والے اسٹوڈیو کی طرف بڑھ گئے کہ آپ لوگ اسکرپٹ ایڈیٹر ظفر اکبر کے کمرے میں بیٹھیے میں وہیں آتا ہوں۔ظفر اکبر صاحب اپنے کمرے میں نہیں تھے۔اُن کے معاون نے ہمیں بٹھایا، چائے کے لیے پوچھا اور بتایا کہ ظفر صاحب کسی ریکارڈنگ میں مصروف ہیں، آتے ہونگے۔ دیر بعد ظفر صاحب آئے۔انہوں نے خوش خبری دی کہ ہلال نقوی بھی آئے ہوئے ہیں۔ظفر صاحب نے مجھے بتایا کہ ہم نے ایک ریکارڈنگ آپ کی بھی رکھی تھی لیکن ابھی تک اس کی منظوری نہیں ملی ہے۔ پھر اس کی تصدیق کے لیے انہوں نے اپنی دراز سے وہ کاغذ نکال کر دکھایا جس پر اس ریکارڈنگ کا اندراج تھا۔ظفر اکبر مجھے یہ کاغذ دکھا ہی رہے تھے کہ ہلال نقوی، اسد جہاں (ناصر جہاں کے فرزند) اور ایک اور صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ہلال نقوی کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ دس۔گیارہ برس پہلے ٹورنٹو، کناڈا میں انیس سیمینار کے موقع پر ان سے ملاقات ہوئی تھی۔انہیں دیکھتے ہی اس وقت کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔ہم

لوگ تقی عابدی کے یہاں جنہوں نے مرثیہ کی دنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے، ٹھہرے تھے۔ اکبر حیدری مرحوم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ بڑی اچھی صحبتیں رہیں۔ اطہر رضوی، اشفاق حسین، انور جعفری کے گھروں پر دعوتیں، وہاں کے امام باڑے میں محفلِ مسالمہ، نیاگرافال اور دوسری جگہوں کی سیر۔ گوپی چند نارنگ، عطاء الحق قاسمی اور انعام الحق جاوید کے ساتھ بیٹھکیں.... سب یاد آنے لگا۔ مجھے خوشی اس بات کی بھی ہوئی کہ میں ہلال نقوی کو اپنے سامنے ٹھیک ٹھاک دیکھ رہا تھا۔ پچھلے کچھ مہینوں سے ان کی علالت کی خبریں لکھنؤ پہنچ رہی تھیں۔ نیّر مسعود جو خود بھی سخت علیل ہیں، ان کی بیماری کی خبر سُن کر رنجیدہ ہو جاتے۔ میں فراست کو جب بھی فون کرتا، ان کی خیریت ضرور معلوم کرتا اور یہ بھی کہتا کہ میری طرف سے پوچھ دینا۔ میں نے ہلال نقوی کے گھر جانے کا پروگرام بنایا تھا مگر خوش قسمتی سے وہ یہاں مل گئے اور ایسے ملے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ علیل ہیں۔ اردو مرثیے پر اپنے گرانقدر کام کے لیے ہلال ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ نام ونمود سے دور وہ بڑی تن دہی اور عرق ریزی سے مرثیے پر تحقیقی اور تنقیدی کام کر رہے ہیں۔ ان کی ضخیم کتاب ''بیسویں صدی میں اردو مرثیہ'' بہت مقبول ہوئی اور حال ہی میں (۲۰۱۳) اپنے سہ ماہی رسالے 'رثائی ادب' کا بارہ سو صفحے کا ''دوصد سالہ یادگارِ دبیر نمبر'' مرتب کر کے انہوں نے غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس علالت میں بھی وہ خوب کام کر رہے ہیں۔

ہلال نقوی نے مجھ سے لکھنؤ والوں کی خیریت معلوم کی۔ اکبر حیدری اور کاظم علی خاں کی موت پر افسوس کیا۔ نیّر بھائی کا حال تفصیل سے پوچھا۔ اسد جہاں اور دوسرے صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ اسد جہاں کو دیکھ کر مجھے ناصر جہاں یاد آ گئے جن کے نوحے اور سلام محرم کے دنوں میں گھر گھر سنے جاتے ہیں اور انہیں کی لحن میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان کی آواز میں جو گداز اور رقت آمیزی ہے وہ دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ لکھنؤ میں ضامن عباس نام کے ایک بہت خوش آواز نوحہ خواں محرم کی مجلسوں میں ان کا پڑھا ہوا کلام پڑھتے تھے۔ اُنہیں بھی سن کر لوگ بے تحاشا روتے تھے لیکن ناصر جہاں کا سا پرسوز گلا اور حزن سے لبریز لحن بھلا کوئی اور کہاں پیدا کر سکتا ہے۔ ایامِ عزا میں پرانے لکھنؤ کے بام ودر ان دونوں باپ بیٹوں کی آوازوں سے گونجنے لگتے ہیں۔ میں جس تپاک سے ہلال نقوی سے ملا اسی گرمجوشی سے میں نے اسد جہاں

کو بھی گلے سے لگایا۔ فراست نے فون کر کے اطلاع دی کہ ریکارڈنگ ختم ہو چکی ہے، آپ لوگ باہر آ جائیں۔ میں اٹھنے لگا تو بلال نقوی اور اسد جہاں نے میرے ساتھ بہت سی تصویریں کھنچوائیں۔ اس میں ظفر اکبر اور ارتضیٰ عباس بھی شامل رہے۔ میں نے ان سب سے اجازت لی اور بلال نقوی سے یہ کہہ کر کہ اگر وقت ملا تو آپ کے یہاں ضرور آؤں گا، ظفر اکبر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ٹی۔ وی سنٹر سے باہر نکل کر فراست نے ارتضیٰ کو ان کے گھر پہنچایا اور میں فراست کے ساتھ آج پہلی بار اس کے گھر آیا:

ع خانۂ دوست میں ہے دوست کی مہماں داری

گلشنِ اقبال میں واقع نعمان گارڈن کی پہلی منزل پر بنے اس فلیٹ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری نگاہ اس حصے کی طرف گئی جو فراست کی نشست گاہ بھی تھی اور کتاب خانہ بھی۔ یہاں چاروں طرف الماریوں میں کتابیں ہی کتابیں تھیں اور ایک سے ایک عمدہ کتابیں۔ میں انہیں اٹھا اٹھا کر دیکھتا اور واپس اپنی جگہ پر رکھتا رہا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد میں پاؤں پھیلانے کے لیے ان کے سونے والے کمرے میں چلا گیا اور اپنی آنکھ بند کر لی۔

صاحبانِ کمال درخانۂ جمال

آج ہمیں عذرا عباس کے یہاں رات کے کھانے پر جانا تھا، اس لیے ہم سب وہاں جانے کے لیے تیار ہوئے اور ہم سب میں سب سے اچھی طرح بھابھی تیار ہوئیں۔ کراچی کے مشہور، کشادہ اور آلودگی سے پاک علاقے ڈیفنس میں واقع عذرا عباس کا مکان فراست کے گھر سے بہت دور تھا۔ باتوں، لطیفوں اور قصوں میں وقت گزارتے ہوئے ہم بالآخر ڈیفنس کے علاقے میں داخل ہوئے۔ فراست ۔نے عذرا عباس کے مکان تک پہنچنے کا صحیح راستہ معلوم کرنے کے لیے انہیں فون کیا۔ اُدھر سے ان کے شوہر انور سن رائے کا جواب آیا: ''اب جو چوراہا آئے اس سے داہنے مڑیے آگے چل کر بائیں طرف گھومیے اور اُسی پر سیدھے چلتے چلے آئیے، میں اپنے دروازے کے باہر ہی ہوں۔'' فراست نے ویسا ہی کیا۔ کچھ دیر بعد انور سن رائے ہمیں ایک جگہ کھڑے دکھائی دیے۔ فراست نے گاڑی وہیں روک دی۔ ہم گاڑی سے اتر کر اندر داخل ہوئے تو ہماری ملاقات مٹ میلے رنگ والے اعلیٰ نسل کے لیبراڈور سے

ہوئی۔ اس نے منہ اٹھا کر ہمیں دیکھا اور سمجھ لیا کہ ہم بے ضرر لوگ صاحب خانہ کی دعوت پر یہاں آئے ہیں۔ پھر بھی وہ ہمیں سونگھنے سے باز نہ آیا۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند اور تسبیح و تحلیل میں خاصا وقت گزارنے والی نسیم نازش ٹھٹھک کر ایک طرف ہوگئیں۔ مگر میں ان موصوف کو دیکھتا اوران کے رنگ اوران کی صحت پر رشک کرتا رہا۔ اس لیب راڈور کو جس کا پکارا جانے والا نام مجھے نہیں معلوم، دیکھ کر مجھے پروفیسر قمر جہاں کا خیال آ گیا۔ جانوروں سے بے پناہ محبت کرنے والی قمر جہاں۔ زخمی جانوروں کی مرہم پٹی کرنا، آوارہ کتوں کو روز راتب دینا، بلیوں کو اپنی خواب گاہ بلکہ اپنے بستر پر دودھ اور جلیبی کھلانا، اپنی چھت پر اترنے والے جنگلی کبوتروں اور اپنے درختوں پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کو دانا کھلانا ان کا مشغلہ بھی ہے اور فریضہ بھی۔ وہ چھوٹی موٹی دعوتوں میں بچی ہوئی ہڈیوں کو اپنے رومال یا کسی کپڑے میں باندھ لینے میں کوئی شرم نہیں محسوس کرتیں۔ یہ ہڈیاں وہ راستے میں ملنے والے کتوں کو بہت پیار سے اپنے پاس بلا کر ان کے آگے ڈال دیتی ہیں اور انہیں اُس وقت تک چُمکارتی رہتی ہیں جب تک وہ اس غذائے غیبی کو ختم نہیں کر لیتے۔ وہ وائلڈ لائف ادارے کی حیاتی رکن ہیں۔ جانوروں کو دیکھتے ہی ان کی محبت اُمڈ آتی ہے۔ میں ان کے تعارف میں کہا کرتا ہوں: ''اردو کی پروفیسر، مرثیے کی حافظ، جانوروں کی محافظ۔'' میرا جی چاہا کہ میں اس لیبراڈور کو چُمکاروں، اس کی ملائم کھال پر ہاتھ پھیروں لیکن بھابھی کی آنکھیں دیکھ کر میری ہمت نہیں پڑی۔

عذرا عباس اور انور سن رائے کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوکر جس چیز نے سب سے زیادہ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ صاحبانِ خانہ کا سلیقہ اور نفاست تھی۔ اس دہرے ڈرائنگ روم کی دیواروں کا رنگ، دیواروں پر آویزاں جدید مصوری والے خوش رنگ مرقعے، چھت سے لٹکتا ہوا فانوس اور ذوقِ جمال کے آئینہ دار آرائش کے دوسرے لوازم۔ اس خانۂ خوش رنگ میں رہنے والے دو صاحبانِ علم نے اس کی فضیلت میں اور اضافہ کر دیا تھا:

ع ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ

انور و عذرا کے اس خانۂ جمال میں کچھ لوگ آ چکے تھے، کچھ لوگ آ رہے تھے۔ جب بلائے ہوئے سارے مہمان جمع ہوگئے تو چائے کا دور چلا۔ آنے والوں میں اجمل، آصف،

احمد فواد، افضال احمد سید اور ایک اور شاعر تھے۔ میں چائے کی چسکیوں کے دوران سوچ رہا تھا کہ میں اس وقت نثری نظم کے چار محکم ستونوں (افضال احمد سیّد، انور سن رائے، عذرا عباس، تنویر انجم) کے درمیان بیٹھا ہوں۔ اگر ذیشان ساحل آج اس دنیا میں ہوتا تو وہ بھی یہاں موجود ہوتا اور یوں نثری نظم کا خمسہ مکمل ہو جاتا۔ اجمل کمال اور آصف فرخی کے علم اور وسعتِ نظر کے سب قائل ہیں۔ ان دونوں نے اپنے اشاعتی اداروں سے کیا کیا جواہر پارے شائع کیے ہیں اور اپنے رسالوں میں شعروادب کے کیسے کیسے نگار خانے تیار کیے ہیں۔ لکھنؤ کا نابغہ (نیّر مسعود) ان دونوں کا مدّاح و معترف ہے۔ دونوں کے ذہن بصیرتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ دونوں کے قلم میں قوت ہے۔ ایک کم لکھتے ہیں ایک زیادہ۔ ایک بہت کم بولتے ہیں لیکن جب زبان کھولتے ہیں تو پتے کی بات کہتے ہیں۔ ایک زیادہ بولتے ہیں لیکن ان کی بیش گوئی بے بہا ہوتی ہے۔ چائے کے دوران ہم سب باتیں کر رہے تھے۔ آصف اور اجمل بھی خوب بول رہے تھے لیکن ایک دوسرے سے نہیں بول رہے تھے۔ فراست کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ اُن کی زبان پر طرح طرح کے قصے رہتے ہیں جنہیں وہ طرح طرح سے سناتے ہیں اور جب سناتے ہیں تو سننے والے قہقہے لگاتے ہیں۔

چائے کا دور ختم ہوا تو کلام خوانی کا آغاز ہوا۔ غزلیں پڑھنے والے کم تھے۔ میں نے اور فراست نے غزلیں سنائیں۔ فراست نے بلند خوانی کے ساتھ اپنے اچھے شعر پڑھ کر سماں باندھ دیا۔ شوہر نے تحت خوانی کا جوہر دکھایا تو بیوی نسیم نازش نے خوش لحنی کا جادو جگایا۔ میں نے ان کے خوش گلو ہونے کا ذکر سنا تھا لیکن آج اس کا مظاہرہ دیکھ رہا تھا۔ جب غزل پڑھنے کے لیے انہوں نے اپنا گلا ٹھیک کیا تو میں نے ان سے اُس غزل کی فرمائش کی جو مجھے بہت پسند ہے:

کسی پہ اب نگہِ انتخاب کیا رکھنا
لہو بھری ہوئی آنکھوں میں خواب کیا رکھنا
سفر کے شوق میں ہم نے گھروں کو چھوڑ دیا
اب اس کے بعد غمِ خاک و آب کیا رکھنا

انہوں نے خود کی بنائی ہوئی طرز میں بڑی خوش لحنی کے ساتھ اس غزل کو پڑھا اور ہم

سب بہت عمدہ شعروں والی اس غزل سے محظوظ ہوئے۔ یہ غزل سنانے کے بعد انہوں نے ایک۔دو غزلیں اور سنائیں اور ہمارے کانوں میں اُن کی سریلی آواز بہت دیر تک گونجتی رہی۔اب شمع اُن شعرا کے سامنے تھی جو نثری نظم کے شہ سوار تھے۔سب سے پہلے احمد فواد نے اپنا کلام پڑھنا شروع کیا۔ان کی بیاض کھلی ہوئی تھی اور وہ ایک کے بعد ایک نظمیں پڑھتے جا رہے تھے۔فرمائشیں بھی ہو رہی تھیں۔لیکن فرمائشیں نہ بھی ہوتیں تب بھی وہ زود خوانی سے باز نہ آتے۔احمد فواد مجھے اُن شاعروں میں سے معلوم ہو رہے تھے جو شوق کلام خوانی میں اگر ایک بار اپنی بیاض کھول لیں تو آسانی سے بند نہیں کرتے۔ان کے اچھے کلام سے محظوظ ہونے کے باوجود اُنہیں اتنی بہت سی نظمیں سناتے دیکھ کر میری آنکھوں میں ایک مشاعرے کا یہ منظر تازہ ہو گیا:

ایک صاحب ایک مشاعرے میں اپنا کلام پڑھ رہے تھے، پڑھے جا رہے تھے۔سامعین انہیں ہوٹ کر رہے تھے لیکن ہوٹنگ کی پروا کیے بغیر وہ پڑھتے رہے۔اچانک مجمعے سے ایک صاحب لاٹھی لے کر اسٹیج پر آ گئے۔شاعر ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔لاٹھی لے کر آنے والے نے شاعر سے کہا:

''آپ پڑھیے، آپ سے ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ہم تو اسے ڈھونڈ رہے ہیں جس نے آپ کو بلایا ہے۔''

جملۂ معترضہ والا یہ لطیفہ اپنی جگہ۔ہم احمد فواد کی زود خوانی کے باوجود ان کی نئی طرح کی نظموں سے محظوظ ہوئے۔احمد فواد کے بعد ایک دوسرے صاحب نے اپنی بہت سی نظمیں سنائیں۔ پھر تنویر انجم اور عذرا عباس نے کئی بہت اچھی نظمیں سنا کر نثری نظم پر اپنی شاعرانہ سبقت کا ثبوت دیا۔ اور پھر نثری نظم کے سرخیل افضال احمد سیّد نے نظم خوانی شروع کی۔سیّد صاحب کی آواز بھاری ہے۔ نظم پڑھنے کے فن سے واقف ہیں اور اپنی پڑھت سے نظم کو اور پر اثر بنا دیتے ہیں۔غزلیں کم کہتے ہیں لیکن جو غزلیں کہی ہیں، مشکل زمینوں میں ہیں۔اچھی ترکیبیں استعمال کرنے کی ترکیب سے واقف ہیں۔غزلوں پر فارسیت کا غلبہ ہے۔سیّد صاحب جب اپنی نظموں اور غزلوں کی دھاک بٹھا چکے تو انور سن رائے سے ان کی عذر خواہی کے باوجود نظم خوانی کا اصرار کیا گیا۔اچھی نظمیں کہنے کے باوجود نہ معلوم کیوں وہ اُنہیں سنانے سے کتراتے ہیں۔ یہاں بھی انہوں نے میزبانی کا بہانہ بنا کر کترانا شروع کر دیا اور ہم ان کی بہت اچھی نظمیں نہیں سن سکے۔

اس پوری نظم خوانی رشعر خوانی کے دوران میں بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ عذرا عباس کا یہ شاعرانہ طرز کا مکان اردو کی اصل نثری نظم کا مسکن بن گیا ہے۔ نثری نظم کے سارے نمائندہ شاعر یہیں موجود ہیں۔ یہی تو ہیں جو نثری نظم کی ساخت کو سمجھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس نظم کے آہنگ کو عام نظم کے آہنگ سے کس طرح الگ رکھا جاتا ہے۔ جب نثری نظم پر انگلیاں اٹھنا شروع ہوئیں اور جب اسے عجزِ بیان کا نتیجہ قرار دیا گیا تو یہ خاکسار پہلا شخص تھا جس نے سب سے پہلے اس قضیے پر خلیل الرحمٰن اعظمی سے طویل گفتگو کی تھی اور اس گفتگو میں شہریار کو بھی شامل کیا تھا۔ یہ دونوں مکالمے ہندستان کے ادبی جریدوں 'جواز' اور 'شب خون' میں شائع ہو چکے ہیں۔ خلیل صاحب نے اس وقت بہت پتے کی باتیں کہی تھیں اور نثر میں شاعری کے نشانات ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ بہت دور تک چلے گئے تھے۔ انہوں نے ان ترقی پسندوں کی لاعلمی کا مذاق اڑایا تھا جو نثری نظم کا یہ کہہ کر مذاق اڑا رہے تھے کہ یہ جدیدیت کی وبا ہے۔ اس وقت شہریار نے بھی ایک بہت اچھی بات کہی تھی کہ میں پابند نظم کہہ سکتا ہوں، آزاد نظم کہہ سکتا ہوں اور کہتا ہوں لیکن کچھ تجربے ایسے ہوتے ہیں جنہیں اِن دونوں قالبوں میں نہیں ڈھالا جاسکتا۔ اس لیے اُنہیں میں نے اُس قالب میں ڈھالا جسے آپ نثری نظم کہتے ہیں۔ پھر ہر دو حضرات سے اِس نظم کے اُس آہنگ پر بات ہوئی جو پابند شاعری کے عروضی آہنگ سے بھی الگ ہو اور تخلیقی نثر کے شعری آہنگ سے بھی مختلف۔ مجھے کہنے دیجیے کہ یہ آہنگ ہندوستان میں کہی جانے والی نظموں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے اور وہ بھی کم کم۔ سو میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ سچی اور اصلی نثری نظم پاکستان میں کہی جارہی ہے۔ اور اس وقت عذرا عباس کی انجمن میں اسی نثری نظم کے چراغ روشن تھے۔ ہم ان کی لووں سے اپنی ساعتوں میں اجالا کرتے رہے۔

ہماری میزبان عذرا عباس سگریٹیں جلا جلا کر اور دھوئیں اڑا اڑا کر ہماری نظمیں غزلیں بھی سنتی رہیں، ہمارے لیے چائے بھی بناتی رہیں اور اِس وقت کی دعوت کے لوازم کے سلسلے میں ہدایتیں بھی دیتی رہیں اور خود پر چست کیے جانے والے فراست کے مزاحیہ فقروں پر فراست کو غضبناک ہو ہو کر گھورتی بھی رہیں۔ ان کے گھر کی ایک خاتون جو اس شعری محفل میں شریک نہیں تھیں، پورے گھر میں اس طرح گھوم رہی تھیں جیسے ہمارے لیے آنے والی چائے سے لے کر

کھانے کی میز پر سامانِ طعام کے سجائے جانے تک ساری ذمہ داری انہیں کی ہو۔ ان خاتون سے نہ صاحبانِ خانہ نے ہمارا تعارف کرایا نہ ہم نے اپنے میزبانوں سے پوچھا کہ وہ کون ہیں۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ ان کا نام پروین راؤ ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ ایک اچھی شاعرہ ہیں اور ہندی سے بھی واقفیت رکھتی ہیں۔

کلام خوانی ختم ہو چکی تھی۔ کھانا خانۂ خورونوش میں ایک بڑی سی میز پر لگایا جا چکا تھا۔ ہم عذرا عباس کے ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اس میز پر پہنچے تو دیکھا کہ اس پر طرح طرح کے کھانے موجود ہیں۔ کراچی آنے کے بعد آج پہلی بار میں اس گہوارۂ گوشت خوراں میں کھانے کی میز پر سبزیوں اور دالوں کو دیکھ رہا تھا لیکن ایک چیز جسے دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا وہ تھا حلیم۔ میں نے ساری قابیں چھوڑ کر اسی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے مزے لے لے کر کھایا۔ کچھ کباب بھی اپنی طشتری میں رکھ لیے۔ حلیم واقعی بہت لذیذ تھا۔ لکھنؤ اپنے لذیذ کھانوں کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ ان کھانوں میں حلیم اور کھچڑا بھی شامل ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں یہاں ہوٹلوں کے کھانوں میں نہیں ملتیں۔ یہ دراصل کھانے کی خانہ ساز قسمیں ہیں۔ محرم کی مجلسوں میں انہیں اچھی طرح پکا کر اب بھی تبرک کے طور پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اتفاق سے اس وقت کھانے کی میز پر صاحبانِ خانہ کو ملا کر بارہ لوگ تھے۔ عذرا عباس اثنا عشری مسلک کی ہیں۔ میں نے سوچا کیا سوء اتفاق ہے۔ اثنا عشری مسلک والی عذرا عباس کا گھر، مجلسوں میں تقسیم ہونے والا حلیم اور میز پر بارہ کھانے والے۔ میں نے یہ حلیم دانتوں میں تکلیف کے باوجود جی بھر کر کھایا۔ لکھنؤ میں کچھ کھانے۔ پکانے والوں کا امتحان سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے قوامی سوئیاں، چنے کا حلوہ، ارہر کی دال اور حلیم۔ ذرا سی بے پروائی سے قوامی سوئیاں اینٹھ جاتی ہیں۔ اچھی قوامی سوئیوں کے لیے ضروری ہے کہ سوئیاں قوام میں اسی وقت ڈالی جائیں جب قوام کا تار صحیح بن جائے۔ چنے کی دال کا بھرتا اگر صحیح نہیں بھنا ہے تو چنے کا حلوہ بے مزہ ہو جاتا ہے، ارہر کی دال کا بگھار ٹھیک نہیں ہوا تو اس کا ذائقہ جاتا رہتا ہے اور حلیم میں گوشت اگر اچھی طرح نہیں گھٹا ہے اور اس کی پخت صحیح آنچ پر نہیں ہوئی ہے تو وہ زبان کو اچھا نہیں لگتا۔ لیکن عذرا عباس کے مطبخ کا یہ حلیم خوب مزہ دے رہا تھا۔ لکھنؤ میں بے تکلف دعوتوں میں ایک

چیز بہت عام ہے۔ اگر کھانے میں کوئی چیز کسی کو بہت زیادہ پسند آجاتی ہے تو وہ اسے گھر کے لیے بندھوالیتا ہے۔ لیکن میں نے یہ سوچ کر ایسا نہیں کیا کہ اس طرح میں ایک کے بجائے تین کی نگاہوں میں سبک ہو جاؤں گا۔ اوّل تو عذرا عباس سوچیں گی کیسا شخص ہے کھاتا بھی ہے مانگتا بھی ہے۔ دوسرے بھابھی اور فراست اِس پر ناراض ہوں گے کہ رال ٹپکا کر ہماری بھد کرادی۔ اب انہیں کون بتاتا کہ لکھنؤ والے ذائقے کے معاملے میں نیّت کے بہت کمزور ہوتے ہیں۔

عذرا عباس کے گھر میں ہم نے تین طرح کے لطف اٹھائے: بہت اچھی شاعری سنی، بہت اچھی باتیں کیں اور بہت اچھا کھانا کھایا۔ لطف اٹھانے کے اس عمل میں رات کا ایک بج گیا۔ ہم سب نے ایک ایک کر کے انور سن رائے اور عذرا عباس سے رخصت لی اور شعیب کے گھر پہنچتے پہنچتے دو بج گئے۔ اس وقت عسکری۔۴ کے ریسپشن پر بیٹھا شخص اونگھ رہا تھا۔ شعیب نے گہری نیند سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ فراست اور بھابھی مجھے پہنچا کر نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے گھر چلے گئے۔ میں نے شعیب سے کہا: ''یار معاف کرنا تمہاری نیند خراب ہوئی۔ آرام کرو، صبح ملیں گے۔''

کچھ دیر نہرِ نور میں کچھ دیر اُس سے دور

صبح میں دیر سے اٹھا، دیر سے ناشتہ کیا۔ شعیب اپنے دفتر جانے کے لیے تیار ہوئے تو میں نے انہیں بتایا: ''بھابھی اور فراست آنے والے ہیں، آج اردو بازار کی طرف جانے کا ارادہ ہے، کچھ کتابیں وغیرہ خریدنا ہیں۔'' دھوپ جب دیواروں پر اچھی طرح اتر آئی اور دن کا پہلا پہر نصف سے زیادہ گزر چکا تو میں تیار ہو کر آنے والوں کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بھابھی اور فراست آ گئے۔ چند لمحوں کے لیے ہم بیگم شعیب کے ساتھ بیٹھے پھر فراست کی گاڑی میں بیٹھ کر اردو بازار کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچ کر ہم گاڑی سے اتر گئے اور بھابھی یہ کہہ کر اپنے دفتر چلی گئیں کہ وہ دوپہر کے بعد ہم سے آکر ملیں گی۔

اردو بازار میں چاروں طرف کتابوں کی دکانیں تھیں اور اُنہیں میں بیچ بیچ میں اسٹیشنری کے سامان والی دکانیں بھی۔ اس علاقے کی پرہجوم سڑکیں اور پتلی گلیاں دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں لکھنؤ کے امین آباد کے بازار میں ہوں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور جہاں

کتابوں کی دکانوں کے ساتھ طرح طرح کی دکانیں ہیں۔ اسی امین آباد سے متصل لاٹوش روڈ والی سڑک سے ایک راستہ ماڈل ہاؤس کی طرف نکلتا ہے۔ وہیں فراست کا آبائی مکان ہے۔ جب وہ لکھنؤ میں تھا تو امین آباد اُس کا روز آنا ہوتا۔ پہلے وہ گنگا پرشاد میموریل لائبریری میں اخبار بینی اور کتاب خوانی کرتا، پھر امین آباد کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ بیٹھتا اور جب ساعتِ شب کا آغاز ہوتا تو پرانے لکھنؤ کی طرف آنکلتا۔ اردو بازار میں اردو کتابوں کی اتنی بہت سی دکانیں دیکھ کر میں نے اپنے شہر لکھنؤ پر افسوس کیا۔ اس افسوس پر یاد آیا جب انتظار حسین پہلی بار لکھنؤ آئے تھے اور جب امین آباد کے گنگا پرشاد ہال میں ان کے اعزاز میں ایک بڑا جلسہ ہوا تھا، اس وقت میرے استاد پروفیسر شبیہ الحسن نے انتظار حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ 'شہرِ افسوس' میں آئے ہیں۔ اس یادنامے کے پاکستانی قارئین کو بتادینا چاہیے کہ اس 'شہرِ افسوس' میں اردو کتابوں کی ایک ہی دکان باقی رہ گئی ہے اور اس میں بھی کتابیں اب برائے نام رہ گئی ہیں۔ اردو کتابوں والی اس تاریخی دکان کا نام 'دانش محل' ہے۔ اس کے مالک نسیم احمد صاحب بڑے نستعلیق اور وضعدار شخص تھے۔ ان کے زمانے میں اِس دکان میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ نسیم صاحب کی وضعِ قدیم کی طرح اُن کی دکان بھی قدیم طرز کی تھی۔ دوکان کے اگلے حصے میں آمنے سامنے دو صوفے پڑے ہوئے تھے اور اُن کے بیچ میں ایک میز۔ اور چاروں طرف الماریوں اور شیلفوں میں کتابیں لگی ہوئی۔ صوفوں کے بعد والے حصے میں نسیم صاحب کی میز کرسی اُس کے پیچھے پردا اور پردے کے پیچھے کتابوں کے پارسل تیار کرنے والی جگہ۔ نسیم صاحب کو دکان میں رکھی ہوئی کتابوں کی جگہیں یاد رہتیں۔ آپ نے کسی کتاب کا نام لیا اور فوراً وہ کتاب انہوں نے اس جگہ سے جہاں وہ رکھی ہے اٹھا کر آپ کے سامنے رکھ دی۔ دُکان کے اگلے حصے میں رکھے ہوئے صوفوں پر شہر کی بڑی بڑی ادبی شخصیتیں آکر بیٹھتی تھیں اور جو اہم شخصیتیں باہر سے آتیں وہ بھی ادیبوں سے ملنے اسی دکان پر آتیں۔ یہاں بیٹھنے والے ادب کے ہر موضوع پر گفتگو کرتے اور بڑی گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ نسیم صاحب اپنی دکانداری میں بھی مصروف رہتے اور اس گفتگو کو بھی سنتے رہتے۔ کبھی کبھار لقمہ دینے کی حد تک اس میں شریک بھی ہوجاتے۔

اس دکان کے علاوہ اسی امین آباد میں ''ادارۂ فروغ اردو'' نام کی بھی ایک دکان ہے۔اس دکان کے مالک مولانا شمس اپنے اصل نام کے بجائے مولانا فروغ اردو کے نام سے مشہور تھے۔لیکن یہ دکان بھی نام کو رہ گئی ہے۔مشہور ترقی پسند نقاد پروفیسر احتشام حسین کبھی 'دانش محل' میں بیٹھتے کبھی مولانا فروغ اردو کے پاس۔ایک دکان مولانا عبدالباری آسی کے بیٹے والی آسی نے 'مکتبۂ دین وادب' کے نام سے کھولی تھی جس میں نئے ادب سے متعلق کتابیں مل جاتی تھیں بالخصوص نئی شاعری کے مجموعے۔والی آسی کے انتقال کے بعد یہ دکان بھی پہلی جیسی نہیں رہی۔لیکن ایک دکان امین آباد کی حیدری مارکیٹ میں ایسی کھلی جو کھلتے ہی مشہور ہوگئی۔ یہ دکان ماہنامہ 'کتاب' کے مدیر عابد سہیل نے اپنے اشاعتی ادارے نصرت پبلشرز کے نام پر کھولی تھی۔دانش محل کی طرح اس دکان پر بھی شہر اور بیرونِ شہر کے ادیب جمع ہوتے اور تازہ چھپی ہوئی اور عنقریب چھپنے والی کتابوں پر گفتگو ہوتی، ادبی تنازعات زیرِ بحث آتے، جدیدیت اور ترقی پسندی کے مابین معرکہ آرائی ہوتی۔''دانش محل'' اور ''نصرت پبلشرز'' کے مالکوں میں فرق یہ تھا کہ عابد سہیل اپنی دکان میں ہونے والی ہر ادبی بحث میں فریق بن کر شریک ہوتے اور نسیم صاحب اپنے یہاں کی گفتگو میں مہر بہ لب رہتے۔کئی برس کامیابی سے چلنے کے بعد عابد سہیل کو اپنی دکان بہ وجوہ بند کرنا پڑی اور اب اس شہر میں قحط الکتاب کا عالم یہ ہے کہ ادبی کتابیں باہر سے منگانا پڑتی ہیں۔

امین آباد کی اردو کتابوں کا دل سوز منظر آنکھوں سے اوجھل ہوجانے کے بعد کراچی کے اس بازار میں قدم قدم پر ادبی کتابوں کی ان دوکانوں کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا اور سوچا اتنی نہ سہی کاش یہاں کی جیسی دو۔چار دکانیں ہی لکھنؤ میں کھل جائیں۔ پھر میں نے سوچا کھل بھی جائیں تو کوئی فائدہ نہیں کہ لکھنؤ میں لکھنے پڑھنے والے بچے کہاں۔ یہ شوقِ جاں سوزی اب لکھنؤ سے ختم ہو چکا ہے۔ویسے کتابوں سے خالی ہوجانے والے اس علاقے میں آپ کو ایک دوجگہوں پر بڑی نفاست کے ساتھ سگرٹوں کا گل جھاڑتے اور ایک خاص ادا سے دھواں اڑاتے ہوئے ایسے عاقلانِ عقل سوز بھی بیٹھے نظر آجائیں گے جو نیرّ مسعود کی اردو پر انگلی اُٹھا کر یوں خوش ہوتے ہیں جیسے دانش کدۂ دہر پر انہیں کی اجارہ داری ہے۔ کہنے کو اردو کا ایک

سرکاری پرچہ بھی یہاں سے نکلتا ہے لیکن اُس کے بیشتر مدیر اس پرچے میں معمولی مضمونوں کو شائع کرنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیتے رہے ہیں۔ ایک طبقہ اس شہر میں شاعروں کا ایسا ہے کہ غالب کو پڑھے بغیر شاعری پر جن کا غلبہ ہے اور کلامِ اقبال سے گزرے بغیر جن کا اقبال بلند ہے۔ مختلف گلی کوچوں میں ہونے والی اُن کی ادبی نشستوں میں دال کے گرنے اور ذال کے خارج از بحر ہو جانے پر خوب بحث ہوتی ہے۔ بقول اکبرالہ آبادی اب یہاں:

کامل کم ہیں اور اہلِ ارشاد بہت
طائر کم ہیں ملیں گے صیاد بہت
ہے بزمِ سخن کا حال یہ اے اکبر
شاعر کم ہیں مگر ہیں استاد بہت

تو اے اہالیانِ کراچی ہمارے شہر میں کتابوں کے نام پر اگر کچھ بکتا ہے تو مشاعروں میں ہونے والی سطحی شاعری کے مجموعے۔ اچھا ہوا کہ عابد سہیل نے یہ دن دیکھنے سے پہلے اپنی دکان بند کر دی اور اچھا ہوا کہ افتخار عارف اس شہرِ افسوس پر افسوس کرنے کے لیے یہاں موجود نہیں ہیں۔

●

میرے ایک بزرگ دوست اسلم محمود لکھنؤ میں ایک قابلِ رشک کتاب خانے کے مالک ہیں۔ ذخیرۂ کتب کے معاملے میں اگر کوئی ان کا مدِ مقابل ہے تو مشفق خواجہ۔ میں نے مشفق خواجہ کو دیکھا ہے، اُن کا کتاب خانہ نہیں دیکھا۔ مشفق خواجہ کے کتب خانے میں اردو، عربی اور فارسی کی کتابیں ہیں لیکن اسلم محمود کی ملکیت میں بہت سی زبانوں کے بہت سے موضوعات سے متعلق بہت سی کتابیں ہیں۔ لکھنؤ سے چلتے وقت انہوں نے مجھ سے 'غلام باغ' کے مصنف مرزا اطہر بیگ کی دو کتابیں۔ ''حسن کی صورتحال'' اور ''صفر سے ایک تک'' لانے کے لیے کہا تھا۔ انہیں 'غلام باغ' بہت پسند آیا تھا۔ ایک۔ دو اور لوگ بھی تھے جنہیں یہ ناول بہت بھایا تھا۔ میں نے بھی اسے فراست سے کہہ کر منگوایا لیکن دو۔ چار ورق پڑھنے کے بعد میں اسے آگے نہیں پڑھ سکا اور اب یہ میری اُس شیلف میں جسے میں کبھی کبھی ہی صاف کرتا ہوں گرد سے اٹا ہوا رکھا ہے۔ سوچتا ہوں کسی دن جا کر اسے اسلم صاحب کو دے آؤں کہ

انگریزی طرز پر لکھے ہوئے ناول انہیں زیادہ پسند آتے ہیں۔ایسے ناولوں کی ان کے پاس دو جلدیں ہو جائیں تو اچھا ہے۔ کتابوں کی ایک فہرست ناصر کاظمی پر تحقیقی کام کرنے والے میرے ایک شاگرد نے بھی دی تھی۔ میں نے فراست کو بتایا کہ مجھے یہ کتابیں خریدنا ہیں۔ وہ مجھے دو۔ایک تنگ سڑکیں پار کر کے ایک قطار میں بنی ہوئی کئی دکانوں میں سے ایک دکان پر لے گئے جہاں کاؤنٹر پر موجود لوگ اُن سے بڑے تپاک سے ملے۔''ویلکم بک پورٹ'' نام کی یہ دکان بہت بڑی تھی جس میں نیچے سے اوپر تک بنے ہوئے خانوں میں موضوع وار کتابیں بہت سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ میں نے کتابیں دیکھنا شروع کیں۔ان کتابوں کے موضوعات اور ان کی نفیس طباعت دیکھ کر میرا جی چاہا کہ جتنے پیسے میرے پاس ہیں، سب ان پر خرچ کر دوں۔ پھر سوچا کہ انہیں لے کیسے جاؤں گا۔ جو کتابیں تحفتاً ملی ہیں، انہیں کی تعداد بہت ہوگئی ہے۔ میں نے اسلم بھائی اور اپنے شاگرد کی مطلوبہ کتابوں کے نام کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو بتائے۔انہوں نے پہلے مرزا اطہر بیگ کے تازہ ناول لا کر دیے پھر ''ہجر کی رات کا ستارہ'' کا تازہ ایڈیشن۔ ناصر کاظمی سے متعلق یہی ایک کتاب وہاں دستیاب تھی۔دکان میں بیٹھے لوگوں نے مجھے بتایا کہ ناصر کاظمی پر لکھی ہوئی جو بھی کتاب آتی ہے، فوراً فروخت ہو جاتی ہے۔کتابیں خریدنے کے بعد ان لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں آرٹس کاؤنسل کی دعوت پر عالمی کانفرنس میں شرکت کرنے لکھنؤ سے آیا ہوں تو انہوں نے کتابوں کی اصل قیمت میں اچھی خاصی کمی کر دی۔ فراست دکان کے آخری سرے پر غالباً اس کے مالک سے محوِ گفتگو تھے۔ کتابیں خریدنے کے بعد ہم چھوٹی چھوٹی فٹ پاتھوں پر چلتے ہوئے ایک پرانی سی عمارت میں داخل ہوئے۔اس پوری عمارت میں صرف کتابوں کی دکانیں تھیں، اسی لیے اس عمارت کا نام 'کتاب مارکیٹ' تھا۔ اس کے بیرونی حصے میں جہاں تک میں دیکھ سکتا تھا مذہبی کتابوں کی دکانیں زیادہ تھیں۔ہم زینے چڑھ کر عمارت کے اوپری حصے میں پہنچے اور ایک دو راہداریوں سے گزرنے کے بعد مبین مرزا کے دکان نما دفتر 'اکادمی بازیافت' میں داخل ہوئے۔ہمیں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ ان کی میز پر تازہ چھپنے والی کتابوں کے پروف رکھے ہوئے تھے۔ شاید وہ ان کی تصحیح میں مصروف تھے۔ان کا عملہ اپنے

ناشتے دان کھولے ہوئے دن کا کھانا کھا رہا تھا۔ میری نگاہ بے ارادہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک شخص کے ناشتے دان کی طرف اٹھ گئی تو اس میں مجھے مسالے دار بھنڈی کی سبزی نظر آئی۔ گوشت کے شہر میں سبزی دیکھ کر مجھے کل (عذرا عباس کے یہاں) بھی حیرانی ہوئی تھی اور آج بھی۔ مبین مرزا نے پہلے ہم سے کھانے کے لیے پوچھا اور اس رسماً پوچھے ہوئے کا جب ہم نے رسماً انکار کیا تو انہوں نے ہمارے لیے چائے منگوائی۔ یہاں پھر میں نے افسانے پر کی جانے والی ان کی تقریر کی تعریف کی۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں نکل آئیں۔ ہندستان میں کیا لکھا جا رہا ہے، میں کیا لکھ رہا ہوں۔ فراست نے اُن سے میری کتابوں کی اشاعت کی بات کی۔ انہوں نے 'مکالمے' کے تازہ شمارے دیے پھر بتایا کہ عطاء الحق قاسمی نے اپنی تازہ کتاب 'سفرنامے' کی ایک جلد آپ کے لیے اور ایک قاضی افضال کے لیے دی ہے۔ یہ کہہ کر انہوں اُس ضخیم کتاب کی دو کاپیاں میرے حوالے کیں۔ مبین مرزا جہاں بیٹھے تھے اس کے چاروں طرف الماریاں تھیں اور ان میں 'اکادمی بازیافت' کے تازہ مطبوعات لگے ہوئے تھے۔ ہماری چائے ختم ہو چکی تھی اور چونکہ ابھی ہمیں بہت کام تھے اس لیے ہم نے مبین مرزا سے اجازت لی۔

'کتاب مارکیٹ' سے نکل کر ہم اس گھنی آبادی والے علاقے سے باہر آئے۔ فراست ہمیں دائیں بائیں کی عمارتوں کے بارے میں بتاتے جا رہے تھے۔ اسی میں انہوں نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ پتھر دیکھ رہے ہیں اس پر ہندی میں کچھ لکھا ہے۔ کسی زمانے میں یہ غیر مسلموں کا مسکن تھا۔'' پھر ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: ''آپ کے ملاقاتی جو ڈاکٹر صاحب یہاں آئے تھے کسی شادی میں، وہ یہیں ٹھہرے تھے۔'' یہ سب بتاتے ہوئے وہ ہمیں ایک کشادہ سڑک پر لے آئے جس کے دونوں طرف کھانے کے ہوٹل تھے۔ دو چار ہوٹلوں کے سامنے سے گزرنے کے بعد وہ ایک ہوٹل میں داخل ہوئے اور ایک گھماؤ دار زینہ چڑھ کر ہمیں اوپر کی منزل میں لے گئے۔ زینہ چڑھنے سے پہلے ایک فقیر فراست کی طرف بڑھا۔ فراست نے نیچے کے حصے میں کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا: ''یہ جو کھائے اسے کھلا دو۔'' فراست کی دریا دلی کے قصے بہت ہیں۔ سخت جاڑے میں کسی فقیر کو اپنا کوٹ اتار کر پہنا دینا، کسی کے کشکول میں ہاتھ میں آئے ہوئے سارے پیسے رکھ

دینا اس کے لیے معمولی بات ہے۔ برنس روڈ پر واقع ''مزے دار حلیم'' نام کے اس ہوٹل کا حلیم بہت مشہور تھا۔ فراست نے بیٹھتے ہی آرڈر دیا: ''حلیم اور خمیری روٹی۔'' میری تو جیسے چاندی ہوگئی۔ روٹیوں میں خمیری روٹی مجھے سب سے زیادہ مرغوب ہے۔ لکھنؤ میں خمیری روٹی کے لازموں میں نہاری، گھنواں کباب، تلے ہوئے آلو اور اروی کا سالن، کھچڑا اور حلیم ہیں۔ آرڈر دینے کے کچھ دیر بعد بیرا اپنے دونوں ہاتھوں میں حلیم سے بھری ہوئی بہت سی رکابیوں کو سنبھالے رکھنے کا غیر معمولی مظاہرہ کرتا ہوا ہماری میز پر آیا اور ہمارے سامنے دو رکابیاں رکھ دیں۔ پھر وہ کچھ دور پر بیٹھے کسی مقامی شخص کے ساتھ آئے ہوئے ایک غیر ملکی کی میز پر گیا۔ اس غیر ملکی نے حریص نگاہوں سے حلیم کی طرف دیکھا اور جیسے ہی اسے میز پر رکھا گیا، اس نے اسے چکھنا شروع کر دیا۔ ایک۔ دو اور میزوں پر یہ رکابیاں رکھنے کے بعد بیرا ہمارے لیے بہت گرم اور بہت نرم خمیری روٹی لے کر آیا۔ کم خور فراست نے بہت نہیں کھایا لیکن میں نے اپنی بھوک سے زیادہ کھایا۔ اگر کھانا آپ کی پسند کا ہو اور ذائقہ اس کا اچھا ہو تو نیت بہت دیر میں سیر ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ کیک اور بریڈ والا امریکی بھی یہ دونوں چیزیں مزے لے لے کر کھا رہا ہے۔ فراست ہمیں صحیح جگہ لے کر آئے تھے۔ کھانے کے دوران بھابھی کا فون آیا کہ ''میں اس علاقے میں آچکی ہوں۔ 'ربڑی ہاؤس' پر آجایئے، انیس صاحب کو ربڑی کھلانا ہے۔'' ہم نیچے اترے اور اسی لائن میں واقع 'ربڑی ہاؤس' پہنچ گئے۔ بھابھی وہاں موجود تھیں۔ حلیم والے مشہور ہوٹل سے نکل کر ہم ربڑی والی مشہور دکان پر جا پہنچے۔ ہم تینوں نے اُس دکان میں بیٹھ کر ربڑی کھائی اور میں نے خوب کھائی۔ ربڑی کھانے کے بعد بھابھی ہمیں بہادر آباد روڈ لے آئیں۔ یہ بہت کشادہ سڑک تھی اور اس کے دونوں طرف بہت بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ یہ سڑک اور یہاں کی دکانیں دیکھ کر میری آنکھوں میں لکھنؤ کے حضرت گنج کی تصویر اپنے منظروں کے ساتھ اتر آئی۔ اس سڑک کی دورویہ دکانوں کے برآمدوں میں خوش رو اور خوش پوشاک لوگ خوش رنگ تھیلے ہاتھوں میں لیے دکانوں میں سجی ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ دکانوں کے اندر صاف اور عمدہ لباسوں میں ملبوس دکاندار۔ آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے خریداروں کو چیزیں دکھاتے اور ان کے دام بتاتے نظر آئے۔ دکانوں پر خوش

نما حروف اور اچھے رنگوں میں لکھے ہوئے سائن بورڈ لگے تھے۔ ان میں سے بیشتر بورڈوں پر جب اردو نظر آئی تو میری آنکھیں چمکنے لگیں۔ لکھنؤ میں تو اردو والوں کی دکانوں پر بھی اردو میں بورڈ نظر نہیں آتے۔ حضرت گنج ہی کی طرح یہاں بھی بڑی دکانوں کے برآمدوں میں آرائش وزیبائش کا متفرق سامان بیچنے والوں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ کھانے پینے کی چیزیں اور بچوں کے کھلونے فروخت کرنے والے بھی اسی طرح کے تھے جیسے حضرت گنج کی بڑی دکانوں کے سامنے گھوما کرتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے میں نے خود کو اپنے شہر کے اسی بازار میں پایا جہاں ہم خوش لباسانِ شہر کو دیکھنے جایا کرتے تھے۔ اس بہت بڑی اور کشادہ سڑک پر بھابھی کے ڈرائیور عجب خاں نے ایک مقام پر جگہ خالی دیکھ کر گاڑی کھڑی کی۔ ہم تینوں گاڑی سے اترے اور دکانوں کے برآمدوں سے گزرنے لگے۔ بھابھی ایک ایک دکان کو دیکھتی جا رہی تھیں۔ میں یہ سمجھا کہ وہ اپنی کسی چیز کو خریدنے کے لیے اپنے مطلب کی دکان ڈھونڈ رہی ہیں۔ میں ان کے پیچھے فراست سے باتیں کرتا ہوا چلتا رہا۔ اچانک وہ 'کیلی فورڈ' نام کی مردانہ لباس والی ایک بہت عمدہ سی دکان کے سامنے رکیں جہاں چاروں طرف بہت عمدہ قسم کے مردانہ سوٹ (کوٹ۔ پینٹ) شیلفوں میں ٹنگے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچوں انہوں نے دکان میں ہمارا استقبال کرنے والے شخص سے کہا: ''اِن کی ناپ کا سوٹ دکھایئے۔'' یہ سن کر میں دکان سے باہر نکلنے لگا۔ فراست نے مجھے روکا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں یہ ہماری طرف سے ہے۔ اسے تو آپ کو لینا ہی ہے۔'' بھابھی بولیں۔

دکاندار نے میرے قد کو دیکھ کر میری ناپ کا اندازہ کیا اور ایک شیلف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''اس میں سے پسند کیجیے۔ الگ الگ داموں کے ہیں۔''

میں ایک بار پھر دکان کے دروازے کی طرف بھاگا اور ایک بار پھر میاں بیوی نے میرا راستہ روکا۔ ہاں اور نہیں کی تکرار کافی دیر تک ہوتی رہی۔ دکاندار جسے اتنی دیر میں معلوم ہو چکا تھا کہ میں کہاں کا ہوں اور جو کاروبار کی حکمتوں سے واقف تھا، اس تکرار کے دوران بولا:

''اتنی محبت سے کہہ رہی ہیں تو پسند کر لیجیے۔ سب باہر کے ہیں۔ لکھنؤ میں ایسے نہیں ملیں گے۔''

بھابھی شیلف میں لگے ہوئے سوٹوں کے رنگ اور کپڑے کی قسم کو دیکھ دیکھ کر اور چھو چھو کر سوٹ کا انتخاب اس طرح کر رہی تھیں جیسے کل مجھے کہیں بردکھوے میں جانا ہو۔ بہت دیکھنے بھالنے کے بعد بہت عمدہ رنگ اور بہت اچھی قسم کے کپڑے والا ایک سوٹ پسند کیا گیا۔ بھابھی نے اس کی قیمت ادا کی اور اس کی ناپ ٹھیک کرنے کے لیے دکاندار کو اسے دے کر ہم لوگ دکان سے باہر نکل آئے۔ باہر نکل کر میں نے بھابھی سے کہا: ''کتنا کیجیے گا ہمارے ساتھ۔ ہر آتے جاتے کے ساتھ ہزاروں کی چیزیں بھیج دیتی ہیں۔''

''نہیں کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں بھیجتے ہم۔''

فراست کی طرح بھابھی بھی بہت دریادل ہیں:

ع　ان سے قطرہ کوئی مانگے تو گہر دیتے ہیں

تھیلے بھر بھر کر ہر طرح کی چیزیں ہمارے لیے کراچی سے بھیجتی ہیں۔ کبھی کبھی امانت میں خیانت بھی ہو جاتی ہے۔ کچھ دوسری دکانوں سے اپنی ضرورت کا سامان لینے کے بعد ہم پھر سوٹ والی دکان میں آئے۔ پتلون کی ناپ ٹھیک کر دی گئی تھی۔ بھابھی نے سوٹ کا تھیلا لیا۔ میں نے مسکرا کر دکاندار کی طرف دیکھا لیکن انہوں نے اپنے جبڑوں کو حرکت دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اس سوٹ کی خریداری کے سلسلے میں ہم نے اچھا خاصا وقت اس دُکان میں گزارا تھا۔ میرے اور بھابھی کے درمیان حجت بھی ہوئی تھی۔ اس حجت میں فراست نے مداخلت بھی کی تھی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر وہ بندۂ خدا جس کی دُکان میں ہم داخل ہوئے تھے اور جس سے بھابھی نے میرے لیے خاصا مہنگا سوٹ خریدا تھا، اُس نے ایک بار بھی ہنسی کو اپنے ہونٹوں پر نہیں آنے دیا۔ میں نے سوچا تری کے علاقے میں رہ کر ان کا یہ حال ہے، اگر موصوف خشکی میں ہوتے تو کیا ہوتا۔ ان دکاندار کا اکڑا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے لکھنؤ کا ایک واقعہ یاد آ گیا:

ایک بار ہم اپنے ایک دوست کے ساتھ جنہیں اپنی بیوی کے لیے ساری خریدنا تھی، امین آباد میں ساریوں کی ایک دکان پر گئے۔ سیلس مین نے اپنے جبڑے جکڑ کر ساریاں دکھانا شروع کیں۔ جب وہ کئی ساریاں دکھا چکا اور اس نے اپنے جبڑوں کی گرفت ڈھیلی نہیں کی تو ہمارے

دوست نے کہا: ''رہنے دیجیے نہیں خریدنا ہے۔''

سیلس مین چکرا گیا۔ بولا: ''پسند نہیں آئیں؟''

''پسند آئیں بہت پسند آئیں، لیکن خریدیں گے نہیں۔''

دکاندار کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے کہا: ''آپ کو پسند آئیں اس کے بعد بھی نہیں خریدیں گے۔''

''ایک کام کیجیے۔'' ہمارے دوست نے ساریوں کی قطار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اِس طرف سے ہنستے ہوئے جائیے اور اُس طرف سے مسکراتے ہوئے آئیے۔''

اب کے سیلس مین نے جبڑوں کو ڈھیلا کیا۔ جبراً وقہراً مسکرایا۔ ہمارے دوست نے پسند کی ہوئی ساری کو اٹھایا اور اسے دیتے ہوئے بولے: ''نیچے کاؤنٹر پر آئیے۔''

جب وہ ساری لے کر نیچے کاؤنٹر پر آیا تو انہوں نے سیلس مین کا بازو پکڑ کر دکان کے مالک سے کہا:

''انہیں مسکرانا سکھائیے ورنہ ایک دھیلے کا سودا نہیں ہوگا۔ یہ لکھنؤ ہے۔''

پہلو میں آفتاب کے ذرّہ چمک اٹھا

شام ہونے والی تھی۔ بہادر آباد روڈ کی خریداری کے بعد ہم فراست کے گھر آئے۔ آج یونین کلب (PECHS) حیدرآباد میں ڈاکٹر فاطمہ حسن اور زاہدہ حنا کی طرف سے رات کے کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہم سب بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے سب نے آرام کیا۔ جب ہماری کمریں سیدھی ہوگئیں تو ہم اٹھ کر یونین کلب والی دعوت کے لیے تیار ہوئے۔ بھابھی آج سرخ و کبود کا مجموعہ تھیں اور اس دورنگے سوٹ میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ فراست نے بھی آنکھوں کو بہت اچھا لگنے والا وہ لباس پہنا تھا جس میں ان کی عمر چُھپ گئی تھی اور میں وہی پوشاک پہنے ہوئے تھا جسے پہن کر شعیب کے گھر سے نکلا تھا۔ ہم سب گاڑی میں بیٹھ کر یونین کلب کی طرف روانہ ہوئے۔ دن میں فاطمہ حسن نے ہمیں بتادیا تھا کہ اس دعوت میں مشتاق یوسفی بھی تشریف لا رہے ہیں۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ صدی کے سب سے بڑے مزاح نگار کے ساتھ مجھے لقمہ توڑنے کا شرف حاصل ہورہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم 'یونین کلب' پہنچ گئے۔

زاہدہ حنا، زیبا علوی، فاطمہ حسن اوران کے شوہر وہاں موجود تھے۔ دوسرے مہمان ایک ایک کر کے آ رہے تھے۔ عابد رضوی آئے۔ آصف فرخی اوران کی بیگم آئیں۔ عقیل عباس جعفری آئے۔ کچھ ایسے لوگ بھی آئے جو یونین کلب کے عہدہ دار تھے۔ اور پھر آئے دارائے دولتِ مزاح نگاراں یعنی مشتاق احمد یوسفی:

ع مثلِ خورشید ہے روشن وہ شرف ان کا ہے

فاطمہ حسن سہارا دے کرانہیں کھانے کی میز تک لائیں اور مجھےان کے پہلو میں بٹھا دیا:

ع پہلو میں آفتاب کے ذرہ چمک اٹھا

میں نے سر جھکا کران کے ہاتھوں کواپنی آنکھوں سے لگایا۔ یہ وہ ہاتھ تھے جن میں آیا ہوا قلم حرکت کرتے ہی صفحۂ قرطاس پر گہر برسانے لگتا ہے۔ انہیں ہاتھوں کے چھو جانے سے گلہائے حروف شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں ہاتھوں میں آئے ہوئے ظرفِ مزاح سے موجِ ظریفانہ اٹھ اٹھ کر ہمارے ہونٹوں تک آتی ہے۔ دلہائے رنج گزیدہ کو آ بنائے تبسم میں دیر تک ڈبوئے رکھنے والا فقرہ ساز قلم انہیں ہاتھوں میں آ کر چمک اٹھتا ہے۔ انہیں ہاتھوں سے طنز کی تعمیر ہوتی ہے اور مزاح کی تکمیل۔ اس کے پہلو میں بیٹھ کر میں نے سوچا کہ میں جس طاقِ یوسفی کی دید کا مشتاق تھا آج وہ احمدِ مجسم بن کر میرے سامنے ہے۔

مشتاق یوسفی کی آمد کے بعد احمد شاہ اپنی چاندسی شریکِ حیات کے ہمراہ نمودار ہوئے۔ اور ایسی چاندسی بیوی کہ:

ع پھیکی تھی روشنیِ قمران کے سامنے

میں آج پہلی بارانہیں اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ کسی نے مجھے بتایاان کا نام چاند ہے۔ میں نے کہا نام رکھنے والے نے نام غلط نہیں رکھا۔ کچھ صورتیں اپنے ناموں کا لازمہ بن جاتی ہیں۔ انہیں میں یہ چاند بی بی بھی تھیں جو احمد شاہ کے آسمان پر طلوع ہو کر جگمگا رہی تھیں۔ یونین کلب کے بڑے سے سبزہ زار پر ایک بڑی سی میز لگی ہوئی تھی اور مہمانوں کے آ جانے کے بعد رنگ رنگ کے کھانے اس پر سجائے جا رہے تھے۔ میں نے مشتاق یوسفی کی طشتری میں ان کی پسند کی چیزیں رکھتے ہوئے آہستہ سے ان سے کہا: ''آپ کا قلم سراپا مزاح ہے اور آپ کا حرف مجسم طنز۔''

''آپ لکھنؤ والے اسے پسند کر لیتے ہیں تو بہت ہے۔ میں تو راجستھانی، صحرا کا باسی ہوں۔ زبان تو آپ کی ہے؟'' بڑا مزاح نگار بڑی خاکساری سے بولا۔

ع فروغِ رتبۂ عالی جہاں میں خاکساری ہے

میں نے اس انکسار کے جواب میں بڑی عاجزی سے کہا:

''نہیں صاحب! اب ہم بھی صاحبِ زبان نہیں رہے۔ زبان ہماری بگڑ چکی ہے اور لہجہ لٹھ مار ہو گیا ہے۔'' اب میں انہیں کیا بتاتا کہ انیس و دبیر کی زبان لکھنؤ کے ایک چھوٹے سے علاقے میں سمٹ گئی ہے۔ اور وہاں اب ستر کے اوپر کے لوگ ہی لکھنوی روزمرّے اور محاورے کا استعمال کرتے ہیں۔ جو زبان ہمارے بزرگوں نے انیس کے مرثیے اور طلسمِ ہوشربا پڑھ کر سیکھی اور بولی تھی وہ خال خال ہی سننے کو ملتی ہے۔ انیس نے جب کہا تھا:

ع اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہوگا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب اُن کے احاطے میں سب بیرونی بھر جائیں گے اور انیس اشفاق کو یہ شعر کہنا پڑے گا:

آ گئے ہیں یہ مرے شہر میں کس شہر کے لوگ
گفتگو میں ادب آداب نہیں دیکھتے ہیں

''مشتاق یوسفی صاحب!'' میں خود سے گویا ہوا۔ ''ایک زمانہ وہ تھا جب لکھنؤ کی پھول والیاں بھی غلط گویانِ شہر کو ٹوک دیا کرتی تھیں۔ ایک واقعہ انہیں پھول والیوں کا سن لیجیے: لکھنؤ کے مشہور امین الدولہ پارک میں پارک بننے سے پہلے گل فروشوں کا بازار لگتا تھا۔ ایک صاحب دہلی سے چل کر لکھنؤ اس لیے آئے کہ یہ جو زبان والوں کا شہر ہے، ذرا دیکھیں کہ یہاں کے لوگ کیسی زبان بولتے ہیں۔ چنانچہ وہ چارباغ اسٹیشن سے امین آباد کی اسی فروشگاہِ گُل میں آئے اور پھولوں سے بھری ایک ٹوکری کے سامنے کھڑے ہو کر اُس خوش چشم بانوئے گلفروش کو گھورنے لگے جو سبز ساری زیبِ تن کیے اپنے سامنے سبدِ گلہائے چمن لیے بیٹھی تھی۔ پہلے تو وہ گلفروش خاموش رہی لیکن جب انہوں نے دیکھنا اُس کا بند نہیں کیا تو وہ غزال چشم آنکھیں نچاتی ہوئی بولی:

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

باشندۂ دہلی نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا: ع ''سبز ساری میں ترا تن دیکھا۔''

اُس خانمِ خانوادۂ گل نے پوچھا: ''کہاں کے ہو؟''

''لکھنؤ کا۔''

''نہیں لکھنؤ کے نہیں ہو۔''

''لکھنؤ ہی کا ہوں۔''

بانوئے سبز قبا بولی: ''لکھنؤ کے ہوتے تو یوں نہ کہتے۔''

''پھر کس طرح کہتے؟'' شاہ جہانبادی نے پوچھا۔

اُس دوشیزۂ گل نے جو اس وقت سر تا پا برنگِ برگِ درخت تھی، کہا:

''لکھنؤ کے ہوتے تو کہتے: ع سبز فانوس میں اک شمع کو روشن دیکھا۔''

اشراف کو جانے دیجیے۔ نزاکتِ زبان کے معاملے میں یہاں کے حجّام تک بہت حسّاس تھے۔ کریم بخش نام کا ایک خط تراش ایک دن پھلوں کے بازار میں گھومتے ہوئے آموں کے ایک ٹھیلے کے سامنے رکا اور پوچھا:

''کیا بھاؤ ہیں؟''

آم فروش جو کریم بخش کو پہچانتا تھا بولا: ''یہ خاص لوگوں کے لیے ہیں عام لوگوں کے لیے نہیں۔''

کریم بخش نے برجستہ کہا: ''مجھے عام خاص کی مطلق فکر نہیں۔''

واضح رہے کہ عام، خاص اور مطلق فقہ کی اصطلاحیں ہیں۔ آم فروش سمجھ گیا کہ آدمی صاحبِ زبان ہے۔

تو اتنی اچھی زبان لکھنے والے مشتاق یوسفی صاحب! اب ہمیں اپنے شہر میں صاحبِ زبان کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ خود کلامی کے اس عمل میں میں نے لقمۂ تر کو اپنے ہونٹوں کی طرف لے جاتے ہوئے فراست کو دیکھا اور سوچا کہ قابلِ رشک ہے یہ شخص کہ اُس کی زبان پر زبانِ لکھنؤ اب بھی زندہ ہے اور پھر عابد رضوی کی طرف نگاہ کی کہ ان کی چھڑی ہی میں سہی لکھنؤ موجود ہے۔

مشتاق یوسفی جتنی بولتی اور دوسروں کے لب کھولتی ہوئی تحریر لکھتے ہیں خود اتنا ہی کم بولتے ہیں۔ بس ضرورتاً۔ خود کوئی بات نہیں چھیڑتے لیکن چھیڑی ہوئی بات سے پلّہ بھی نہیں چھڑاتے۔ میں اُن کے پہلو میں بیٹھا اس بات پر خوش ہو رہا تھا کہ اس رات ماہتابِ مزاح کا نور میرے حصے میں ہے۔

کانفرنس کے بعد آج احمد شاہ سے پہلی بار ملاقات ہو رہی تھی۔ یہاں بھی سب اُنہیں کانفرنس کی کامیابی پر مبارکباد دے رہے تھے۔ یہاں بھی ان کی آواز سب آوازوں میں سب سے نمایاں تھی۔ آصف فرخی اُن سے محوِ گفتگو تھے۔ آصف کی بیگم ثمین نے اپنے حصے کی ساری گویائی آصف کو منتقل کر دی ہے، اس لیے خود خاموش رہتی ہیں۔ یہ مشاہدہ غلط بھی ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ گھر میں وہ بولتی ہوں اور آصف سنتے ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے مشغلے کیا ہیں لیکن چہرے کی متانت اور آنکھوں کی بناوٹ بتاتی ہے کہ فنونِ لطیفہ میں سے کسی ایک فن میں انہیں دخل ضرور ہے۔ لیکن ایک مشغلہ بیویوں میں عام ہے جس سے یقیناً ثمین صاحبہ کا تعلق نہ ہوگا۔

کسی صاحب نے کسی صاحب سے کسی محفل میں پوچھا: ''آپ کی بیوی کا مشغلہ کیا ہے؟''

وہ بولے: ''وہی جو آپ کی بیوی کا ہے۔''

''یعنی؟''

''شوہر کی غیبت۔''

لیکن شوہر بھی اس مشغلے میں پیچھے نہیں ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کا ایک کاتب دفتر آتے ہی اپنی بیوی کی برائی شروع کر دیتا تھا۔ ایک دن...روز کی طرح جب وہ اپنی بیوی کی برائی کر رہا تھا شاہد صاحب نے عاجز آ کر اس سے پوچھا: ''کیا وہ تمہاری سوتیلی بیوی ہے؟''

زیبا علوی اور زاہدہ حنا بھی عموماً خاموش رہتی ہیں۔ یہاں بھی وہ بہت زیادہ نہیں بول رہی تھیں۔ بولنے والی عورتوں میں فاطمہ حسن اور نسیم نازش تھیں۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ دونوں کا بولنا اچھا لگتا ہے۔ ان میں سے ایک یعنی فاطمہ حسن کے شوہر تو بالکل خاموش بیٹھے تھے لیکن دوسری والی کے بولے جا رہے تھے اور اپنے بولنے میں بتا رہے تھے:

ع ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری

فراست گنجینۂ لطائف ہیں اور لطیفوں کی یہ دولت خرچ کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ سو جہاں بیٹھتے ہیں وہاں قہقہے گونجتے ہیں۔ عقیل عباس جعفری جنہیں فراست مذاقاً بخیل عباس جعفری کہتے ہیں کھانے کے دوران بھی تصویریں کھینچتے رہے اور کھانے کے بعد بھی۔ میرے لکھنؤ آتے ہی انہوں نے یہ تصویریں مجھے میل کر دیں اور میں نے اب تک ان کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ گروپ بنا بنا کر ہماری بہت سی تصویریں کھینچی گئیں۔ فاطمہ حسن فالسائی رنگ کی ساری پہنے رات کی روشنیوں میں فوارۂ نور بنی ہوئی تھیں۔ زاہدہ حنا عنابی رنگ کے سوٹ پر اسی رنگ کا بنکیوں دار دوپٹہ ڈالے ہوئے تھیں۔ یہ پہناوا ان پر بہت بھلا لگ رہا تھا اور ان کی عمر کو چھپا لے گیا تھا۔ زیبا علوی لباس کے معاملے میں ہمیشہ سے بہت سادگی پسند ہیں سو یہاں بھی وہ کھلتے ہوئے رنگ کی ایک ساری پہن کر آئی تھیں۔ عابد رضوی سفید شلوار کرتے پر ہلکے سرمئی رنگ کی صدری پہنے ہوئے تھے۔ لکھنؤ ان کے لباس سے غائب تھا۔ کیوں؟ یہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ لیکن انہیں اس لباس میں دیکھ کر یہ ضرور سوچا کہ وہ ہمارے شہر کے اس علاقے کے ہیں جو رفتار میں گفتار میں انداز میں اطوار میں ہر وقت لکھنؤ کو دکھاتا رہتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا کہ اگر دوبارہ کراچی آنا ہوا تو اُن کے لیے ایک اچکن، ایک چوڑی دار پانجامہ اور ایک دوپلی ٹوپی ضرور لے کر آؤں گا کہ میں انہیں لکھنؤ سے الگ نہیں دیکھ سکتا۔

کھانا ختم ہونے اور تصویریں کھینچے جانے کے بعد ہم مشتاق یوسفی کو لے کر ان کی گاڑی تک آئے اور انہیں بہ احترام و اخلاص رخصت کیا۔ پھر ہم ایک دوسرے سے وداع لے کر اپنی اپنی منزلوں کی طرف گامزن ہوئے۔ فراست نے مجھے میرے ٹھکانے تک پہنچایا اور اگلے دن کا پروگرام بتا کر اپنے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ شعیب نے آج پھر سوتے سے جاگ کر دروازہ کھولا اور آج پھر میں اس سے یہ کہہ کر کہ ''سو جاؤ صبح ملیں گے'' اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جویانِ علم کی جلو میں

آج گیارہ بجے کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں مجھے طلبہ سے خطاب کرنا ہے۔ حسب معمول میں اٹھا، نیچے آیا، چائے پی، شعیب کے ساتھ ناشتہ کیا اور اسے آج کے مصروفیات کے بارے میں بتایا۔ ناشتے پر تھوڑی بہت غپ شپ کی اور اوپر تیار ہونے کے لیے چلا گیا۔

تیار ہو کر میں اور شعیب ایک ساتھ گھر سے باہر نکلے۔ پہلے وہ اپنے دفتر گیا۔ وہاں کے معاملات دیکھے۔ اسی میں گیارہ بج گئے۔ فراست کراچی یونیورسٹی پہنچ چکے تھے اور وہاں سے ان کے فون آنا شروع ہو گئے تھے: ''جلدی پہنچیے انتظار ہو رہا ہے۔''

''نکل رہے ہیں، نکل رہے ہیں۔''

لیکن اس نکلنے میں ہمیں دیر ہونے لگی۔ اُدھر سے پھر فراست کا فون آیا:

''بھائی وہ شاداب احسانی..... پوچھ رہے ہیں کتنی دیر میں آئیں گے۔''

''راستے میں ہیں۔'' میں نے کہا۔ راستے میں کہاں پر ہیں، یہ انہیں شعیب نے بتایا۔ فراست اُدھر سے ہمیں بتا رہے تھے کہ وہ یونیورسٹی میں کس جگہ پر ہیں۔ رفتار بڑھا کر لمبا راستہ طے کرنے کے بعد ہم بالآخر دانشگاہِ کراچی کی دہلیز پر جا پہنچے۔ فراست یونیورسٹی کے باہر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ شعیب کی گاڑی دیکھتے ہی دوڑے ہوئے اس کی طرف آئے، اس میں بیٹھے اور گاڑی یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ گاڑی کے احاطے میں داخل ہوتے ہی مجھے پنو یاد آیا۔ اسی زمین پر وہ بے دم ہو کر گر پڑا تھا۔ یہ کوئی پینتیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ یہاں کس طرف کی خاک اُس کے خون سے رنگین ہوئی تھی، میں کس سے پوچھوں۔ کس سے پوچھوں کہ قرولی اس کے پیٹ میں کہاں اتاری گئی تھی۔ اُس قطعۂ زمین کا بتانے والا کوئی ہوتا تو میں وہاں کچھ دیر بیٹھتا اور پنو کو یاد کرتا۔ میں نے کسی کے بیان کیے ہوئے اس منظر کو اپنی چشم تصور میں اتارا: یوں جھگڑا ہوا ہوگا، یوں قرولی نکلی ہوگی، یوں پنو بیچ میں آیا ہوگا اور یوں وہ قرولی اس کے پیٹ میں اتری ہوگی اور یوں وہ زمین پر گرا ہوگا۔ مرتے مرتے اس نے ضرور کسی کو مدد کے لیے پکارا ہوگا.....اور کسی کو دیکھنے کے لیے اس کی آنکھیں ضرور کھلی رہ گئی ہوں گی۔

''کیا سوچنے لگے۔'' شعیب نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔

یونیورسٹی کے احاطے میں بائیں طرف کی عمارتیں جدید طرز کی تھیں جو بہت عمدہ رنگ سے رنگی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے بارے میں پوچھا تو فراست نے بتایا کہ یہ اقتصادیات و معاشیات کے شعبے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ شعبے آج کل ہر جگہ بہت اچھی حالت

میں ہیں کہ عالم کاری کے اس زمانے میں بازار میں یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ کی بہت مانگ ہے۔ ان شعبوں سے آگے بڑھ کر ہم داہنی طرف مڑے اور گاڑی اُس عمارت کے سامنے رکی جہاں اوپر کی منزل میں اردو کا شعبہ تھا۔ میں نے گاڑی سے اتر کر اس عمارت کو دیکھا تو یہ جدید طرز کی بنی ہوئی پہلے والی عمارتوں کے مقابلے میں پھیکی معلوم ہوئی۔ پھیکی ان معنوں میں کہ یہاں وہاں کا سا رنگ و روغن نہیں تھا۔ لیکن وہ شانِ قدامت جو ایسی ہر عمارت میں موجود ہوتی ہے، یہاں بھی پوری طرح موجود تھی۔ شعیب ہمیں اتار کر واپس چلے گئے اور ہم زینے چڑھ کر اس برآمدے میں پہنچے جہاں کچھ دور چل کر داہنی طرف شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شاداب احسانی کا کمرہ تھا۔ ہم اس کمرے میں داخل ہوئے تو شاداب احسانی اور ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے طلبہ نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے کے بعد گفتگو ادبی موضوعات پر ہونے لگی۔ شعبے میں تحقیق کی صورتحال کیا ہے۔ کن موضوعات پر کام ہو رہا ہے، کن پر ہو چکا ہے۔ ہند و پاک میں تحقیق کا معیار کیا ہے۔ کون کون لوگ شعبے سے متعلق ہیں، کون کون لوگ متعلق رہے ہیں، کیا کیا اُن کے تصنیفات ہیں۔ شعبے کی ادبی سرگرمیاں کیا ہیں۔ شاداب احسانی کی میز پر دو ضخیم مقالے رکھے ہوئے تھے۔ فراست نے یہ مقالے پہلے خود دیکھے پھر میری طرف بڑھا دیے۔ ان میں سے ایک مقالہ عزیز حامد مدنی پر فہیم شناس کاظمی کا تھا اور اردو تنقید سے متعلق دوسرے مقالے کی مقالہ نگار تھیں ذکیہ رانی۔ میں نے دونوں مقالوں کو اِدھر اُدھر سے دیکھا اور محسوس کیا کہ دونوں محنت سے لکھے ہوئے ہیں۔ پروفیسر شاداب احسانی کے ساتھ بیٹھے ہوئے طلبہ میں سے ایک۔ دو نے اپنے موضوعات سے متعلق مجھ سے استفسارات کیے، ماخذ معلوم کیے اور پوچھا کہ ان سے متعلق مواد ہندستان میں کہاں کہاں مل سکتا ہے۔ اسی گفتگو میں میں نے ان طلبہ کو بتایا کہ ہمارے یہاں کس نوع کی تحقیق ہو رہی ہے اور کن موضوعات پر زیادہ کام ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ رؤف پاریکھ مجھے ابھی تک نظر نہیں آئے تھے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کلاس لے رہے ہیں۔ یہ سن کر مجھے خوشی اس لیے ہوئی کہ درس و تدریس کے اِس آشوب میں استاد نہ پڑھتا ہے نہ پڑھاتا ہے اور اگر بدرجۂ مجبوری کلاس میں جاتا ہے تو اپنی بے علمی سے طلبہ کو علم کی غلط راہ پر ڈال کر چلا آتا ہے۔ لیکن ایسے استادوں کو پچھتاوا اس لیے

نہیں ہوتا کہ اُن کے نزدیک وہ استاد ہی کیا جو طلبہ کو گمراہ نہ کرے۔ دانشگاہ کراچی کے حال سے تو ہم آگاہ نہیں لیکن ہمارے یہاں ایسے بہت سے استاد ہیں جنہوں نے حد سے بڑھے ہوئے اعتمادِ جہل کی بنا پر طلبہ کو وسعتِ علم کے نور سے دور اور آخری تنخواہ ملنے تک خود کو شاد و مسرور رکھا۔ ہندستان میں یونیورسٹی کے استادوں سے متعلق بہ اعتبارِ منصب ایک بات بہت مشہور ہے۔ وہ یہ کہ لکچرر وہ جو پڑھے اور پڑھائے، ریڈر وہ جو بغیر پڑھے پڑھائے اور پروفیسر وہ جو نہ پڑھے نہ پڑھائے۔

رؤف پاریکھ سے ملنے کا اشتیاق مجھے اس لیے بھی تھا کہ ان کی نگرانی میں تیار کیا ہوا اردو۔انگریزی لغت جو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوا ہے کراچی جانے سے قبل میرے مطالعے میں تھا اور اس کے مطالعے کے بعد میں ان کی محنت کا قائل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد رؤف پاریکھ کلاس لے کر آ گئے۔ ہم ایک دوسرے سے بڑی خوش دلی سے ملے۔ شاداب احسانی جتنے کیم شحیم اور صحت مند تھے، رؤف پاریکھ اتنے ہی دھان پان۔ ہماری گفتگو میں شریک ہوئے انہیں تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شاداب احسانی نے اس ہال کا حال معلوم کیا جہاں مجھے طلبہ سے گفتگو کرنا تھی۔ انہیں بتایا گیا کہ طلبہ سب جمع ہو گئے ہیں، آپ لوگوں کا انتظار ہے۔ ہال میں بڑی تعداد میں طلبہ موجود تھے اور میرے ہی شعبے کی طرح اُن میں لڑکیوں بالخصوص برقع پوش لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ہم اپنی کرسیوں پر بیٹھے۔ شاداب احسانی نے طلبہ کو میری آمد کا مقصد بتایا۔ فراست نے بہت زیادہ تعریفوں کے ساتھ میرا تفصیلی تعارف کرایا اور اس کے بعد شاداب احسانی نے کسی بھی موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے مجھے آزاد چھوڑ دیا لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ بات لکھنوی ادب پر ہو تو اچھا ہے۔ میں نے لکھنؤ کے شعری اور نثری ادب پر بات کی اور بہت دیر تک کی۔ طلبہ کو اس ادب کے امتیاز و اختصاص سے آگاہ کیا اور بتایا کہ: ''کلاسیکی ادب کا بیشتر قیمتی سرمایہ لکھنؤ ہی کا عطیہ ہے۔ ناسخ اور انیس کی بنائی ہوئی مثالی زبان اور شاہانِ اودھ کی وضع کی ہوئی تہذیب پر اگر ہم فخر کرتے ہیں تو فخر ہمارا بجا ہے۔'' اور فراست کی لاج رکھنے کے لیے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ دیا کہ صحیح زبان اب بھی لکھنؤ ہی کے صاحبانِ قلم (نیر مسعود) لکھ رہے ہیں۔

طلبہ غور سے میری باتیں سنتے رہے اور جب گفتگو ختم ہوئی تو ان میں سے کچھ نے کچھ سوالات بھی کیے۔ اور میں نے ان سوالوں کے جواب میں جو کچھ کہا وہ اس سے خوش بھی ہوئے اور مطمئن بھی۔ آخر میں رؤف پاریکھ نے جو ہمارے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے کچھ تحسینی کلمات کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔ لکچر ختم ہونے کے بعد میں طلبہ کے حلقے میں ان کی بہت سی باتوں کا جواب دیتے ہوئے شاداب احسانی کے کمرے میں آ گیا اور باتوں کا سلسلہ پھر چل نکلا۔ انہیں باتوں کے بیچ شاداب احسانی نے ایک۔ دو طلبہ کو بلا کر کچھ ہدایات دیں جن کا مطلب تھا کہ کچھ کھانے وانے کا انتظام کیا جائے۔ انہوں نے اُن طلبہ کو یہ بھی بتایا کہ کہاں سے کیا لایا جائے۔ طلبہ اُن کے احکام کو بجالاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ خاصا وقت گزر جانے کے بعد ہم سے کسی اور کمرے میں چلنے کے لیے کہا گیا۔ ہم وہاں پہنچے تو میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ یہ وہی کھانا تھا جو کل ہم نے برنس روڈ پر فراست کے ساتھ کھایا تھا۔ یعنی حلیم اور خمیری روٹی اور اُس کے ساتھ کھیر۔ کھانا کھا کر ہم کمرے سے باہر نکلے تو طلبہ نے ہمیں پھر گھیر لیا۔ ان میں سے ایک طالب علم عون عباس نے جو شعبۂ اردو کی ادبی سوسائٹی 'مرکزِ علم وادب' کا کنوینر تھا، مجھے بہت خوبصورت کاغذ میں لپٹا ہوا ایک ڈبہّ دیا، لکھنؤ لا کر میں نے اسے کھولا تو یہ بہت عمدہ قسم کا عطر تھا۔ ایک اور طالب علم نے مجھے اردو اور انگریزی میں چھپی ہوئی 'ضو' نام کی ذولسانی میگزین دی۔ میں نے اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے انگریزی والے حصے میں اداریے کے اُس اقتباس نے مجھے بہت متاثر کیا جس میں اِس بات پر افسوس کیا گیا تھا کہ لوگ ادبی رسالے خریدنے کے لیے اپنی جیبوں سے پیسے نہیں نکالتے اور اِسی کے ساتھ یہ سوال کیا گیا تھا کہ ہم ادیب کیسے پیدا کریں گے اور معاشرے میں انقلاب کیونکر لائیں گے اگر ہم نوجوانوں کی ہمت بڑھانے کے بجائے ان کی حوصلہ شکنی کریں گے۔ مجھے طلبہ کا یہ شکوہ نما جذبہ اچھا لگا اور یہ بھی اچھا لگا کہ طلبہ آپس میں جمع کیے ہوئے پیسوں سے یہ رسالہ نکالتے ہیں۔ اس سے ادب کے تئیں ان کا ولولہ اور خلوص ظاہر ہوتا ہے۔ انگریزی والے حصے میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں تھیں اور انگریزی میں تازہ چھپی ہوئی کتابوں پر تبصرے بھی تھے اور پڑھنے والوں کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ کون سی کتاب پڑھیں اور کیوں؟ اردو والے حصے میں بھی نظمیں، غزلیں، رباعیاں، کہانیاں

سب کچھ تھا مگر انگریزی کے مقابلے میں یہ حصہ نسبتاً کمزور تھا۔ پھر بھی اس حصے میں بعض ایسی غزلیں یا یہ کہیں کہ بعض ایسے شعر تھے جن پر نگاہ دیر تک ٹھہری۔ یہ شعر بڑے شاعروں کی لفظیات اور ترکیبوں سے تیار کی ہوئی مشاعروں کے شاعروں کی ان غزلوں سے زیادہ اچھے تھے جو بہت اچھے پاکستانی رسالوں میں راہ پاجاتی ہیں۔ میں بڑے سائز پر چھپنے والی پتلی سی اِس میگزین کا خصوصیت کے ساتھ ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ فرانس اور جرمنی کی دانشگاہوں میں طلبہ کی انجمنوں کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی انہیں چھوٹی چھوٹی میگزینوں (Little Magazines) نے بڑے بڑے ادیب پیدا کیے ہیں۔ عجب نہیں 'ضو' میں چھپنے والے اِن طلبہ میں سے بہت سے آگے چل کر اپنی تحریروں سے ادب کی زمین کو ضیا بار کریں۔

آٹھ ہندستانی

شعبۂ اردو کے صدر شاداب احسانی طلبہ کے ساتھ مجھے زینے تک چھوڑنے آئے۔ واپسی کا ہمارے پاس کوئی وسیلہ نہیں تھا اس لیے ہم رؤف پاریکھ کی گاڑی میں بیٹھ کر یونیورسٹی کے عقبی علاقے سے باہر نکلے۔ یہ علاقہ یونیورسٹی میں داخل ہونے والے اصل راستے کی طرح صاف ستھرا نہیں تھا۔ کہیں کہیں پانی بھرا تھا اور کیچڑ بھی تھی۔ رؤف پاریکھ اپنی گاڑی کو آڑی ترچھی کرتے ہوئے ان اونچے نیچے راستوں سے باہر نکال لائے۔ یہاں سے فراست کا گھر بہت قریب تھا۔ رؤف پاریکھ نے ہمیں نعمان گارڈن کے گیٹ کے سامنے اتارا۔ فراست کے گھر پر کچھ دیر بیٹھ کر ہم بھابھی کے ساتھ ان کے بھائی کے گھر پہنچے۔ آج مجھے کچھ خریداری کرنا تھی اس لیے بھابھی نے خریداری کی ماہر اپنے بھائی کی بیوی تحسین کو اپنے ساتھ لیا۔ بھابھی کی گاڑی میں بیٹھ کر ہم بہادر آباد جہاں دو دن پہلے آ چکے تھے، پھر آئے۔ تحسین کو بتایا گیا کہ مجھے کیا خریدنا ہے۔ وہ مجھے 'یوریشیا' نام کی ایک بہت بڑی دکان میں لے گئیں۔ دکان کیا یہ ایک چھوٹا موٹا مال تھا جس کے الگ الگ حصوں میں سب طرح کے ملبوسات موجود تھے۔ ہم اوپر چڑھ کر 'زنانہ لباس' والے حصے میں پہنچے جہاں میں نے کچھ اپنی کچھ بھابھی کی پسند سے زنانہ سوٹ کے کپڑے خریدے۔ اور جب ہم نیچے اِن کپڑوں کے دام دینے آئے تو کاؤنٹر پر بیٹھے ایک شخص نے جو غالباً اس بہت بڑی دکان کا مالک تھا مجھے یوں دیکھا جیسے وہ مجھے کہیں دیکھ چکا ہو۔

''آپ شاید کانفرنس میں آئے ہیں۔'' رسید بناتے بناتے اُس نے مجھ سے کہا۔

''جی ہاں۔ اور آپ کی دکان کے کپڑے خریدنے بھی۔''

کراچی کے سارے اخباروں میں کانفرنس کی خبریں تصویروں کے ساتھ ہر روز نمایاں طور پر شائع ہو رہی تھیں۔ ممکن ہے انہیں تصویروں میں انہوں نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ میں نے سوچا یہاں کے دکاندار بھی ادب دوست ہیں۔ 'یوریشیا' سے نکلنے کے بعد تحسین ہمیں دو۔ ایک دکانوں پر اور لے گئیں جہاں سے ہم نے کچھ اور ملبوسات خریدے۔ پھر ہم بہادر آباد روڈ سے متصل طارق روڈ پر پشاوری کی دکانوں کی طرف آئے۔ لکھنؤ سے چلتے وقت اپنی خریداری کی فہرست میں میں نے پشاوری کو خاص طور پر شامل کیا تھا۔ ان دکانوں پر آ کر جس شکل کی پشاوری مجھے چاہیے تھی، میں نے دیکھنا شروع کی لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ زیادہ تر دکانوں پر یہ پشاوریاں آگے سے کھلے ہوئے منہ کی تھیں اور مجھے تلاش تھی بند منہ والی کی۔ دو۔ چار دکانوں پر اچھی طرح دیکھنے کے بعد ایک دکان پر میری مراد بر آئی۔ 'ناگرہ ہاؤس' نام کی اس دکان پر میں نے دکاندار سے کچھ بولے بغیر سامنے لگی ہوئی پشاوریوں کو دیکھنا شروع کیا اور جب مجھے اپنی والی نظر نہیں آئی تو دکاندار نے مجھ سے پوچھا:

''کیسی چاہیے ہے؟''

''بند منہ کی۔''

''نمبر کیا ہے پیر کا؟''

''آٹھ ہندستانی۔''

یہ سُن کر دکاندار نے چونک کر مجھے یوں دیکھا جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ میں کہنا کیا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ ہندستان میں آٹھ نمبر کا جوتا پاؤں میں آتا ہے۔ یہاں پیر میں ڈال کر دیکھ لیجیے۔ اس نے میرے پیر کے نمبر کا اندازہ کر کے فوراً ہی کتھئی رنگ کی ایک پشاوری نکالی اور اس سے پہلے کہ وہ اسے میرے سامنے رکھتا میں نے کہا:

''کالے رنگ کی نکالیے، کالے رنگ کی۔''

''کالی بھی مل جائے گی۔'' اس نے کہا۔ پھر کالے رنگ کی نکال کر میرے سامنے رکھتے

ہوئے بولا: ''پہنیے۔''

میں نے پہنی تو پاؤں میں پوری طرح آگئی۔ چل کر دیکھا تو بہت بھاری لگی۔

''بہت بھاری ہے۔'' میں نے کہا۔

''خالص چمڑے کی ہے۔ اس کا سول بھاری ہوتا ہے۔''

''کتنے کی ہے؟''

''ڈھائی ہزار۔''

''ڈھائی ہزار! یہ تو بہت ہیں۔''

''دام ایک ہیں۔'' اس نے کہا۔

میں اس وقت لکھنؤ والی پشاوری پہنے ہوئے تھا۔ اس پشاوری کو اسے دکھاتے ہوئے میں نے اس سے کہا:

''اِسے دیکھ رہے ہیں۔ یہ لکھنؤ میں چھ سو کی ملی ہے۔''

اس نے میری پشاوری کو اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی حقیر سی شے ہو۔ بہت پہلے جب ہمارے یہاں پاکستانی اقارب کی سی خوشحالی نہیں تھی، وہاں سے آنے والے ہمارے عزیز بتاتے تھے کہ وہاں مول تول کو معیوب سمجھا جاتا ہے سو میں نے مزید کچھ کہے بغیر پسند آجانے والی پشاوری کی قیمت ادا کی۔ 'ناگرہ ہاؤس' کے مالک نے خالص کاروباری انداز میں پیسوں کو گنا اور پشاوری کو میرے حوالے کر دیا۔ اس پورے سودے میں دکاندار نے مسکراہٹ کو شجرِ ممنوعہ جانا اور ہم اُس کے ہونٹوں پر ہنسی کی ایک بھی لہر دیکھے بغیر وہاں سے چلے آئے۔

میانِ بتانِ چیں

خریداری پوری ہونے کے بعد ہم شعیب کے گھر آئے۔ بھابھی اور تحسین یہاں کچھ دیر بیٹھے۔ شعیب کی بیوی سے ان لوگوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں پھر وہ لوگ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد شعیب نے باہر کھانے کا پروگرام بنایا۔ میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد تیار ہو گیا۔ شعیب، میں، شعیب کی بیوی اور اُن کا چھوٹا بیٹا..... یہ چار عسکری۔۴ سے باہر نکلے اور بہت سی بارونق سڑکوں سے گزرتے ہوئے چینی کھانوں والے ایک دو منزلہ ہوٹل کے سامنے

جا کر رکے جہاں شعیب کے بیٹے نے گاڑی سے اتر کر معلوم کیا کہ بیٹھنے کی جگہ ہے؟ بتایا گیا نہیں۔ بکنگ بہت لمبی ہے اور جگہ بہت دیر تک نہیں ملے گی۔ یہاں میری نگاہ کے سامنے شکاگو کا وہ صابری ہوٹل آ گیا جہاں نہاری اور خمیری روٹی کھانے کے لیے ٹوکن لے کر ہمیں بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا تھا اور نمبر آنے پر جب ہم نے روٹی اور نہاری کھائی اور ہمارے میزبان نے پوچھا کیسی ہے؟ تو میں نے کہا: ''رحیم کے مقابلے میں بالکل پھیکی۔''

انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے انہیں بتایا کہ فی الوقت لکھنؤ کی دو ہی چیزیں مشہور ہیں: ''رحیم کی نہاری اور ٹنڈے کے کباب۔'' اس ہوٹل سے ناامید ہو جانے کے بعد شعیب کے بیٹے نے گاڑی آگے بڑھائی اور سمندر کی راہ پکڑی۔ شعیب رات کی روشنیوں میں بہت صاف نہ دکھائی دینے والی عمارتوں کے بارے میں مجھے بتاتے رہے۔ یہ آصف زرداری کا گھر ہے، 'بلاول ہاؤس'۔ اس کی دیوار یہاں تک ہے۔ یہ فلاں عمارت ہے۔ یہ یہاں کا سب سے بڑا مال ہے۔ اب ہم سمندر کے علاقے میں داخل ہو رہے ہیں۔ انہیں باتوں میں ہماری گاڑی ''چائنا ٹاؤن'' کے سامنے جا کر رکی۔ شعیب نے مجھے بتایا: ''چینی کھانوں کا یہ کراچی کا سب سے مشہور ہوٹل ہے۔'' ہم اس خوبصورت ہوٹل میں داخل ہوئے تو ہر چینی ہوٹل کی طرح یہاں بھی دیواروں پر چینی مصوری کے مرقعے نظر آئے۔ ہوٹل کے کاؤنٹر اور اس سے ملے ہوئے کمرے میں جو بتانِ چیں ہم کو نظر آئے وہ بڑی روانی سے اردو بول رہے تھے۔ ان میں اچھی صورت شکل والی ایک جواں سال خاتون نے مسکرا کر ہمیں دیکھا اور استقبالیہ انداز میں اُن زینوں کی طرف اشارہ کیا جن سے اتر کر ہمیں کھانے والے ہال میں جانا تھا۔ زینے اتر کر ہم ہال میں داخل ہوئے تو خوش قسمتی سے ابھی ابھی خالی ہونے والی ایک میز ہمیں نظر آ گئی۔ غیر چینی ویٹر نے ہمیں اسی پر لے جا کر بٹھا دیا۔ ہال میں چاروں طرف طرح طرح کے خوش رنگ چینی فانوس لٹک رہے تھے اور اُن کی رومان انگیز مدھم روشنی آنکھوں کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ شعیب نے سب کی پسند پوچھ پوچھ کر آرڈر لکھوایا۔ میں نے یہ کھانے میز پر آنے تک پورے ہال کا نگاہ ٹھہرا ٹھہرا کر جائزہ لیا۔ ساری میزوں پر اچھی شکلوں والے خوشحال خاندانوں کے افراد جی لگا کر چینی کھانے کھا رہے تھے۔ ان میں بچے بھی تھے،

جوان بھی اور بوڑھے بھی۔ زیادہ تر میزوں پر تین نسلوں کی نمائندگی ہو رہی تھی۔ یہاں جینس بھی نظر آ رہی تھی، اونچی ایڑی کی چپلیں بھی، شلوار قمیص بھی، چوڑی دار پائجامے بھی اور اکا دکا ساریاں بھی۔ اور وہ برائے نام برقعے بھی جنہیں بوڑھی عورتیں روایت کی علامت کے طور پر پہن کر آئی تھیں اور جنہیں اِن بی بیوں کے شانوں کے اوپر آنے کی رضا نہیں ملی تھی۔ ایک دو میزوں پر کچھ تازہ واردانِ حجلۂ عروسی بھی نظر آ رہے تھے جو سروں کو جوڑے ہوئے ہر لقمے کے ساتھ مسکرا مسکرا کر اپنی محبتوں کو مستحکم کر رہے تھے۔ ان میں سے اُنہیں جن کا تعلق جنسِ نرینہ سے تھا، دیکھ کر مجھے یہ مشہور لطیفہ یاد آنے لگا:

بیاہ کے دن اپنے گھر سے رخصت ہوتے وقت جب دلہن بہت زیادہ رونے لگی تو کسی نے پوچھا:

''خوشی کے موقع پر یہ رو کیوں رہی ہے؟''

جس سے پوچھا گیا تھا اُس نے اُس سواری کی طرف جس پر بیٹھ کر دلہن کو اپنے شوہر کے گھر جانا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''وہ سواری دیکھ رہے ہو، گلی کے نکڑ پر۔''

''دیکھ رہا ہوں۔''

''بس یہ وہیں تک روئے گی، باقی عمر اس کا شوہر روئے گا۔''

ہال میں ان سب لوگوں کو دیکھ کر مجھے خوشحال کراچی کی خوش بختی پر رشک آیا اور کچھ دیر کے لیے میں اُن پٹھان بچوں کو بھول گیا جو بڑی محنت اور مہارت سے آٹو رکشا چلاتے ہوئے دکھائی دیے تھے۔ میں ان لوگوں کو بھی بھول گیا جنہیں میں نے کھلی ہوئی سڑکوں کے کنارے پھلوں کے ٹھیلے اور چھوٹی چھوٹی دکانیں لگائے دیکھا تھا۔ میری آنکھوں سے کراچی یونیورسٹی کے عقبی علاقے کی وہ سڑکیں بھی اوجھل ہوگئیں جن پر رؤف پاریکھ سنبھال سنبھال کر اپنی گاڑی چلا رہے تھے۔ ہر بڑے اور ترقی یافتہ شہر میں ان دونوں منظروں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ نوبیل انعام یافتہ ماہر اقتصادیات امرتیا سین نے کہیں پر ایک بہت بلیغ جملہ لکھا ہے: ''دنیا کے سب سے غریب لوگ سب سے زیادہ مہنگی زمینوں پر رہتے ہیں۔''

یہ زمینیں ان غریبوں کا عارضی مسکن ہوتی ہیں۔ جب ان کے بہائے ہوئے پسینے سے اِن پر اونچی عمارتیں کھڑی ہو جاتی ہیں تو ان کے مسکن دوسری مہنگی زمینوں پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ سو جہاں اَمارت ہوتی ہے، غربت وہاں برائے کفالت موجود ہوتی ہے۔

دیے ہوئے آرڈر کی چیزیں میز پر لگائی جا چکی تھیں اور ان میں شعیب کے بیٹے کی فرمائش پر ماہیِ مسلّم والی ایک خصوصی ڈش بھی تھی۔۔ اصل چینی کھانوں سے باہر کی یہ چیز مجھے ذائقے میں سب سے زیادہ اچھی لگی۔ کھانے کے دوران میں نے دیکھا کہ وہ بانوئے بت کدۂ چیں جو مجھے زینے اترنے سے پہلے نظر آئی تھی، میزوں پر جا جا کر لوگوں سے بڑی خندہ پیشانی سے پوچھ رہی ہے: ''کوئی شکایت تو نہیں۔'' اور تب میں نے اندازہ کیا کہ وہ اِس خوراک خانۂ خوب تر کی یا تو مالکہ ہے یا منتظم۔ اُسی خاتون کے قبیلے کی کچھ اور خوش شکل خواتین ہوشربا لباس پہنے بیروں کو ہدایتیں دے رہی تھیں اور میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنے پیشہ ورانہ تبسم کی تابشیں دکھا رہی تھیں۔ بتانِ ملکِ چیں کے اِن خندہ ہائے دل فریب کو دیکھ کر خمار بارہ بنکوی کا ایک واقعہ میرے حافظے میں کوندے کی طرح لپکا:

خمار صاحب ایک مشاعرے کے سلسلے میں پہلے پہل امریکہ گئے تو ان کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ یہاں گھومے وہاں گئے۔ ان سے ملے اُن کو دیکھا، یہاں دعوت، وہاں کھانا۔ دو۔ چار دن بعد جب ان چیزوں سے اکتا گئے، تو میزبانوں سے بولے:

''بھئی سب کچھ دکھایا، لیکن وہ نہیں دکھایا جو دیکھنے کی چیز ہے۔''

پوچھا گیا: ''کیا؟''

بولے: ''خانۂ خوبانِ مغرب۔''

اور جب میزبان انہیں ایک ایسے ہوٹل میں لے گئے جہاں مختصر پوشاکوں میں نوعمر لڑکیاں کھانے والوں کی میزبانی کر رہی تھیں تو شاعر خمار بارہ بنکوی نے انہیں گھور گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اُس وقت حال اُن کا یہ تھا:

ہر چند پیرِ خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

جب خمار صاحب اُن خوبانِ مغرب کو جی بھر کر دیکھ چکے تو میز بانوں نے پوچھا:

''کیسا لگ رہا ہے۔''

خمار صاحب برجستہ بولے: ''غلط عمر میں صحیح جگہ پر آئے ہیں۔''

ہم نے اپنی میز پر لگے ہوئے کھانے مزے لے لے کر کھائے۔ میں ہندستان کے بہت سے چینی ریستورانوں میں گیا ہوں لیکن جگہ کے اعتبار سے اتنا بڑا اور ایسے خوش ذائقہ کھانوں والا ہوٹل میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ کھانا کھا کر ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو کچھ دور ایک کھلی ہوئی جگہ پر بڑے بڑے کھٹولے پڑے تھے اور ان پر بیٹھے ہوئے لوگ اپنے سامنے رکھے ہوئے حقوں کے کش لے رہے تھے۔ یہ حقے لکھنوی حقوں سے مختلف تھے۔ لکھنؤ میں حقہ سازی نے ایک فن کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نیچے، نالیں، مہنال، پیندے (فرشی)، چلمیں، چلم پوش... سب میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کی جاتی تھیں اور تمبا کو بھی کئی طرح کی ہوتی تھی۔ میں ان کھٹولوں، حقوں اور کش لیتے ہوئے لوگوں کو دیکھتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ واپسی میں شعیب ہمیں اس راستے سے لے کر آئے جو سمندر سے بہت قریب تھا لیکن سمندر ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس بہت کھلے، روشنیوں سے بھرے اور صاف ستھرے علاقے میں کچھ کچھ دور پر کھانے کے چھوٹے چھوٹے ہوٹل اور آئس کریم پارلر تھے۔ ہم ان سب کو دیکھتے ہوئے سمندر کے حدود سے نکل کر شہر کی بڑی شاہراہ پر آئے اور سناٹی سڑکوں سے گزرتے ہوئے عسکری۔ ۲ پہنچ گئے۔

فرّخ والا تبار

ادیب اور محقق اسلم فرخی کا ذکر ہم اپنی طالب علمی کے زمانے سے سنتے آئے ہیں۔ یہ ذکر ہم نے سب سے زیادہ نیر مسعود کی زبان سے سنا تھا۔ دوسرے تیسرے ہم جب بھی ان کے دولت کدے پر جاتے کسی نہ کسی بہانے فرخی صاحب کا ذکر ضرور نکل آتا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ نیر مسعود اور ان کے والد دونوں محمد حسین آزاد کے بہت قائل اور دونوں کا خیال تھا کہ آزاد کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ آزاد کے ساتھ انصاف کرنے والوں میں اوّلیت اسلم فرخی کو حاصل ہے جنھوں نے دو جلدوں میں آزاد پر اپنا ضخیم مقالہ لکھ کر آزاد کو ان کی پوری تحریروں اور ساری خصوصیتوں کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ میں نے یہ دونوں جلدیں نیر مسعود سے لے کر پڑھی تھیں اور انہیں پڑھنے کے

بعد اسلم فرخی کی آزاد شناسی کا قائل ہو گیا تھا۔ آزاد پر اب تک جتنا بھی کام ہوا ہے وہ ایک طرف اور اسلم فرخی کا یہ کارِ عالمانہ ایک طرف۔ آج بھی آزاد پر ہونے والی تحقیقوں میں ان کی کتاب کو معتبر حوالے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ آصف بار بار لکھنؤ آئے لیکن اسلم فرخی لکھنؤ چھوڑ کر گئے تو دوبارہ اس شہر میں نہیں آئے۔ مجھے کراچی میں جن لوگوں سے ملنے کا اشتیاق تھا ان میں ایک اسلم فرخی بھی تھے۔ پھر یوں ہوا کہ میرے ناولٹ ''دکھیارے'' کے پاکستان پہنچنے کے بعد ایک دن آصف کا فون آیا، علیک سلیک کے بعد انہوں نے بتایا:

''بھئی ابا نے جب سے آپ کا ناولٹ پڑھا ہے وہ آپ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کہا:

''آپ جب کانفرنس میں آئیں تو ایک دن ان کے لیے ضرور نکالیں۔''

''وہ میرا ناولٹ نہ بھی پڑھتے تب بھی میں ان سے ملنے ضرور آتا۔'' میں نے کہا۔

''ان کی آنکھیں بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ انہوں نے محدب شیشے سے دیکھ دیکھ کر اسے پورا پڑھ ڈالا۔'' آصف نے بتایا۔ پھر بتایا: ''اصل میں آپ نے اپنے ناولٹ میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے ان میں سے بیشتر اُن کے دیکھے ہوئے ہیں۔ اسے پڑھ کر ان کی یادیں تازہ ہوگئی ہیں۔''

''ان سے کہہ دیجیے میں ضرور حاضر ہوں گا۔''

تو آج انہیں اسلم فرخی سے ملنے کا دن تھا۔ صبح دیر سے اٹھ کر میں نے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ فراست نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے شعیب کے گھر سے آ کر لیں گے اور اسلم فرخی صاحب کے یہاں پہنچا دیں گے۔ اس لیے ناشتے سے فارغ ہو کر میں فراست کے فون کے انتظار میں بیٹھا شعیب کے ساتھ پرانی یادیں تازہ کر رہا تھا:

''یار وہ تمہیں روزہ کشائی والا واقعہ یاد ہے۔ ہم افضل محل میں رہتے تھے اُس وقت۔''

''یاد ہے۔ اِس میں جو پیسے ملے تھے تمہیں، اس سے تم کرکٹ کا سامان لے آئے تھے۔''

''ہاں۔ کُل گیارہ روپے ملے تھے۔ چھ کا بلاّ۔ ایک ایک روپے کے چار وکٹ اور ایک روپے کی کاٹ کی بال۔''

''نظیر آباد میں ولسن کی دُکان سے لائے تھے شاید۔''

''ہاں گھر لا کر اسے دو دن تک اماں سے چھپائے رکھا۔''

''ولسن کی دکان ہے ابھی نظیر آباد میں؟''

''ہے، لیکن اب کھیل کے سامان کی اور بہت سی دکانیں کھل گئی ہیں۔''

''کیا جنون تھا کرکٹ کا اُس وقت۔''

''ہاں۔ ریڈیو بھی تو اُس وقت بہت نہیں تھے۔ ہمارے محلہ کے برابر غازی منڈی میں کرکٹ کے شوقین ایک جانی صاحب تھے۔ جوتے کا کارخانہ تھا اُن کا۔ کمنٹری سننے کے لیے انہوں نے ریڈیو خریدا تھا۔ دولہا صاحب کے ہوٹل سے اٹھ کر ہم لوگ وہیں جاتے تھے سننے کمنٹری۔'' میں نے شعیب کو بتایا۔ پھر اس سے پوچھا:

''تمہارے ایک ماموں تھے علی اکبر صاحب، کہاں ہیں؟ پاکستان تو آئے نہیں تھے وہ۔''

''ہاں وہ وہیں رہ گئے۔''

''یاد ہے جب ایکسٹرا کلاس لیتے تھے شیعہ اسکول میں تو چائے پلاتے تھے۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ فراست کا فون آیا: ''حضور آداب: میں آ رہا ہوں۔''

''آیئے آیئے۔ میں تیار ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد فراست رونق حیات کے ساتھ آ گئے۔ کچھ دیر ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھے۔ آصف فرخی کو ہماری آمد کے بارے میں بتایا اور اس کے فوراً بعد ہم اسلم فرخی کے دولت کدے کی طرف چل دیے۔ فراست نے ہمیں ان کے دروازے تک پہنچایا، دستک دی اور جب آصف باہر نکل کر مجھ سے بغل گیر ہوئے تو فراست یہ کہہ کر کہ مجھے بہت سے کام ہیں، وہاں سے رخصت ہو گئے۔ لیکن جاتے جاتے یہ بھی کہہ گئے کہ جب یہاں سے آپ کو فرصت ہو جائے تو فون کر دیجیے گا میں لینے آ جاؤں گا۔

گلشنِ اقبال میں اسلم فرخی بہت بڑے سے مکان میں بہت اچھی اور پرسکون جگہ پر رہتے ہیں۔ آصف نے بڑی محبت سے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا، اندر گئے اور تھوڑی دیر بعد اپنے والدِ ماجد اسلم فرخی کو سہارا دیتے ہوئے باہر لائے۔ میں نے اٹھ کر پہلے انہیں سلام کیا پھر مصافحہ۔ سر سے پیر تک سفید لباس میں ملبوس اسلم فرخی جب صوفے پر اچھی

طرح بیٹھ گئے تو میں نے اُن سے کہا:

''بہت اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔ نیرؔ مسعود صاحب سے بہت ذکر سنا ہے آپ کا۔''

''کیسے ہیں نیرؔ صاحب؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ٹھیک نہیں ہیں، چل پھر نہیں پاتے۔ پوری طرح صاحبِ فراش ہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر کہا: ''آپ ہی کی کتاب پڑھ کر ہم نے آزاد کو سمجھا ہے۔''

''جی۔ لوگوں نے پسند کیا میرا کام۔ یہی بہت ہے۔'' انہوں نے بڑی خاکساری سے کہا۔

آصف اپنے والد کے پہلو میں بیٹھے تھے اور ایک سفید رومال سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کے منہ سے نکلنے والی رال پونچھتے جا رہے تھے۔ معالج، ادیب، افسانہ نگار آصف کی فرزندی کا یہ پہلو مجھے بہت اچھا لگا۔ یہی نہیں کچھ کچھ دیر بعد وہ چائے کی پیالی بھی ان کے مونھ تک لے جاتے اور جب بزرگ فرخی چائے کا گھونٹ لے لیتے تو بزرگ داشت فرخی یعنی آصف چائے کی پیالی ان کے سامنے سے ہٹا لیتے۔

''بھئی آپ کا ناولٹ بہت اچھا ہے۔'' رسمی باتوں کے بعد اسلم فرخی بولے۔

''جی بس ہو گیا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں وہ جو جوشامہ کا کردار ہے اسے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔''

''جی بس.....''

''اور بڑے بھائی کا کردار.....اور ماں......دونوں بہت........'' کچھ توصیفی جملے کہنے کے بعد انہوں نے پوچھا:

''اچھا یہ بتائیے۔ وہ جو مولوی گنج میں ایک بڑی سی مسجد تھی.....''

''اب اس کی صورت بدل گئی ہے۔ بہت شاندار ہو گئی ہے۔''

''اور امین آباد میں وہ اصغر علی محمد علی کی عطر والی دکان۔؟''

''کچھ برس پہلے تک اسی عمارت میں تھی جس میں آپ نے دیکھی تھی۔'' میں نے کہا۔ پھر انہیں بتایا:

''ان کا عطر والا کارخانہ بند ہو گیا ہے۔ کارخانے کی زمین پر مارکیٹ اور فلیٹ بن گئے ہیں۔''

''امین آباد بھی بدل گیا ہوگا؟''

''بالکل۔ اب پارک بھی نہیں رہا، امین الدولہ پارک۔ وہاں زیرِ زمین پارکنگ بن گئی ہے۔'' یہ بتا کر میں نے انہیں بتایا: ''پرانی عمارتیں ابھی موجود ہیں لیکن ان عمارتوں میں جو دکانیں ہیں ان کی صورتیں بدل گئی ہیں۔''

''وہ مولوی گنج کی بڑی مسجد کے سامنے 'حج ہاؤس' کی ایک عمارت تھی؟''

''جی۔ اب 'حج ہاؤس' وہاں نہیں ہے۔''

''اور وہ نخاس سے امین آباد جانے والی سڑک پر نادان محل پارک....؟''

''ہے، اس میں انگریزوں کی کچھ قبریں بھی ہیں۔''

''اور فرنگی محل......؟''

''مشہور ہستیوں میں اب وہاں کوئی نہیں۔ سب دنیا سے اُٹھ چکے۔'' میں نے کہا۔ پھر بتایا: ''پرانے لوگوں میں لکھنؤ کی وضع قطع والے اب صرف متین میاں رہ گئے ہیں۔''

اسلم فرخی نخاس، اکبری دروازہ، امین آباد، مولوی گنج، نادان محل روڈ اور لکھنؤ کے پرانے محلوں کے جو جو نام انہیں یاد آتے گئے، ان کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میں انہیں بتاتا رہا۔ ان سب کی بابت پوچھنے کے بعد وہ پھر ناولٹ کی طرف آ گئے۔ کبھی اس کی زبان کے بارے میں بات کرتے کبھی اس میں بیان کیے ہوئے مقامات کے بارے میں تو کبھی کرداروں کے بارے میں۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا کہ ایک شخص جس نے بہت سے ناولوں کو پڑھا ہے، زبان کے رموز کو سمجھتا ہے، افسانوی ادب کے آداب سے واقف ہے اور ایک معروف افسانہ نگار کا پیدا کرنے والا ہے، وہ اتنی تفصیل سے اور اتنی دیر تک میرے ناولٹ کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ ان سب باتوں میں بہت دیر ہوگئی۔ اسلم فرخی تھکنے لگے تھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ لکھنؤ کے بارے میں اور باتیں کریں، ایک ایک محلّے کا حال پوچھیں، اُن ہستیوں کے بارے میں جانیں جو ان کے قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں وہاں تھیں۔

''اب اندر چلیے۔ یہ پھر آئیں گے۔'' آصف نے اپنے والد سے کہا۔ پھر مجھ سے بولے: ''زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتے۔ آپ کی وجہ سے اتنی دیر بیٹھ گئے۔''

میں نے فراست کو فون کیا۔ وہ اسی علاقے میں کہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد رونق حیات کی گاڑی آصف کے دروازے پر آ گئی۔ فراست نے مجھے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے اسلم فرخی صاحب سے اجازت لی، آصف مجھے دروازے تک پہنچانے آئے اور ہم رونق حیات کی گاڑی میں بیٹھ کر آصف کے مکان والی سڑک سے باہر نکل آئے۔ سڑک سے باہر نکلتے ہی ایک جگہ ایک بڑے سے مکان کے دروازے پر ہمیں فراست کے فرزندِ ارجمند جو فراست کے لیے

ع آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جاں

ہیں، ہانی دکھائی دیے۔ وہ اپنے ہم عمر دوست سے محوِ گفتگو تھے۔ فراست نے گاڑی رکوا کر جب ہانی سے وہاں کھڑے ہونے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ فراست کی گاڑی جو اس وقت اُن کے پورِ پُر نور کے تصرف میں تھی، اُس کا کلچ فیل ہو گیا ہے۔ ہانی فوراً ہی رونق حیات کی گاڑی لے کر قریب کے کسی میکینک کو لے آئے۔ فراست نے انہیں میکینک کے محنتانے کی رقم دی اور ہانی کے انکار کے باوجود اُسے اچھے خاصے پیسے جیب خرچ کے دیے:

ع اللہ یہ محبتِ فرزند اور یہ پیار

ہم ہانی اوران کے والدِ بزرگ کی گاڑی وہیں چھوڑ کر وہاں سے چل دیے۔ راستے میں اچانک فراست نے گاڑی ایک سڑک کی طرف مڑوائی۔ کچھ دور چلنے کے بعد رونق حیات نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کی۔ ہم گاڑی سے اتر کر ایک تنگ گلی میں داخل ہوئے اور تب فراست نے کہا: ''آیئے آپ کو محسن ملیح آبادی سے ملوائیں۔'' ہم ان کے دروازے پر پہنچے۔ دق الباب کے بعد ایک صاحب برآمد ہوئے۔ انہوں نے ہمیں لے جا کر چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ پھر شاعرِ بزرگ محسن ملیح آبادی تشریف لائے۔ اسی پچاسی برس کا سِن لیکن چہرے پر ملیح آباد کی پٹھانیت نمایاں تھی۔ فراست نے ان سے ہمارا تعارف کرایا۔ لکھنؤ اور ملیح آباد کی باتیں نکلیں۔ چائے آئی۔ محسن صاحب نے اپنا کلام سنایا پھر ایک ضخیم دیوان رباعیوں کا بہ عنوان 'دانش و بینش' اور غزلیات کا ایک مجموعہ 'بسیط' مجھے مرحمت فرمایا۔ فراست کے بقول محسن ملیح آبادی رباعیاں زیادہ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ہم جتنی دیر بیٹھے محسن صاحب کے صاحبزادے ہماری تصویریں کھینچتے رہے۔ پھر ہم اٹھے۔ اور فقیر محمد خاں گویا کی

زمین سے تعلق رکھنے والے اس شاعر سے رخصت لے کر اس کے گھر سے باہر نکل آئے۔

شام ہو چکی تھی۔ فراست کے گھر پہنچ کر ہم نے ان کے ڈرائنگ روم میں اپنے پیر پھیلائے۔ بھابھی نسیم نازش نے میرے لیے دلیا بنایا۔ فراست اور رونق حیات نے کچھ اور کھایا۔ رونق حیات کو میں پہلے ہی دن سے فراست کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ فراست کے بہت بے تکلف دوست ہیں۔ بہت دل چسپ آدمی ہیں۔ ان کے مشغلوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ شاعری بھی کرتے ہیں، تجارت بھی اور مکان اور فلیٹ بنوا کر انہیں فروخت بھی کرتے ہیں۔ بہت حسن پرست ہیں۔ خوبصورت چہروں پر اگر ایک بار نگاہ پڑ جائے تو آسانی سے نہیں ہٹاتے۔ بقولِ فراست ایک سے زیادہ شادیاں کی ہیں اور جو ممکن نہیں تھا، اسے ممکن کر دکھایا۔ یعنی سب شرکائے حیات 'حصۂ حیات' میں برابر کی شریک ہیں اور اپنے اپنے معاملات میں سب ٹھیک ہیں۔ رونق حیات جب اس 'کارِ زن افزونی' کا ذکر کرتے ہیں تو فخر سے ان کا سینہ پھول جاتا ہے۔ مجھے اُن کی بیویوں کی عمریں نہیں معلوم لیکن میں دعا گو ہوں کہ خدا ان کی موجودہ عمر کو دائم اور جسم میں ان کے قوت کو قائم رکھے۔ ذاتی زندگی کی اِن عیش سامانیوں سے قطعِ نظر رونق آدمی بہت بھلے ہیں۔ کام کسی کا ہو اور کسی طرح کا ہو، انجام دینے کے لیے کمر بستہ رہتے ہیں۔ کم سے کم اس حد تک تو اُن کی کمر میں بہت جان ہے۔ فراست پر جان چھڑکتے ہیں اور اس کی سخت باتوں کو بھی سہہ لیتے ہیں۔ کراچی کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے انہوں نے اپنی ایک۔ دو بیگمات کے محل (فلیٹ) بھی دور سے دکھائے۔ حاصل اُن کی صحبت کا یہ تھا کہ ہم ان کی قسمت پر رشک اور اپنی بدبختی پر افسوس کرتے رہے کہ وہ جو ایک ہاتھ صیغۂ نکاح کے پڑھے جانے کے بعد تھاما تھا، اب تک اسی کی گرفت میں ہیں۔

رونق حیات کچھ کھا کر اور ہمارے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر یہ بتائے بغیر چلے گئے کہ وہ اپنے بہت سے محلوں میں سے کس محل کی طرف جا رہے ہیں۔ اسی بیچ فراست کے فرزند ہانی آئے۔ ریفریجریٹر سے اسپرائٹ کی ٹھنڈی بوتل نکالی۔ جرعہ جرعہ اسے پی کر انہوں نے ہمیں اپنی کار ریسنگ کے قصے سنائے۔ اس کی مہم جویانہ باتیں سن کر میں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا پھر دل میں کہا:

راتیں یہ عیش کی ہیں مرادوں کے ہیں یہ دن
پورے جواں نہیں ابھی کیا ہے تمہارا سن

ہانی نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ آگے کی پڑھائی میں ان کی دل چسپی کا میدان کیا ہے۔
میں نے یہ سوچ کر کہ پاکستان میں اس عمر کے بچوں میں کرکٹ کا جنون زیادہ ہوگا، اس کے پسندیدہ کھلاڑیوں کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا اسے کرکٹ سے قطعی دلچسپی نہیں بلکہ وہ تو فٹ بال کا شیدائی ہے۔ ہانی سے باتیں کرنے کے بعد شہر لکھنؤ کی باتیں چل نکلیں۔

''وہ ایک ولی کمال خاں تھے۔ صاحب کیا کمال کے آدمی تھے۔ امین آباد کے چوراہے پر کھڑے ہوکر گالیاں بکنے لگتے تھے۔'' فراست نے کہا:

''ہاں ایک بار 'اردو یا موت' والی تحریک میں اسی امین آباد کے چوراہے پر چرن سنگھ کو بہت گالیاں دے ڈالیں۔''

''چرن سنگھ اردو مخالف تھے نا؟''

''لاٹھیاں بھی چلوادی تھیں۔''

''اُس میں دو لوگ مر بھی گئے تھے۔''

''نہیں لاٹھی چارج میں نہیں مرے۔ وہ جو اردو محافظ دستے نے بھوک ہڑتال کی تھی۔'' میں نے فراست کو بتایا۔ ''تمہارے کراچی آنے سے دو برس پہلے۔ اس میں جو لوگ بھوک ہڑتال پر بیٹھے تھے، اس میں دو ہندو بھی تھے۔''

''ہاں یاد آیا۔''

''ایک دیونرائن پانڈے دوسرے جے بہادر سنگھ۔ دونوں بہت سن رسیدہ تھے۔ ستر سے اوپر۔ اسی بھوک ہڑتال میں دونوں کی جان گئی۔''

''اور وہ محمد احمد خاں ادیب؟''

''وہ تو چالیس دن بیٹھے۔ پھر انہیں اٹھا کر زبردستی جیل میں ڈالا گیا۔ ان کی تو اس زمانے میں پیکنگ ریڈیو پر خبر آئی تھی۔''

''اور وہ فاروق عطا؟''

''وہ تو سروے سروا تھے۔''

''جسٹس مستنصر اللہ کے گھر میں تھا ان کا دفتر۔ رہتے بھی وہیں تھے شاید۔''

''ہاں وہیں رہتے تھے۔ شادی نہیں کی تھی شاید۔ پوری عمر گزار دی اردو کی لڑائی میں لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔''

''اچھا وہ ہمارے ابراہیم علوی صاحب۔''

'''آگ' اخبار نکال رہے ہیں۔ روزنامہ۔ اچھی طرح جما دیا ہے ماشاءاللہ۔''

''اور وہ یوسف سرسوی جنہوں نے 'آہنگ' پرچہ نکالا تھا۔''

''تین چار برس قبل انتقال ہو گیا۔''

''مجھے یاد ہے۔ آپ مجھے اُن سے ملانے لے گئے تھے۔''

''ہاں۔ ترقی پسند تھے۔ اُن کا ایک شعر یاد آ گیا۔ سن لو۔'':

آئے تھے حالِ دلِ زار سنانے اے دوست
اپنا غم بھول گئے تجھ کو پریشاں پا کے

''اور بھائی شاہ نواز؟ ان کے کیا حال ہیں؟''

''سبکدوش ہونے کے بعد ''صحافت'' اخبار سے منسلک ہیں۔ 'سنڈے میگزین' بھی وہی دیکھتے ہیں۔''

میں اور فراست یادوں کی راہداریوں میں بہت دیر تک گھومتے رہے اور اس یاد آفرینی میں بہت وقت گزر گیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے فراست سے کہا: ''اب چلنا چاہیئے۔'' میں بھابھی سے رخصت ہوا۔ فراست نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور شعیب کے گھر پہنچا دیا۔ شعیب کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں اوپر پہنچا۔ کپڑے بدلے اور کھانے کے لیے نیچے آ گیا۔ کھانے کی میز پر پھر کہیں سے لکھنؤ نکل آیا۔ اسکول کے دنوں کی باتیں۔ شعیب شیعہ اسکول سے حسین آباد کالج چلا گیا میں جبلی کالج۔ لیکن گھومتے کھیلتے ہم ایک ساتھ تھے۔ کبھی کمپنی باغ کے نیچے والے میدان میں کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ کبھی ماہ نگر سے آگے ککریل ندی کے نشیب میں اُگے ہوئے درختوں سے بیر توڑ رہے ہیں۔ کبھی اُن بیروں کو توڑنے کا کوری کے جنگل کی طرف نکل گئے۔ کبھی گومتی میں نہا رہے ہیں۔ کبھی بزازے والی گلی میں بیٹھے کیرم کھیل رہے ہیں۔ شعیب جب انٹرمیڈیٹ میں تھا، اس وقت اسے مردم شماری والے محکمے میں عارضی

طور پر ایک نوکری مل گئی تھی جس میں گھر گھر جا کر گھر میں رہنے والوں کی تعداد معلوم کرنا ہوتی تھی۔ اس کام میں کبھی کبھی میں بھی شعیب کے ساتھ ہو لیتا تھا۔ وہ ہماری اٹھتی ہوئی عمر تھی۔ کسی کسی گھر سے جب کوئی اچھی صورت والی لڑکی باہر نکلتی تو شعیب دیر تک اس دروازے پر کھڑا رہتا اور طرح طرح کے سوال پوچھتا رہتا۔ مجھے یاد ہے، ممکن ہے شعیب کو نہ یاد ہو، اوڈین سنیما کے پیچھے قندھاری بازار والے علاقے میں جب شعیب نے ایک مکان پر دستک دی تو ایک بہت خوبصورت لڑکی باہر آئی۔ شعیب نے اسے اپنے سوالوں میں الجھالیا، اُس گھر میں رہنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے شعیب کو اسے الجھائے رکھنے کا موقع مل گیا۔ جب بہت دیر ہونے لگی تو اندر سے اس لڑکی کی ماں نے آواز دی۔ ماں کی آواز سن کر وہ بولی: ''اب جو کچھ پوچھنا ہے وہ دوسرے بلّے میں پوچھ لیجیے گا۔'' یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی اور میں اور شعیب اس بات پر الجھتے رہے کہ وہ ہم میں سے کس کو زیادہ دیکھ رہی تھی۔

کھانا کھاتے کھاتے شعیب نے پوچھا:

''یار وہ ہماری مسجد کے نیچے جو سیّد حلوائی تھے، ان کے دو لڑکے تھے؟''

''ہاں بابو ڈتے اور قیصر۔'' میں نے اسے بتایا۔ بابو ڈتے کا انتقال ہو گیا۔ مسجد والی دکان ختم ہونے کے بعد بابو ڈتے نے بزازے میں گلی کے نکڑ پر ایک چھوٹی سی مٹھائی کی دکان کھولی تھی مگر وہ چلی نہیں۔''

''اور قیصر؟''

''مسجد کے نیچے والی دُکان میں چکن کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔''

''اچھا وہ قمر والا واقعہ یاد ہے۔ وہ جو موصوف نے ہمارے پہلے والے مکان میں حرکت فرمائی تھی۔''

''یاد ہے۔ اسے مت یاد دلاؤ۔ وہ مرحوم اُس بات کو یاد کر کر کے خود بھی بہت ہنستا تھا۔''

''اور وہ میچ کمپنی باغ کے پیچھے والے میدان میں۔'' شعیب نے مجھے یاد دلایا۔ ''وہ میچ ہم جیت جاتے۔ آخری وکٹ تھا ان لوگوں کا۔''

''ہاں۔ مظفر کی گیند پچ کے وکٹ پر سیدھی آئی لیکن ٹپا کھا کر گھوم گئی۔'' میں نے کہا۔

''اُس کی آف بریک دھری رہ گئی۔ اس میچ کے ہارنے کا بہت افسوس ہوا۔''

باتیں نکلتی رہیں۔ بھابھی یہ باتیں چپ چاپ سنتی رہیں۔ رات زیادہ ہونے لگی تو ہم نے اپنی محفل برخاست کی۔ بستر پر جاتے جاتے شعیب نے مجھ سے پوچھا: ''کل کا پروگرام؟''

''صبح میں انجمن ترقیِ اردو، رات کو زیبا صاحبہ کی دعوت۔''

انجمن گہِ ادب نگاراں

صبح جب میری آنکھ کھلی اور میں نے کمرے سے نکل کر باہر دیکھا تو دن روشنی میں نہا رہا تھا۔ آج انجمن ترقیِ اردو نے اس خاکسار کے لیے ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ مجھے ساڑھے دس بجے انجمن کے دفتر پہنچنا تھا اس لیے میں ناشتہ کر کے جلدی جلدی تیار ہوا اور شعیب کے ساتھ گلشنِ اقبال کے بلاک۔ ۷ میں واقع انجمن کے دفتر ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ شعیب مجھے پہنچا کر واپس چلے گئے۔ انجمن کا دفتر ایک چھوٹی سی عمارت میں ہے جہاں ایک شعبۂ تحقیق ہے، کتاب خانہ ہے، ایک ہال ہے اور دفتر کے عملے کے لیے عہدوں کے اعتبار سے کمرے ہیں۔ میں جلسہ گاہ میں پہنچا تو لوگ وہاں موجود تھے۔ وہ سب بڑے تپاک سے مجھ سے ملے۔ اُنہیں میں ایک شخص بڑی مشکل سے اپنی کرسی سے اُٹھا اور بڑی خوش دلی اور گرم اختلاطی کے ساتھ مجھ سے بغل گیر ہوا۔ میں بھی اُسی محبت سے اس سے ملا مگر اسے پہچان نہ سکا۔ میرے نہ پہچان پانے کو اس شخص نے میرا تغافل جانا اور مجھ سے اپنا تعارف نہیں کرایا۔

بھابھی اور فراست وہاں پہنچ چکے تھے۔ کچھ لوگ آرہے تھے، کچھ لوگوں کا انتظار تھا۔ شاداب احسانی آئے، زاہدہ حنا اور زیبا علوی آئیں، پروفیسر سحر انصاری آئے، عابد رضوی اور عقیل عباس جعفری آئے اور دوسرے اور معزز مہمان آئے۔ لیکن انجمن کے اعزازی صدر پروفیسر ظفر اقبال جو وفاقی اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور فراست کے دوست ہیں، ابھی تک نہیں آئے۔ وہ کہیں مصروف تھے۔ یہ جلسہ انہیں کی صدارت میں تھا، اس لیے ان کا انتظار لازم تھا۔ فاطمہ حسن نے مجھے خصوصی مہمانوں والی جگہ پر لے جا کر بٹھا دیا۔ میرے ساتھ سحر انصاری، زاہدہ حنا، شاداب احسانی اور فراست رضوی بھی اس جگہ پر فروکش ہوئے۔ ہال سامعین سے بھر چکا تھا۔ اخباروں کے نامہ نگار بھی آچکے تھے۔ بس انتظار تھا تو پروفیسر ظفر اقبال

کا۔ وہ دور سے چل کر دیر سے آئے اور جب وہ آئے تو عرفان صدیقی کا یہ مصرعہ مجھے یاد آ گیا:

ع دیر سے پہنچے ہیں ہم دور سے آئے ہوئے لوگ

پروفیسر ظفر اقبال کے آتے ہی جلسہ شروع کر دیا گیا۔ پہلے.. جیسے ہر جلسے میں ہوتا ہے، گل پیشی کی رسم ادا کی گئی۔ پھر عنابی رنگ کی اچھے نقش ونگار والی ساری میں ملبوس جلسے کی ناظم فاطمہ حسن مائک پر آئیں:

ع اک شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح

انہوں نے بناءِ تقریب سے متعلق تعارفی کلمات کہے۔ اس کے بعد ایک مقامی شاعر انور جاوید ہاشمی نے راقم السطور کی ثنا میں ایک نظم بعنوان 'مرحبا' پیش کی۔ نظم سن کر میں نے فی البدیہہ یہ مطلع کہا لیکن انہیں سنایا نہیں:

اچھی بہت یہ نظم ہے جاوید ہاشمی
لیکن غلط ہیں آپ کی باتیں کہی ہوئی

اس مدحیہ نظم کے بعد فراست نے اپنے مضمون میں خاکسار کا قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ میرا جی چاہا کہ اٹھ کر انہیں روک دوں۔ وہ یوں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے تھے وہ سب کا سب صحیح نہیں تھا پھر یہ کہ دوست کی تعریف بس اتنی ہو کہ حقِ رفاقت پر حرف نہ آئے۔ بہرحال فراست نے میری شاعری، میری تنقید، میری افسانہ نگاری — سب کا ذکر کیا اور ناولٹ کی تحسین میں بہت آگے نکل گئے۔ وہ تو خیریت ہوئی مضمون ان کا مختصر تھا ورنہ اُن پر غلو کا الزام عائد ہوتا اور تحسین خواہی کا نشانہ مجھے بنایا جاتا۔

جلسے کے ایک مقرر شاداب احسانی بھی تھے۔ کراچی یونیورسٹی میں ان کے طلبہ کے سامنے جو کچھ میری زبان سے نکلا تھا اس کی بنیاد پر انہوں نے بھی مجھے بہت آگے بڑھا کر ادب کا پورا آدمی اور پورا استاد قرار دے دیا۔ یہ دونوں ہی باتیں ناممکن ہیں۔ نہ کوئی ادب کا پورا آدمی ہوسکتا ہے نہ پورا استاد۔ وہ سلیم احمد کی تحریریں پڑھے ہوئے اور ان کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔ جوشِ خطابت میں اُن کا یہ کہہ دینا مجھے اچھا تو لگ سکتا ہے لیکن سچا نہیں لگ سکتا۔

کراچی کی بڑی ادبی شخصیت اور معروف افسانہ نگار زاہدہ حنا جو اس وقت سرتاقدم

جامۂ سفید میں جلوہ گر تھیں، مائک پر آئیں اور بڑی متانت اور توازن کے ساتھ 'دکھیارے' کا جائزہ لیا اور جذبات سے مغلوب لہجے میں اُن تاثرات کا اظہار کیا جو ناول پڑھ کر ان پر طاری ہوئے تھے۔ پروفیسر سحر انصاری نے اس موقع پر اپنی محبت کا اظہار یوں کیا کہ مجھے لکھنؤ کا معتبر حوالہ قرار دیا۔ میں اُن کی اس محبت پر خوش تو ہوا لیکن نیر مسعود کے ہوتے ہوئے کوئی اور لکھنؤ کا معتبر حوالہ بن جائے، اس پر بھلا کون یقین کرے گا۔ انہوں نے اور بھی توصیفی کلمات کہے اور مجھے شرمندہ کیا۔

اور جب مجھے خطاب کی دعوت دی گئی تو میں نے اپنی پذیرائی اور قدر افزائی کے لیے فاطمہ حسن اور دوسرے صاحبانِ انجمن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تفصیل سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ میں نے سامعین کو بتایا کہ ہندستان میں پاکستانی ادیبوں اور دانشوروں کی آمد پر اُن کی کتنی پذیرائی ہوتی ہے۔ پھر بتایا کہ ہماری دانشگاہوں کے اردو شعبوں میں پاکستان کے ہر بڑے ادیب اور شاعر پر کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ خود میرے شعبے میں فیض، ناصر کاظمی، ظفر اقبال، منیر نیازی اور احمد مشتاق، افتخار عارف، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض وغیرہ پر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ انتظار حسین پر بہت لکھا گیا ہے اور اسد محمد خاں پر لکھا جا رہا ہے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ حال ہی میں میرے ایک شاگرد آشوتوش سریواستو نے ناصر کاظمی پر ایک گرانقدر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ہجرت اور تقسیم کا اچھا یا برا ہونا اپنی جگہ لیکن اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ برّصغیر میں بڑا ادب تخلیق ہوا اور اس بڑے ادب کی تخلیق میں پاکستان کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ بڑا افسانہ بھی یہیں لکھا گیا اور بڑی شاعری بھی یہیں ہوئی۔ یہ سب کہنے کے بعد میں نے یہ بھی کہا کہ ہندو پاک کے رشتوں کو بہتر بنانے اور انہیں مضبوط کرنے میں ادیب اور دانشور ہی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ کام سیاستداں نہیں کر سکتے۔ آخر میں نے کہا کہ جو پذیرائی میری اس شہر میں ہوئی ہے، وہ میرا قیمتی اثاثہ ہے، میں یہاں سے بہت خوشگوار یادیں لے کر جا رہا ہوں۔

خطبۂ صدارت میں ایک بار پھر مجھے اپنی تعریف سننا پڑی۔ تقریب کے صدر ڈاکٹر ظفر اقبال جو فراست کے دوست ہیں انہوں نے فراست نوازی کا حق ادا کرتے ہوئے رفیقِ فراست

انیس اشفاق کی شان میں بہت کچھ کہہ کر یہ بھی کہہ دیا کہ ان کی تحریروں سے پاکستان میں بھی لوگ فیض حاصل کرتے ہیں۔ ان کی زبان سے اپنی مبالغہ آمیز مدح سن کر میری زبان پر یہ شعر آ گیا:

کرے نہ مدح تو آنے کا فائدہ کیا ہے
شریکِ بزم کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں

پروفیسر ظفر اقبال کے توصیفی خطبے کے بعد فاطمہ حسن نے انجمن کی تازہ ترین کتابوں کا ایک set مجھے مرحمت فرمایا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کے بعد چائے نوشی کے دوران میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے بڑے تعریفی انداز میں مجھ سے کہا:

''بڑی حیرت ہے آپ نے اتنی کم عمری میں اتنی کتابیں لکھ ڈالیں۔''

میں نے کہا: ''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ نہ تو میں نے بہت زیادہ کتابیں لکھی ہیں نہ میری عمر اتنی ہے جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر انہیں بتایا: ''ریٹائر ہو چکا ہوں۔''

''واقعی!!''

''جی۔''

''لگتا نہیں ہے۔''

''یہ بات آپ نے کہی میرے خوش ہونے کی۔'' میں نے کہا اور کہہ کر قہقہہ لگایا۔

چائے کے بعد انجمن کے افراد مجھے پورا دفتر دکھانے لے گئے۔ ایک کمرے میں میں نے اس شخص کو دیکھا جو ہال کے اندر مجھ سے بڑے تپاک سے ملا تھا، لیکن جس نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا۔ جو لوگ مجھے اس کمرے میں لائے تھے انہوں نے مجھ سے اس شخص کا تعارف کرایا: ''اور یہ ہیں شہاب قدوائی۔''

اور تب میں اُچھل پڑا۔ میں نے شہاب کو گلے سے لگایا اور دیر تک لگائے رہا۔ یہ شخص یونیورسٹی میں ہمارا ہم جماعت تھا اور جس طرح بہت سے لوگ بغیر بتائے لکھنؤ چھوڑ کر چلے آئے تھے، اُسی طرح یہ بھی ایک دن اپنے ایک بہت عزیز دوست قمریاب جیلانی کو جواب اس دنیا میں نہیں ہے، چھوڑ کر کراچی چلا آیا۔ شہاب... شعبے کا ایک متحرک اور فعال شخص۔ شعبۂ اردو کی لٹریری سوسائٹی کا عہدہ دار۔ طلبہ کے استقبالیے اور الوداعیے کی تقریبات میں پیش پیش۔ میلاد کمیٹی کا رکن

۔شعبے کی ادبی سرگرمیوں میں آگے آگے۔افسانوی ادب کی زود خوانی کے لیے مشہور، ہماری ادبی انجمن 'مجلسِ حملہ آوراں' میں شریکِ بحث، یونیورسٹی کے چائے خانوں میں سلمان عباسی، قمر یاب اوراختر یزداں (سب کے سب مرحوم) کے ساتھ دیر دیر تک بیٹھنے اور شہر کے ادبی اور سیاسی حالات پر گفتگو کرنے والا۔اکبری دروازے سے عبدالعزیز روڈ کی طرف جو راستہ جاتا ہے، اس کے آگے چوپٹیوں کی ایک پتلی سی گلی کے آخر میں تھا اس کا مکان۔خبر نہیں کہ ہے یا بک گیا۔شہاب کو دیکھ کر مجھے سب یاد آنے لگا۔معانقے کے بعد جب میں نے اُسے غور سے دیکھا تو مجھے افسوس ہوا۔وہ بہت بدل چکا تھا۔اس کے چہرے پر پہلی کی سی رونق نہیں تھی۔میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش ہے اور زبان میں کچھ کچھ لکنت۔بال سارے کے سارے سفید۔میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اسے اٹھنے، بیٹھنے اور چلنے میں بھی دقت ہو رہی ہے۔میں نے اسے دیکھا اور افسوس کیا۔شاید اُس کی اسی حالت کی وجہ سے ہال میں داخل ہو کر میں اسے نہیں پہچان سکا تھا۔میرا یہ دوست اب انجمن کے عملے میں شامل تھا۔زیبا علوی نے مجھے اس کی علالت اور ملازمت دونوں کی خبر دی تھی۔میں شہاب کے پاس دیر تک بیٹھا اور اس وقت اٹھا جب مجھے کوئی بلانے آیا۔میں نے شہاب کو پھر گلے لگایا اور اس سے یہ کہہ کر رخصت ہوا: ''پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔''

جلسہ ختم ہونے اور سامعین کے چلے جانے کے بعد فاطمہ حسن انجمن کے دفتر سے ہمیں اپنے گھر لے آئیں۔ان کا گھر گلشنِ اقبال کے اُسی علاقے میں انجمن کے دفتر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔یہاں انھوں نے ہمارے لیے دن کے کھانے کا اہتمام کیا تھا۔فاطمہ حسن نے اپنے بڑے سے گھر کے بہت بڑے ڈرائنگ روم میں ہمیں لے جا کر بٹھایا۔ڈرائنگ روم کے بائیں حصے میں بڑی سی کھانے کی میز لگی تھی جس پر طرح طرح کے کھانے لگائے جا رہے تھے۔لکھنوی زبان میں یوں کہیں کہ دسترخوان پر بڑے اہتمام سے خاصا چنا جا رہا تھا۔زاہدہ حنا اور نسیم نازش ہمارے ساتھ آئے تھے۔عابد رضوی اور عقیل عباس جعفری بعد میں آئے۔فراست کسی کام سے کہیں چلے گئے تھے۔کھانا لگائے جانے کے بعد جب ہم میز پر آکر بیٹھے تو کھانوں میں ہمیں دھوئی ماش کی دال بھی نظر آئی جسے دیکھ کر ہمارا جی خوش ہو گیا۔کئی طرح کے سالن، کباب، پلاؤ اور نہ جانے کیا کیا کچھ سجایا گیا تھا اس میز پر۔لیکن وہ ہاتھ جس نے باورچی خانے

میں یہ خوش ذائقہ کھانے تیار کیے تھے، کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر یہ کسی خان ساماں یا خانمِ ساماں کا ہنر تھا تو مجھے اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ شہر کراچی میں ایسے ہنرمند ہاتھ موجود ہیں۔ بھوک ہماری انتہا پر تھی، کھانا مزے کا تھا اس لیے ہم نے جی لگا کر کھایا اور فارغ الطّعام ہو کر ہم نے ہال میں پڑے ہوئے صوفوں پر قیلولہ کیا۔ اسی قیلولے کے دوران سوتے جاگتے عابد رضوی اور عقیل عباس جعفری سے باتیں بھی ہوتی رہیں۔

قیلولہ ہمارا ختم ہوا تو فاطمہ حسن نے بتایا کہ حبیب یونیورسٹی چلنا ہے وہاں آصف فرخی نے فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور سندھی شاعرہ عطیہ داؤد کے ساتھ ایک گفتگو کا اہتمام کیا ہے۔ سو ہم فاطمہ حسن کے گھر سے نکل کر حبیب یونیورسٹی کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچ کر جب ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو دیکھا کہ اسٹیج پر تینوں خواتین جلوہ آرا ہیں اور آصف ان سے معرکہ آرائی میں مصروف۔ گفتگو بس ابھی ابھی شروع ہوئی تھی۔ ہال میں ہمیں دیکھتے ہی آصف نے ہماری آمد کا اعلان کیا اور سامعین نے تالیاں بجا کر ہمارا استقبال کیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس گفتگو سے قبل 'دانش گاہوں میں تحقیق کی صورتحال' پر ناصر عباس نیرّ نے بہت عمدہ گفتگو کی ہے۔ دیر سے پہنچنے کی بنا پر ہم اس گفتگو سے محروم رہے۔

آصف مکالمے کے ماہر ہیں۔ انہوں نے گفتگو میں طاق لوگوں سے گفتگو کی ہے اور اپنے سوالہائے عاقلانہ سے اکثر اُنہیں لاجواب کر دیا ہے۔ لیکن یہاں تین تیغیں نیام سے باہر تھیں۔ دو کی آب تو میں دیکھ چکا ہوں، تیسری کو اِس سے پہلے غلافِ دہن سے باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ اِن عورتوں کے مقابل آنے پر مجھے آصف پر رحم آرہا تھا۔ وہ اس لیے کہ عورت سارے میدان ہار سکتی ہے لیکن کارزارِ لسان آزمائی میں اس نے اپنی کارآموزی کا لوہا ہمیشہ منوایا ہے۔ سو آصف کے لیے یہ سہ رخی دعوتِ مقابلہ ان کا سخت امتحان تھی۔ نیاموں سے باہر نکلی ہوئی ان تین تیغوں میں سے ایک تیغ (کشور ناہید) کا عالم یہ ہے کہ:

ع ایک بجلی ہے مگر لاکھ جگہ گرتی ہے

لیکن ہمیشہ کی طرح اپنے بہت عمدہ سوالوں سے آصف یہاں بھی سرخرو ہو رہے تھے۔ ایک اچھے متکلم کا ہنر یہ ہے کہ خود کم بولے اور مخاطب کو زیادہ موقع دے، اُسے اشتعال نہ دلائے صرف

اُکسائے، علم نمائی سے گریز کرے اور اس علم کو باہر نکالے جو مخاطب کے اندر موجود ہے۔ آصف بھی یہی کر رہے تھے۔ طرح طرح کے سوالات پوچھ کر انہوں نے تینوں شاعرات کے ادبی موقف، عصری مسائل سے ان کی وابستگی، ان کے تخلیقی عمل اور ان کے لسانی رویوں سے ہمیں اچھی طرح واقف کرا دیا اور تین طاقتور اور طرّار زبانوں کے آتش کدے سے اپنے پیرہنِ استفسار کا ایک بھی تار جلائے بغیر اُن عورتوں کو فاتحانہ انداز سے دیکھتے ہوئے یوں باہر نکل آئے جیسے عرفان صدیقی کی زبان میں کہہ رہے ہوں:

ع تری تیغ تو میری ہی فتح مندی کا اعلان ہے

مکالمہ ختم ہونے کے بعد ہم نے کچھ وقت چائے نوشی میں گزارا، کچھ لوگوں سے ملے، آصف سے وداع لی۔ کشور ناہید اور ناصر عباس نیرّ کو اسی وقت لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا، ان کو رخصت کیا۔ فہمیدہ ریاض کو اپنے ساتھ لیا اور فاطمہ حسن کی گاڑی میں بیٹھ کر دوبارہ ان کے گھر آ گئے۔ فاطمہ حسن نے فہمیدہ ریاض کو سہارا دے کر اتارا۔ پیروں میں تکلیف کی وجہ سے اب اُنہیں سہارے کی ضرورت تھی۔ ہم پھر اسی ہال میں آ کر اسی صوفے پر جس پر کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد بیٹھے تھے، بیٹھ گئے۔ فہمیدہ ریاض نے بیٹھتے ہی اپنی سگریٹ نکالی اور لکھنؤ کا حال معلوم کیا۔ پھر ہندو پاک کے معاملات پر بات ہونے لگی۔ وہ دونوں طرف کی سیاست سے بہت نالاں تھیں۔ دونوں طرف عقیدوں کی جنگ تیز ہوتی جا رہی ہے۔ بقول یگانہ:

سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبطِ مذہب کیا

دونوں زمینوں پر نفرتیں اُگ رہی ہیں اور دونوں زمینوں کی خاک پر خون برس رہا ہے۔ فہمیدہ اس خوفناک صورتحال سے بہت رنجیدہ اور ملول تھیں۔ لیکن ہم کر بھی کیا سکتے ہیں کہ ہماری تحریر کا برہنہ حرف جنگ کا اعلان تو کر سکتا ہے لیکن جنگ فتح نہیں کر سکتا۔

فہمیدہ ریاض جب پہلی بار لکھنؤ آئی تھیں اس وقت اُن کی سانولی سلونی صورت سب کو بہت بھائی تھی۔ اُن کے لمبے سیاہ بال، بڑی بڑی آنکھیں، کھلا ہوا دہانہ، کھنکتی ہوئی آواز اور ان کی چست قامتی کی سب نے یہ کہہ کر: ''حسنِ بہارِ باغِ جوانی کو دیکھنا'' بہت تعریف کی

تھی۔ نظم خوانی کا انداز بھی نرالا، گفتگو کا پیرایہ بھی سلجھا ہوا۔ ان کے ہونٹوں میں بے خوفی سے دبی ہوئی سگریٹ کو تو مولویانِ شہر نے بھی خوب خوب دیکھا۔ غرضیکہ وہ جتنی بار لکھنؤ آئیں، دلوں کو فتح کر کے چلی گئیں۔ زندہ دل، خوش گفتار، رونقِ محفل، انجمن آرا۔ لیکن ایک پہاڑ ان پر ایسا ٹوٹا کہ وہ ڈھے گئیں۔ ایسے ہی موقعوں پر انیسؔ یاد آتے ہیں:

بیٹا نہ ہو تو زیست کا پھر کیا مزا رہا
جب گھر اُجڑ گیا تو زمانے میں کیا رہا

فاطمہ حسن نے ہمارے لیے چائے بنوائی اور جب ہم نے چائے پینا شروع کی تو ہال سے متصل ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے بتایا: ''منیر نیازی اسی کمرے میں آ کر ٹھہرتے تھے۔ یہیں انہوں نے اپنی بہت سی اچھی نظمیں کہی ہیں۔'' فہمیدہ ریاض سگریٹیں پیتی رہیں اور اپنے اندیشے ظاہر کرتی رہیں۔ کچھ دیر بعد فاطمہ حسن اٹھ کر اندر گئیں اور پھر:

ع نکلی وہاں سے ایک زنِ فاطمہ جمال

وہ جب باہر آئیں تو ان کا لباس بدلا ہوا تھا۔ اب وہ سیاہ ساری پہنے ہوئے تھیں اور اس تبدیلیِ پیرہن کا سبب یہ تھا کہ کل سے محرم شروع ہونے والا تھا۔ انہیں اس لباس میں دیکھ کر مجھے ظ۔ انصاری کا ایک فقرہ یاد آ گیا۔ ایک جگہ انہوں نے سجاد ظہیر کی ترقی پسندی پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے: ''عاشورے کے دن وہ پیدل پا برہنہ کربلا جاتے تھے۔'' یہ لکھ کر لکھا: ''موصوف کو کوئی غم نہیں تھا سوائے غمِ حسینؑ کے۔'' سیاہ پوش فاطمہ حسن کے ہاتھ میں روپیوں سے بھرا ایک لفافہ بھی تھا۔ یہ لفافہ مجھے دیتے ہوئے انہوں نے کہا: ''اس میں چودہ ہزار روپے ہیں، میرے گھر کے محرم کے لیے۔ لکھنؤ جا کر اس نمبر (یہ نمبر انہوں نے لفافے پر لکھ دیا تھا) پر فون کر کے ان صاحب کا اکاؤنٹ نمبر معلوم کر لیجیے گا اور پیسہ ان کے اکاؤنٹ میں ڈلوا دیجیے گا۔'' فاطمہ حسن اصلاً پارہ، غازی پور، مشرقی اتر پردیش کی رہنے والی ہیں۔ ان علاقوں میں محرم بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔

فاطمہ حسن کے گھر میں فہمیدہ ریاض کے ساتھ بہت دیر بیٹھ کر ہم نے اس تیکھی عورت اور البیلی شاعرہ سے چلنے کی اجازت لی اور فاطمہ حسن کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے اپنی گاڑی سے ہمیں عسکری۔۴ پہنچوا دیا۔

کُلاچی

آج کی رات اس شہرِ آب میں ہماری ہم وطن زیبا علوی کی طرف سے کنارِ آب ہوٹل 'کلاچی' میں ہمیں مدعو کیا گیا ہے۔ 'دو دریا' میں واقع اس ہوٹل میں زیبا صاحبہ کو گیارہ بجے کا وقت ملا ہے۔ ہوٹل کے ضوابط کے مطابق اگر وہاں پہنچنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوگئی تو بکنگ منسوخ کر دی جائے گی۔ زیبا علوی نے فراست اور نسیم نازش کے ساتھ تحسین زہرا اور شعیب حیدر کو بھی دعوت دی ہے۔ فراست امشب کہیں اور مصروف ہیں اس لیے انہوں نے معذرت کر لی ہے۔ بھابھی تحسین (اپنے بھائی کی بیوی) کے ساتھ شعیب کے گھر آ گئی ہیں۔ ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ گھڑی دس کی طرف بڑھ رہی ہے اور ہم شعیب کی گاڑی میں بیٹھ کر 'کلاچی' کی طرف چل دیے ہیں۔ نسیم نازش اور تحسین پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی راستے بھر اس بات کو صحیح ثابت کرتی رہیں کہ عورتوں کی زبان پر خدا بھی تالا نہیں لگا سکتا۔ وہ بول رہی ہیں ہم سن رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں وہ ہماری بھی سن لیتی ہیں۔ شعیب کی گاڑی رفتار بھرتی ہوئی جانبِ دریا رواں ہے۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد فون کی گھنٹی بجی:

''کہاں تک پہنچے؟''

''بس پہنچ رہے ہیں۔ فلاں جگہ پر ہیں۔'' بھابھی نے انہیں بتایا۔

دریا سے قریب آنے پر ایک بار پھر گھنٹی بجی اور پھر وہی پوچھا گیا:

''کہاں پہنچے؟ سب لوگ آ گئے ہیں۔''

''پہنچ گئے ہیں۔''

ہم سمندر کے اس علاقے میں داخل ہو چکے تھے جہاں ایک قطار میں کئی ہوٹل تھے اور سب روشنیوں سے جگمگا رہے تھے اور سب صاحبانِ لقمہ بُو سے بھرے ہوئے تھے۔ شعیب ایک ایک ہوٹل کو دیکھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا رہے تھے لیکن 'کلاچی' کا بورڈ انہیں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ فون پھر آیا۔ اب کے شعیب نے اہلو پہلو کی نشانیاں پوچھیں اور انہیں جان لینے کے بعد ہم سے کہا:

''یار آ کئی بار چکے ہیں یہاں لیکن ہر بار بھٹک جاتے ہیں۔''

''رات میں راستے ٹھیک سے نظر نہیں آتے۔'' میں نے کہا۔

شعیب آگے نکل گئے تھے۔ گاڑی گھما کر واپس لائے اور اسے دھیرے دھیرے چلاتے ہوئے 'کلاچی' کے احاطے میں داخل ہوئے۔ اجمل کمال ہمیں اس احاطے کے ایک حصے میں کھڑے نظر آ گئے۔ ہم گاڑی سے اتر کر اُنہیں کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ فاطمہ حسن اور اُن کے شوہر بھی اسی وقت پہنچے تھے۔ ایسی جگمگاتی اور لوگوں سے چھلکتی ہوئی شاہراہِ طعام میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور چاروں طرف سے ایسے کھلے ہوئے مطبخ بھی میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہوٹل کے حدود میں پاؤں رکھتے ہی مجھے بائیں طرف ایک بہت بڑا مطبخ نظر آیا جہاں بہت سے خانساماں اپنی پیشہ ورانہ پوشاک پہنے طرح طرح کے کھانے تیار کر رہے تھے۔ میزوں پر طعام رسانی کا کام بھی یہیں سے ہو رہا تھا۔ یہیں سے طعام رساں طشتریاں بھر بھر کر میزوں کی طرف لے جا رہے تھے۔ ہم ایک۔ دو راہداریوں سے گزر کر اور دو۔ تین مرحلے والے زینوں سے اُتر کر ساحلِ سمندر سے لگی ہوئی اس میز پر پہنچ گئے جہاں اس دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لوگ زیادہ تھے میز چھوٹی لیکن پہلو سے پہلو ملا کر ہم نے کسی طرح بیٹھنے کی جگہ بنالی۔ میں بالکل کنارے بیٹھا تھا اور ہوٹل کی تیز روشنیوں میں سینۂ آب پر اچھلتی ہوئی ماہیانِ آب کو دیکھ رہا تھا اور یہ منظر مجھے انیسؔ کے اس مصرعے کی یاد دلا رہا تھا:

ع تھا مچھلیوں میں شور کہ نکلو پئے آداب

میں ان حبابوں کو بھی دیکھ رہا تھا جو بن بن کر پھوٹ رہے تھے۔ خدائے سخن نے ایسے ہی منظر کو دیکھ کر یہ مصرعہ کہا ہوگا:

ع کھلتی تھیں اور حبابوں کی آنکھیں جھپکتی تھیں

پھر میں نے اور دور تک نظر دوڑائی اور پھر انیسؔ کے اس منظر کو مجسم ہوتے ہوئے دیکھا:

ع لہریں جو تھیں کرن تو بھنور آفتاب تھا

ایک بہت بڑے زینے کی شکل میں نشیب کی طرف جاتی ہوئی ان کھلی ہوئی جگہوں پر بڑی تعداد میں خوش پوشانِ شہر موجود تھے۔ ہر میز ایک نعمت خانۂ صد رنگ معلوم ہوتی تھی۔ ترائی کی اس مملکت میں ہر ہاتھ اپنے لقمۂ تر پر نازاں تھا۔ میں نے سوچا اگر آج شاعرِ مشرق علامہ اقبال ''گوشۂ دل میں جہانِ اضطراب چھپائے'' اس جائے خور و نوش کی سیر کو نکل آئیں تو اپنے

دیوان سے یہ شعر کاٹ کر پھینک دیں:

نعمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

جو خوش حال جمعیت یہاں امڈ کر آئی تھی اس میں سے کسی کے چہرے پر آشوبِ زمانہ کے آثار نہیں تھے۔ سب مرفہ حال، خرم وشاداں۔ ہر طرف ہل مِن مزید کا شور۔ خدمتگارانِ طعام طشت ہائے طعام ہاتھوں میں لیے میز ومطبخ کے درمیان رمیدہ ودمیدہ۔ اور کھانے والوں کا حال یہ کہ:

قابوں کو دیکھتے تھے وہ ہو ہو کے بیقرار
تھے اشہبِ شکم پہ سبھی لقمہ کش سوار

کھانا ہماری میز پر آچکا تھا۔ چاروں طرف شور ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی آوازیں ہمیں بہت صاف نہیں سنائی دے رہی تھیں اس لیے ہم اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ ہمارے سامنے عابد رضوی اوران کی بیگم طلعت رضوی بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک عابد رضوی کے حافظے نے کروٹ لی اور وہ اس سڑک کے مقاموں اور منظروں کو یاد کرنے لگے جس پر اِس دعوت میں شریک پانچ لوگ رہتے تھے۔ میں، زیبا علوی، عابد رضوی ان کی بیگم اور شعیب۔ سب کے مسکن پاس پاس تھے۔ عابد رضوی کراچی کب چلے آئے، مجھے نہیں معلوم۔ ان کی بیگم طلعت رضوی کو دیکھ کر میری نگاہ گزرے ہوئے زمانے کے طاقہائے پارینہ پر ٹھہر گئی۔ مجھے یاد آنے لگا کہ ان کے مکان سے متصل ایک مکان میں، جب میں بہت چھوٹا تھا، اپنی ماں کے ساتھ بہت جایا کرتا تھا۔ اس مکان کی مالک پورے علاقے میں بکری والی بیگم کے نام سے مشہور تھیں اور بڑھاپے میں بھی بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے گھر میں بہت سی بکریاں پلی ہوئی تھیں اور انہوں نے سب کے بہت اچھے اچھے نام رکھے تھے: ماہ پیکر، گل رخ، فلک آرا، ثریا، گل بدن، زرتاج، ماہ وش وغیرہ۔

اِن سب سے وہ ایسے باتیں کرتی تھیں جیسے انسانوں سے بول رہی ہوں۔ ایک دن میں ان کے مکان میں داخل ہوا تو وہ گل رُخ کو جو کہیں دور کونے میں بیٹھی تھی، آواز دے رہی

تھیں، کہہ رہی تھیں: ''گل رخ! کہاں ہو۔ پتے لگن میں ڈلوادیے ہیں۔ آ کر کھالو۔'' گل رخ ناز وادا سے چلتی ہوئی لگن کے قریب آئیں اور پتے کھانے لگیں۔ ایک اور دن اماں کے ساتھ اُن کے یہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ سفید ساری میں ملبوس اپنے تخت پر گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہیں اور ایک سیاہ و سفید رنگ کی بکری کا سر اپنے زانو پر رکھے اسے چمچے سے دوا پلا رہی ہیں۔ اماں نے پوچھا انہیں کیا ہوا تو بولیں:

''سردی لگ گئی ہے۔'' پھر اس کے گال پر ہلکے سے چپت لگاتے ہوئے کہا: ''رات سے چھینک رہی ہیں گلبدن۔'' یہ سن کر گلبدن منمنائیں اور ان کے زانو سے اپنا سر ہٹا کر تخت سے نیچے اُتر آئیں۔

عابد رضوی کی اہلیہ طلعت رضوی کے والد مجتبیٰ صاحب شیعہ کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کے مکان کے نچلے حصے میں سینٹ برنا ڈس اسکول تھا۔ وہاں میری ایک بہن پڑھتی تھی۔ میں جب اسے اسکول پہنچانے اور لینے جاتا، طلعت رضوی اور ان کی ایک بہن، پتہ نہیں وہ ان سے چھوٹی تھیں یا بڑی، اس مکان کا زینہ چڑھتے اترتے نظر آتیں۔ پردہ اس وقت بھی ان کا نہیں تھا۔ طلعت اپنے ہمسائے کی زوجہ بن کر یہاں چلی آئیں لیکن متعلقین اُن کے اب بھی لکھنؤ میں ہیں۔ عابد رضوی اُس زمانے کی باتیں بتاتے رہے جب وہ اُس سڑک پر آزادانہ گھومتے تھے۔ شعر سننے اور سنانے کے شوق میں امین آباد تک نکل جاتے اور والی آسی کی دکان پر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔

لکھنؤ کے منظر سے عابد رضوی کی نگاہ ہٹی تو میں نے برابر میں بیٹھے اجمل کمال سے کہا:

''خالد جاوید کا نیا ناول آیا ہے 'نعمت خانہ'۔ آپ نے پڑھا۔''

''آپ کو کیسا لگا۔'' اجمل نے پلٹ کر مجھ سے پوچھ لیا۔

''ابھی پڑھا نہیں ہے۔'' پھر کہا: ''یہ بھی عجب اتفاق ہے۔ ذکرِ نعمت خانہ بر مقامِ نعمت خانہ۔''

کہا جا چکا ہے کہ اجمل کمال بہت کم بولتے ہیں اور اس کم بولنے میں بھی ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے ہیں۔ بہت نپے تلے انداز میں وہی کہتے ہیں جو واقعی انہیں کہنا ہوتا ہے۔ حشویات و زوائد میں یقین نہیں رکھتے۔ خود کسی بات کی اطلاع نہیں دیتے لیکن پوچھنے پر جو معلوم ہوتا ہے بڑی فراخدلی سے بتا دیتے ہیں۔

فاطمہ حسن اور شعیب حیدر باتوں کے بیچ لطیفے بھی سنا رہے تھے۔ زاہدہ حنا زیبا علوی

کے پہلو میں بیٹھی تھیں اور بہت کم بول رہی تھیں۔نسیم نازش اور تحسین نے اپنی پسند کے موضوع نکال لیے تھے۔ وہ لقمے اپنے منہ میں بھی ڈالتی جارہی تھیں اور بچی ہوئی روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا کر ان مچھلیوں کو بھی کھلا رہی تھیں جو سطحِ آب پر اچھل اچھل کر دستِ طلب دراز کررہی تھیں۔کھانے کی میز پر یہ انجمن آرائی بہت اچھی لگ رہی تھی لیکن آوازوں کے شور میں صرف کھانے کا مزہ مل رہا تھا، باتوں کا نہیں۔طرح طرح کی چیزیں کھانے کے بعد ہمارا کھانا ختم ہوا۔رات کا آدھا پہر گزر چکا تھا لیکن لوگ اب بھی اس ہوٹل میں آرہے تھے۔ میں نے برِصغیر کے دو ہی شہروں میں شب کی درخشانی کا یہ منظر دیکھا۔ایک ممبئ دوسرے کراچی۔ ممبئ بھی رات میں جاگتا ہے اور کراچی بھی رات ہی میں اپنی آنکھ کھولتا ہے۔لیکن ممبئ میں سمندر کے ساحل پر یہاں کی سی دنیائے رنگ ونور نظر نہیں آتی۔اس ہوٹل میں اوپر نیچے بنے ہوئے کئی چوڑے چبوتروں پر مصروفِ طعام لوگوں کی خوش خوراکی پر رشک کرتا ہوا میں سب کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ہم سب نے اتنی اچھی دعوت کے لیے زیبا علوی کا شکریہ ادا کیا اور اپنی اپنی منزلوں کی طرف جانے کے لیے اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔' کلاچی' سے آگے بڑھنے کے بعد وہ گوشہائے خور ونوش بہت دیر تک میری نگاہ کے سامنے آتے رہے جہاں لوگ بیٹھنے اور کھانے دونوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔میں ان کی رونقوں کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ میری نگاہ سے اوجھل نہیں ہوگئے۔

بیرونِ شہر کے علاقۂ آب سے نکل کر ہم درونِ شہر داخل ہوئے۔شعیب ویران سڑکوں پر گاڑی بہت تیز چلا رہے تھے۔گاڑی کے اندر پر مذاق باتیں ہورہی تھیں اور ہمارے قہقہے بلند ہورہے تھے۔اگر گاڑی کے شیشے کھلے ہوتے تو یہ قہقہے بہت دور تک سنائی دیتے۔ اِنہیں بلند ہوتے ہوئے قہقہوں میں دونوں خواتین اپنے گھروں کے راستے بھول گئیں اور ہم کہیں سے کہیں نکل گئے۔زبان کو ہمہ وقت بیدار رکھنے والی ان دونوں خواتین کی آنکھیں اپنی منزل پر پہنچنے سے کچھ پہلے جھپک گئیں اور اصل راستے پر آنے کے لیے ہمیں کئی راستوں کے چکّر لگانا پڑے۔اِن خواتین کو ہر راستہ اپنے گھر کی طرف جاتا ہوا معلوم ہوتا اور جب ہم اُس راستے پر آگے بڑھتے تو معلوم ہوتا کسی اور راستے پر نکل آئے ہیں۔اور لطف کی بات یہ کہ راستہ بھٹک جانے پر ان عورتوں میں کسی طرح کی گھبراہٹ نہیں تھی بلکہ وہ گم کردۂ رہگزر ہوکر اس طرح خوش ہورہی تھیں گویا

منزل تک پہنچنے میں یہ تاخیر و تعطّل ان کے لیے کوئی خوشگوار روحانی تجربہ ہو۔ کئی راستوں پر جانے اور وہاں سے واپس لوٹ آنے کے بعد بالآخر تحسین زہرا نے اپنے گھر کا اصل راستہ پا لیا۔ ہم نے پہلے انہیں ان کے گھر پہنچایا پھر بھابھی کو نعمان گارڈن۔ عسکری۔۴ پہنچتے پہنچتے رات کے دو بج گئے۔ اور میں اور شعیب گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے اپنے بستروں پر جا پڑے۔

●

کراچی میں یہ ہمارا آخری دن ہے۔ چشم زدن میں گزر گئے یہ چودہ دن۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ سورج نے کب اپنی شعاعوں سے دن کو منور کیا اور کب رات شام کی دہلیز پر فروزاں ہوئی۔ کل صبح کی پرواز سے مجھے اس شہر سے نکل جانا ہے۔ کل میں آخری بار کراچی کے آسمان پر آفتاب کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھوں گا اور جب طیارہ کراچی کے آسمان سے نکل جائے گا تو چمکتی ہوئی دوپہر میں دہلی کی سرزمین پر قدم رکھوں گا۔ وہاں کا سورج وہی ہوگا جو کراچی کے آسمان پر نکلتا ہے۔ دھوپ بھی یہاں کی جیسی ہوگی لیکن پاؤں کے نیچے کی زمین بدلی ہوئی ہوگی۔ ہم ایک ہی طرح کی زمین پر بہت دن تک نہیں رہ سکتے۔

کل رات میں بہت دیر سے بستر پر گیا اور نیند مجھے اچھی طرح نہیں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ گہری نیند کے خواب یاد نہیں رہتے لیکن آدھی نیند میں دیکھے ہوئے خواب کے سارے منظر جاگنے کے بعد بھی آنکھوں میں موجود رہتے ہیں۔ سو میں نے مکینوں سے خالی ایک ویران مکان کے طاقوں میں فاختاؤں کو بیٹھے دیکھا اور دیکھا کہ آسمان پر عجیب الہئیت پرندے اُڑ رہے ہیں جو زمین کی طرف غضبناک ہوتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ میں کسی اور زمین پر ہوں اور وہ زمین دھوپ سے تپ رہی ہے لیکن وہاں کے لوگوں نے میرے سر پر چادرِ گل کا سایہ کر دیا ہے اور پاؤں کے نیچے برگہائے سبز بچھا دیے ہیں۔ اچانک منظر بدلا۔ میں نے دیکھا کہ میں آسمانوں میں اڑ رہا ہوں اور اوپر سے مجھے ساری زمینیں ایک سی معلوم ہو رہی ہیں۔ میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ میں کس زمین پر اتروں اور کہاں اپنا ٹھکانہ بناؤں۔ پرندے موسموں کو پہچانتے ہیں، زمینوں کو نہیں۔ بدلتے ہوئے موسموں میں جب وہ اپنے آشیانے بدلتے ہیں تو اُن کی نگاہ میں درخت ہوتے ہیں، وہ زمینیں نہیں جن پر یہ درخت پھولتے پھلتے ہیں۔

آدھی نیند سے آنکھ کھلتے ہی میں نے سوچا کہ کل میں اُسی درخت پر جا بیٹھوں گا جہاں سے اڑکر یہاں آیا ہوں۔ لیکن وہ بجلی جو آشیانوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، وہ سب زمینوں پر ایک ہی طرح سے کڑکتی ہے، سونہیں کہا جا سکتا کہ وہ درخت جو میرا اپنا ہے، اس پر میں کب تک محفوظ رہوں گا۔ راجیند رمنچند ابانی نے اپنے ایک شعر میں بجلی کے بجائے ہوا کی تباہ کاری کا ذکر کیا ہے۔ بجلی کی طرح ہوا بھی ٹھکانے پہچان کر انہیں تباہ نہیں کرتی:

تمام شہر کو مسمار کر رہی ہے ہوا
میں دیکھتا ہوں وہ محفوظ کس مکان میں ہے

●

کراچی میں اپنی دن۔ رات کی مصروفیتوں کے دوران میں نے پکا ارادہ کیا تھا کہ سب جگہوں سے فرصت پا کر سفر کے آخری دن حکیم صاحب عالم کی دختر کے دولت کدے پر حاضری دوں گا۔ اور آج جب میں نے شعیب کو اس بارے میں بتایا تو وہ بولے:

''آج تو ناممکن ہے۔ آج ایم۔ کیو۔ ایم کی ہڑتال ہے۔ کوئی گاڑی سڑک پر نہیں آسکتی۔''

یہ سن کر مجھے دھچکا لگا۔ میں نے دو دن پہلے ان سے فون پر بات کی تھی اور کراچی میں اپنی آمد کے بارے میں انہیں یوں بتایا تھا: ''میں انیس ہوں۔ لکھنؤ سے آیا ہوں۔ آپ کی ڈگن باجی... وہ جو امّی جانی کہی جاتی تھیں، اُن کا لڑکا۔''

امّاں ہماری پورے محلّے میں امّی جانی کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ حکیم صاحب عالم کی اِن چھوٹی بیٹی کی عمر اسّی سے اوپر پہنچ رہی تھی۔ سب انہیں ننگا امّی کہا کرتے تھے۔ میرے بتانے پر ننگا امّی کو میری ماں فوراً یاد آ گئیں، بولیں:

''ہاں ہاں خوب یاد ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر غالب کا یہ شعر پڑھا:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

''آنا چاہتا ہوں آپ کے پاس۔''

"آؤ آؤ۔ ضرور آؤ۔"

اور آج ایم۔ کیو۔ ایم کی ہڑتال کی وجہ سے میں کنگا امّی کے پاس نہیں جا سکا اور دل مسوس کر رہ گیا:

ع دلِ وحشی کو خواہش تھی تمہارے در پہ آنے کی

اسی ہڑتال کی وجہ سے گلشن اقبال میں ثاقب انجان کی قیام گاہ پر تین بجے سہ پہر میں منعقد ہونے والی مسالمے کی وہ محفل بھی ملتوی ہوگئی جس کی صدارت کے فرائض مجھے انجام دینا تھے۔ کل مجھے حلقۂ اربابِ ذوق کے سکریٹری عقیل عباس جعفری کی جانب سے یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ آج ۲۶/ اکتوبر کو حلقے نے آرٹس کاؤنسل میں ایک گفتگو کا اہتمام کیا ہے۔ اس اطلاع کے بعد آصف فرخی نے مجھے بتایا: "حلقے کی روایت کے مطابق کسی تازہ مضمون پر گفتگو ہوتی ہے۔ آپ اگر اپنا کوئی نیا مضمون ساتھ لائے ہوں تو اُسی کو پڑھ دیں، بات اُسی پر ہوگی۔"

حلقۂ اربابِ ذوق

آج شام تک کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ شعیب کے ساتھ کچھ دیر بیٹھنے اور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اوپر آکر اپنے پھیلے ہوئے سامان کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا شام سے پہلے پہلے سامانِ سفر باندھ لیا جائے ورنہ پھر وقت نہیں ملے گا۔ اس سامانِ سفر میں سب سے پریشان کن مسئلہ کتابوں کا تھا۔ کیا چھوڑوں، کیا لے جاؤں۔ کتابوں کا وزن بہت ہوتا ہے۔ جن کتابوں کو میں اپنے ساتھ لانا ضروری سمجھتا تھا، اُن کا وزن بھی بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ میں بہت گھبرایا ہوا تھا لیکن عابد رضوی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وزن کے اس مسئلے کو وہ حل کرا دیں گے۔ میں نے اپنی اٹیچیوں میں اپنے کپڑے لتے رکھے، پھر تحفے تحائف۔ پھر کتابوں کو بھرنا شروع کیا۔ اور جب دونوں اٹیچیاں بھر گئیں تو بچی ہوئی کتابوں کو دوسرے تھیلوں میں رکھا۔ سامان سمیٹتے سمیٹتے اور انہیں اٹیچیوں میں بھرتے بھرتے بہت وقت لگ گیا۔ اس وقت طلب کام کو نمٹانے کے بعد میں نے کچھ دیر آرام کیا۔ دن کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نیچے آیا تو بھابھی میز پر کھانا لگا چکی تھیں۔ ان کی آواز ابھی تک نہیں کھلی تھی، اس لیے وہ بہت کم بول رہی تھیں۔ کھانے کی میز پر میں نے کراچی میں گزارے ہوئے دنوں کی باتیں

کیں۔ قصوں اور واقعوں کے حوالے سے لکھنؤ کو یاد کیا اور کل رات راستہ بھٹک جانے والی بات پر میں اور شعیب دیر تک ہنستے رہے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے پھر آرام کیا اور شام سے کچھ پہلے تیار ہو کر آرٹس کاؤنسل کے جانے کے لیے فراست کا انتظار کرنے لگا۔

شام ڈھل جانے کے بعد فراست آئے اور بہت چپکے سے ایک بہت خوبصورت ڈبہ میرے حوالے کیا میں نے کہا: ''یہ کیا۔'' کہا: ''اوپر جا کر اپنے سامان میں رکھ لیجیے۔'' میں نے اوپر آ کر ڈبہ کھولا تو اس کے اندر نوکیا کا ایک بہت مہنگا موبائل تھا۔ میں نے نیچے آ کر کہا: ''بھائی اس کی کیا ضرورت تھی۔'' بولے: ''رکھ لیجیے آپ کو ایسے موبائل کی ضرورت ہے۔'' اور تب مجھے یاد آیا کہ میں نے کسی وقت اپنے پاس معمولی موبائل رکھنے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں موبائل کے پیچیدہ استعمال سے ناواقف ہوں۔ لکھنؤ جا کر اسمارٹ فون خریدوں گا اور سب کچھ سیکھوں گا۔ فراخ دل فراست نے یہ بات ذہن میں بٹھالی اور وہ موبائل مجھے یہیں عنایت کر دیا۔

موبائل اپنے سامان میں رکھنے کے بعد میں فراست کے ساتھ آرٹس کاؤنسل روانہ ہو گیا۔ حلقے کی نشست کا اہتمام آرٹس کاؤنسل کے ایک کمرے میں کیا گیا تھا جہاں حلقے سے متعلق لوگ پہلے سے موجود تھے اور کچھ لوگ آ رہے تھے۔ فراست کمرے کے باہر مجھے لوگوں سے ملوا ہی رہے تھے کہ ایک خاتون تیزی سے میری طرف بڑھیں اور بڑے خلوص سے مجھے سلام کرتے ہوئے بولیں: ''میں ناہید کاظمی اور یہ میرے شوہر ڈاکٹر باقر رضا۔ ہم لوگ لکھنؤ ہی کے ہیں۔'' پھر کہا:

''ادب وغیرہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف یہ سن کر آئی ہوں کہ آپ لکھنؤ سے آئے ہیں۔''

''لکھنؤ میں کہاں رہتی ہیں آپ؟''

''گولہ گنج۔ فضل عباس کاظمی کا نام سنا ہے آپ نے؟''

''خوب سنا ہے۔''

''میں ان کی پوتی ہوں۔ ان کے بھائی غلام عباس کاظمی کی بیٹی۔''

''اس کا مطلب نصیر فاطمہ آپ کی پھوپھی ہوئیں۔''

''جی جی۔ وہ میرے والد خادم عباس کاظمی کی بہن ہیں۔''

''پی۔ایچ۔ڈی انہوں نے میری ہی نگرانی میں کی ہے۔ ندیم کو جانتی ہیں۔''

''رشتہ دار ہیں ہمارے۔''

''اور میرا بھانجا ہے۔ بٹو باجی، اس کی ماں میری پھوپھی زاد بہن تھیں۔''

''یہ....'' انہوں نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''ہمارے ماموں زاد بھائی ہیں، خاندان ایک ہی ہے ہم لوگوں کا۔''

ناہید کاظمی مجھ لکھنؤ والے سے مل کر بہت خوش تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں انہیں کے گھر کا ہوں۔

آصف فرخی آچکے تھے۔ ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے۔ تنویر انجم، افضال احمد سید اور عذرا عباس ابھی نہیں آئے تھے۔ دیر زیادہ ہو رہی تھی، اس لیے جلسہ شروع کر دیا گیا۔ آصف فرخی نے مہمانوں سے میرا تعارف کرایا۔ کراچی میں حلقے کی سرگرمیوں کا ذکر کیا، پھر مجھ سے مضمون پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے حال ہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سیمینار میں پڑھا جانے والا اپنا مضمون بعنوان ''اردو مرثیہ: صنف کی تشکیل اور معنی کی تعمیر'' پڑھنا شروع کیا اور محسوس کیا کہ موجود لوگ اسے دلچسپی سے سن رہے ہیں۔ جب مضمون کا ایک۔ ڈیڑھ صفحہ پڑھا جا چکا تو افضال احمد سیّد، تنویر انجم اور عذرا عباس وارد ہوئے۔ ان باشعور سامعین کے آنے کے بعد میں نے مضمون کو پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ کسی صنف کی تشکیل اور اس کے اندر معنی کی تعمیر کیونکر ہوتی ہے، مرثیے کی صنف کب وجود میں آئی۔ کب اس نے مسدّس کی ہیئت اختیار کی۔ یہ ہیئت صنفِ مرثیہ کے لیے کیوں مناسب ٹھہری اور بڑے مرثیہ نگاروں نے کس طرح اس ہیئت میں معنی و بیان کی قوت پیدا کی۔ مضمون پسند کیا گیا اور اس پر بہت گرم اور معنی خیز بحث ہوئی۔ فراست میدانِ مرثیہ کے شہ سوار ہیں اس لیے وہ اس گفتگو میں پیش پیش تھے۔ ان کی نکتہ آفرینیوں پر انہیں کے برابر بیٹھے ہوئے ایک صاحب سبحان اللہ، جزاک اللہ کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ فراست کی جوش پسندی ہر جگہ غالب آ جاتی ہے، یہاں بھی جوش ان کے یہاں بہت پر جوش طریقے سے اُبھر اُبھر کر سامنے آ رہے تھے۔ میں ان کی طرح جوش کا

شیدائی نہیں ہوں بلکہ آدابِ شاعری اور اصولِ فن کے بعض پہلوؤں کے اعتبار سے انہیں نعرہ زنِ حرف سے آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ پاتا۔ ڈاکٹر باقر رضا بھی اس بحث میں آگے آگے تھے اور بیانیہ کے رموز کی وضاحت میں وہ مارکیز اور لاطینی امریکہ کے دوسرے لکھنے والوں کے حوالے دے رہے تھے۔ میں نے سوچا طب کے میدان کا یہ مردِ مجاہد ادب کے میدان میں بھی اُسی برق روی کے ساتھ دوڑ رہا ہے۔ افضال احمد سیّد فراست سے اختلاف کر رہے تھے۔ آصف فرخی مقراضِ توازن ہاتھ میں لیے گفتگو کے فضول عناصر کو کتر کر اسے اصل نہج پر لانے اور معقول سوال اٹھائے جانے کا عمل انجام دے رہے تھے۔ عذرا عباس اور تنویر انجم سب کچھ سمجھ کر چپ رہنے والے سامعین کا رول ادا کر رہی تھیں۔ کہیں کہیں عقیل عباس جعفری بھی گفتگو کا ایک آدھ سرا پکڑ لیتے۔ اس عام گفتگو کے بعد مجھ سے مضمون اور صنفِ مرثیہ سے متعلق خصوصی سوالات کیے گئے اور میں نے تفصیل سے ان کے جوابات دیے۔ میں اس نشست سے بہت خوش تھا۔ یہاں کی بحث اور گفتگو سن کر مجھے اپنی 'مجلسِ حملہ آوراں' یاد آ گئی۔ وہاں ہم اسی طرح بحث کرتے تھے، یہی جارحانہ انداز ہوتا تھا ہمارا، گفتگو میں یہی گرمی یہی جوش۔ یہ حلقہ تعداد کے اعتبار سے مختصر سہی لیکن تعبیر و تخلیق میں سب کے سب طاق و مشاق۔ مضمون ختم ہونے کے بعد دیر تک تصویریں کھنچتی رہیں۔ کبھی اس کے ساتھ، کبھی اس کے ساتھ۔ ان سب سے فرصت پا کر جب ہم باہر نکلے تو ناہید کاظمی اور ان کے شوہر باقر رضا نے مجھے پھر آ گھیرا۔ دونوں مجھ سے بولے:

''اب کل تو آپ جا رہے ہیں۔ ہم چاہتے تھے ایک وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔''

''انشاء اللہ پھر آنا ہوا تو ضرور کھائیں گے۔'' میں نے کہا۔

برمقامِ زبرجد

میں اِدھر لوگوں سے باتیں کر رہا تھا اُدھر عذرا عباس، تنویر انجم اور فراست وغیرہ میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ جب دوسرے مہمان رخصت ہو گئے تو فراست نے بتایا کہ یہاں سے ہمیں رات کے کھانے کے لیے کسی جگہ پر جانا ہے۔ ہم لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر کلفٹن کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچ کر کسی معقول ہوٹل کی تلاش کی جانے لگی۔ لیکن اس طرح کا ہر ہوٹل کھانے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا: ''زندہ دلانِ کراچی زندہ باد'' دن

کیسا ہی سخت اور اذیت رساں ہو لیکن رات کے زخم پر اس شہر کی رونقیں مرہم رکھ دیتی ہیں۔ آباد اور گھنی شاہراہوں پر نکلیے تو یوں لگتا ہے کہ ہر کوچۂ شہر میں ایک چراغِ مسیحائی روشن ہے جو نارالنہار سے نکلے ہوئے بیماروں کو ساعتِ شب میں نورِ شفا تقسیم کر رہا ہے۔

اچھے ہوٹلوں کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمیں ہوٹل Jade Garden میں جگہ مل گئی۔ میں نے ہوٹل کا نام دیکھا اور انیس کا مصرعہ میرے ذہن میں کوندا:

ع چرخِ زبر جدی پئے تسلیم خم ہوا

مجھے نہیں معلوم کہ ہوٹل کتنا پرانا تھا اور ملکۂ ترنم ملکہ پکھراج نے کبھی یہاں اپنا پاؤں رکھا تھا یا نہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس ہوٹل کے آس پاس ہی آصف زرداری کا مکان ہے۔ ہم ہوٹل میں داخل ہوئے اور اس کے بڑے سے ہال میں کنارے کی طرف لگی ہوئی بڑی سی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ آصف نے اپنی بیگم کو یہاں اپنے ہونے کی اطلاع دی اور تھوڑی دیر بعد وہ بھی یہاں آ پہنچیں۔ عذرا عباس نے مینو پر نگاہ ڈال کر جب کھانے کا آرڈر دینا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس دعوت کی بھی میزبان وہی ہیں۔ یہ ان کی دوسری دعوت تھی۔ فراست نے میز پر بیٹھتے ہی اپنی پرلطف گفتگو شروع کر دی۔ اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں ان کی طبیعت آمد پر تھی اور ان کی حسِ مزاح اور تیز ہو گئی تھی۔ وہ طرح طرح کے لوگوں سے متعلق طرح طرح کے قصے انہیں لوگوں کی نقل اتار کر سنا رہے تھے اور سب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ اور آج تو بہت سنجیدہ رہنے والی بیگم آصف یعنی تیمیں صاحبہ بھی خوب کُھل کر ہنس رہی تھیں۔ مزاح کی تیز ہوتی ہوئی لہر میں ایک آدھ بار عذرا عباس سے فراست کی جھڑپ بھی ہوئی اور وہ آگ بگولہ ہو کر فراست پر جھپٹیں بھی لیکن جب فراست مسکرا کر پیچھے ہٹ گئے تو وہ پھول کی پتی پر قطرۂ شبنم سی نظر آنے لگیں۔

یہ مرقع ابھی اک دم میں الٹ جائے گا

اس ہوٹل میں دیر تک بیٹھ کر ہم نے اچھے اچھے کھانوں کے ساتھ اچھی اچھی باتیں کیں۔ یہاں موجود لوگوں سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اِن کے ساتھ گزارے ہوئے دن کتنی تیزی سے گزر گئے۔ لیکن یہ دن یاد رہ جانے والے دن تھے اور سب کی سب راتیں روشن رہنے والی۔ دیکھا جائے تو میری اصل جماعت کراچی میں یہی تھی۔ میں جتنے دن اِن کے ساتھ رہا خرم

وشاد رہا۔ اتنے کم دنوں میں کتنی زیادہ صحبتیں رہیں اور اِن صحبتوں میں کتنی محبتیں رہیں۔ میں نے ان کے گھر دیکھے، ان کے دیار دیکھے۔ ان کی حکایتوں سے بہرہ یاب ہوا اور ان کی ذکاوتوں سے خردمند۔ کتابِ دوستاں کے یہ روشن ورق کل میری نگاہ سے اوجھل ہو جائیں گے۔

کھانا ختم ہوا۔ ہم سب ہوٹل سے باہر نکلے۔ ہوٹل سے کچھ دور چوڑی فٹ پاتھوں پر بڑے بڑے کھٹولے بچھے ہوئے تھے اور خوش دلانِ شہران پر بیٹھے حقوں کے کش لے رہے تھے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ یہ قبلِ طعام کا مشغلہ اور بعدِ طعام کا لازمہ ہے۔ فراست کی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں ایک ایک سے گلے مل کر رخصت ہوا۔ فراست مجھے لے کر شعیب کے گھر آئے اور یہیں ٹھہر گئے تاکہ وہ صبح ہوائی اڈے تک مجھے پہنچانے جائیں۔ شعیب نے میرے برابر والے کمرے میں ان کے سونے کا انتظام کر دیا۔ ہمیں علی الصباح یہاں سے نکلنا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں آ کر بندھے ہوئے سامان پر نظر ڈالی۔ ایک دو چیزیں جو باہر پڑی رہ گئی تھیں، انہیں اٹیچیوں میں رکھا۔ شب کی پوشاک پہنی۔ صبح کا لباس نکالا اور بستر پر آنکھ بند کر کے پڑ رہا۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کسی کا یہ شعر مجھے بار بار یاد آ رہا تھا:

نیند تو دیر سے پلکوں سے لگی بیٹھی ہے
سونے دیتا ہی نہیں گرم ہوا کا جھونکا

لیکن اکتوبر کے اس خوشگوار موسم میں گرم ہوا کا گزر نہیں تھا۔ تو پھر یہ شعر مجھے کیوں یاد آیا اور پھر ایک آواز کہیں سے آئی: ''اے دور کے مسافر جو ہوا پتوں کو درخت سے اُڑا لے جاتی ہے وہ گرم ہی ہوتی ہے۔'' بستر پر آنکھیں بند کیے کیے میں نے سوچا: ''میں بھی اس برگ کی مانند ہوں جو صبح اُس درخت سے جدا ہو جائے گا جس کی ہری بھری شاخ پر وہ کچھ روزوں کے لیے نکلا تھا۔ میں نے کروٹ بدلی مگر نیند مجھے نہیں آئی اور صبح ڈوبتے ہوئے تاروں میں جب قریب کی عبادت گاہ سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو ایک اور آواز میرے کانوں تک آئی:

''حضور آداب، اُٹھیں نکلنے کا وقت ہو گیا۔''

یہ فراست تھے جو بہت آہستہ سے مجھے جگا رہے تھے۔ میں اٹھا، تیار ہوا۔ بندھا ہوا سامان فراست کی مدد سے نیچے لایا۔ شعیب نے گاڑی نکالی۔ بھابھی اپنے کمرے سے باہر نکلیں۔

میں، شعیب اور فراست گاڑی میں بیٹھے۔ میں نے بھابھی کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا، اُن سے رخصت لی۔ دوبارہ آنے کی دعا کی۔ شعیب کی گاڑی 'حیدرولا' سے باہر نکل کر طیر گاہِ کراچی کی طرف چل پڑی۔ فاصلہ بہت لمبا نہیں تھا، اس لیے ہوائی اڈے پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ یہاں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ اس کی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے میں نے شعیب اور فراست کو بار بار گلے لگایا:

ع آفت کا وقت تھا تو قیامت کی تھی گھڑی

ان معانقوں کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ زمین میرے پیروں کو جکڑے ہوئے ہے اور پھر ویران گہِ جاں سے ایک آواز آئی۔ ''دور کے مسافر تجھے نہیں معلوم جتنی شادمانی اپنے گھر پہنچنے کی ہوتی ہے اتنا ہی رنج اُن زمینوں کو چھوڑنے کا ہوتا ہے جنہیں دیکھنے کی چاہ میں تو سفر پر نکلا تھا۔'' میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مکانِ شب سے نکلے ہوئے ستارے واپس اپنے برجوں میں لوٹ رہے تھے اور سورج پردۂ شب کی پرتوں کو پلٹ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب کراچی کا یہ آسمان صاف ہوگا تو پرندے اس کی پہنائیوں میں پرواز کرتے نظر آئیں گے اور نہیں معلوم کون سا پرندہ کس طرف نکل جائے۔ ساری زمینیں ان پرندوں کی ملکیت ہیں۔ مجھے اپنی ماں کی سنائی ہوئی ایسی بہت سی کہانیاں یاد آئیں جن میں انسان پرندوں کا روپ بدل کر جہاں چاہتے چلے جاتے۔ میں نے سوچا: ''وہ جادوئی دنیائیں اِن جیتی جاگتی دنیاؤں سے کتنی اچھی تھیں۔''

میں نے اپنا سامان، سامان والے کیریر پر رکھ لیا تھا۔ ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہو کر میں اس وقت تک فراست اور شعیب کو پلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا جب تک اُس کھڑکی تک پہنچ نہیں گیا جہاں سے مجھے آگے کا پروانہ ملنا تھا۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر میں نے انہیں آخری بار دیکھا اور اندر سے کوئی بولا:

ع صبحِ شبِ فراق ہے پیاروں کو دیکھ لو

وہ دونوں میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئے اور کراچی بھی میری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ آنکھوں سے یہ منظر ہٹتے ہی میں نے سوچا:

ع یہ مرقع ابھی اک دم میں الٹ جائے گا

جہاز میں بیٹھنے کا اجازت نامہ لے کر میں نے اُن صاحب کو پوچھا جن کا نام عابد رضوی نے بتایا تھا۔

''کہیں گئے ہوئے ہیں۔'' کھڑکی پر بیٹھے شخص نے کہا۔

میرا دل دہلا۔ سامان کا وزن کیا گیا اور مجھے بتایا گیا کہ یہ مقررہ وزن سے زیادہ ہے۔ پھر مجھے اضافی وزن کی رقم بتائی گئی۔ میں نے پھر ان صاحب کو پوچھا اور تب کھڑکی پر بیٹھے شخص نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''وہ ہیں اُس طرف۔''

میں ان کے قریب پہنچا، عابد رضوی کا حوالہ دیا اور فوراً ہی مجھے خصوصی مسافر سمجھ کر سارے مرحلے بہ حسن وخوبی انجام پا گئے۔ ان مرحلوں میں جانچ پڑتال والا مرحلہ بھی تھا جس کے لیے مجھے ہندستان کے ہوائی اڈے پر بحث وتکرار کی سخت مشکل سے گزرنا پڑا تھا۔ لیکن یہاں مجھے کسی طرح کی پریشانی نہیں ہوئی۔ اندرونی حصے میں پہنچ کر میں نے چائے پی، ناشتہ کیا اور کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن کو اس لیے خالی چھوڑ دیا کہ دوستوں کے جدا ہو جانے کی اذیت سے آزاد رہ سکوں۔ بہت دیر تک میں آنکھ بند کیے اسی عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر جب اڑان کا وقت قریب آنے لگا تو اُٹھا جہاں سے چائے لی تھی وہاں سے کراچی کا مشہور حلوہ اور دال موٹ خریدی اور انہیں بیگ میں رکھ کر اس حصے کی طرف بڑھنے لگا جہاں بیٹھ کر جہاز تک پہنچنے کا انتظار کرنا تھا۔ میں اُس طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ بالکل نئے فیشن والی پوشاک پہنے آنکھوں پر تاریک شیشوں والا چشمہ چڑھائے بہت گورے رنگ کی ایک قبول صورت خاتون نے میرے برابر آ کر مجھ سے انگریزی میں پوچھا:

''دہلی والی فلائٹ کی طرف جا رہے ہیں؟''

''جی۔''

''صحیح وقت پر ہے؟''

''بتایا تو یہی گیا ہے۔'' پھر میرے پوچھے بغیر انہوں نے بتایا: ''میں بھی دہلی جا رہی ہوں۔ یہاں کراچی میں ایک فیشن شو کرانا ہے۔'' یہ بتا کر بولیں: ''پچھلی بار ویزا انہیں مل سکا، اس بار ملا ہے۔ اسی شو کے سلسلے میں وہاں کے لوگوں سے بات کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر پوچھا: ''وہاں موسم کیسا ہے؟''

''خوش گوار۔''

پھر وہ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی مجھ سے بہت آگے نکل گئیں اور جب میں وہاں پہنچا

جہاں سے آگے جا کر جہاز میں بیٹھنا تھا تو دیکھا کہ وہ ایک کرسی پر بیٹھی ہاتھوں میں وقت گزاری والا ایک بہت ضخیم ناول لیے اس کی ورق گردانی کر رہی ہیں۔ میں وہاں تھوڑی ہی دیر بیٹھا تھا کہ جہاز میں بیٹھنے کی پکار ہوئی۔ میں اٹھ کر مسافروں کی قطار میں کھڑا ہوا اور اپنا پروانہ دکھا کر جہاز میں جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جہاز کے اڑنے کا اعلان ہوا۔ میں نے اپنی کمر سے پیٹی باندھی اور کرسی سے اپنی پشت لگا کر آنکھ بند کر لی، آنکھ بند کرتے ہی مجھے طرح طرح کے منظر دکھائی دینے لگے: میں نے دیکھا کہ دہلی سے اڑنے والا جہاز کراچی پہنچ گیا ہے۔ میں ہوائی اڈے سے باہر نکل رہا ہوں اور میرے سامنے ایک خوش شکل عورت ہاتھوں میں گلدستہ لیے کھڑی ہے اور مجھے خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ پھر دیکھا کہ میں چھوڑے ہوئے شہر میں اپنی پہلی جائے قیام کے عقبی حصے میں کھڑا سمندر میں لنگر ڈالے ہوئے جہازوں کو دیکھ رہا ہوں اور اُن گھنے درختوں کو جن کی جھکی ہوئی شاخیں ٹھہرے ہوئے پانی کو چوم رہی ہیں۔ پھر میرے سامنے حبیب یونیورسٹی کی وسیع و عریض عمارت آ گئی، میں اس عمارت کے زینوں پر چڑھ رہا ہوں اور اس کے چبوتروں پر کھڑا نشیب کے منظروں کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر مجھے وہ سن رسیدہ عورت نظر آئی جو بہت دیر تک مجھے گلے لگا کر اپنی آنکھ نم کرتی رہی تھی۔ پھر یونانی خطوط والا چہرہ دکھائی دیا اور اسی کے ساتھ ایک عالمِ دین کے دروازے کے باہر کھڑا گھنی مونچھوں والا وہ افغان محافظ جس نے ہم سے آنکھیں چار ہوتے ہی خودکار بندوق کو اپنے کاندھے پر سنبھال لیا تھا۔ منظر بدلتے گئے اور میں انہیں دیکھتا گیا۔ اب میں نے دیکھا کہ میں 'گل رنگ' میں ہوں جہاں صاحبانِ حرف و قلم ایک دوسرے سے محوِ گفتگو ہیں اور ان کی سرگوشیاں میری سماعتوں میں گونج رہی ہیں اور اسی کے بعد مجھے وہ شامیانہ دکھائی دیا جس میں نور کی موجیں رواں ہیں اور جس کی فضا خوش قامتوں کی خوشبوؤں سے معطر ہے۔ پھر مجھے وہ جلسہ گاہ دکھائی دی جہاں تین دن تک لفظ و معنی کے ارتعاشات نئی دنیاؤں کو روشن کرتے رہے۔ اُسی جلسہ گاہ میں نسیم نازش کے روئے روشن پر مجھے ناگواری کی وہ لہر دکھائی دی جس نے کچھ دیر کے لیے ان کو محزون و ملول کر دیا تھا۔ اور اسی جلسہ گاہ کے باہر کچھ دور پر مجھے ہاتھ میں دھاگا باندھے اور ماتھے پر بندیا لگائے لکشمی نام کی وہ عورت نظر آئی جسے آتے جاتے میں نمستے کرتا اور وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کا جواب دیتی۔ پھر

میں عسکری-۴ میں آ گیا، حیدر ولا، شعیب کی جائے رہائش۔ کبھی وہاں سے نکل رہا ہوں کبھی اس میں داخل ہو رہا ہوں۔ پھر مجھے شعیب کے دفتر میں بیٹھی وہ خوبرو خاتون نظر آئیں جو بڑی روانی سے انگریزی بول کر شعیب کو شیشے میں اتار رہی تھیں۔

انجمن کا دفتر، دانشگاہِ کراچی، ہوٹل کلاچی یہ سب اپنے سارے منظروں کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آتے گئے۔ پھر میں نے فراست کا وہ کتاب خانہ دیکھا جہاں میں کتابیں کھول کھول کر دیکھ رہا ہوں اور ان کے بیٹے ہانی سے باتیں کر رہا ہوں۔ یونین کلب، مشتاق یوسفی کا پہلو، احمد شاہ اور ان کی اہلیہ، فاطمہ حسن کی سیاہ ساری، اسلم فرخی کے ہونٹوں کو پونچھتا ہوا آصف کا رومال .....سب مجھے دکھائی دیتے رہے۔ عذرا عباس کا خانۂ جمال اور ان کا خوش رنگ سگِ خوش خصال بہت دیر تک میری نگاہ میں آتے رہے۔ جہاز بہت اونچائی پر آ گیا تھا، اس کا عملہ مسافروں کے بیچ آ رہا تھا جا رہا تھا، کیبن کھل رہے تھے بند ہو رہے تھے لیکن میں نے اپنی آنکھ نہیں کھولی۔ مسافروں کی تواضع پر مامور خواتین نے بھی میرے اس عمل میں خلل نہیں ڈالا۔

ان منظروں کا سلسلہ ختم ہوا تو نہاں خانۂ ذہن میں ایک روزن کھلا اور تب مجھے صوفیہ اور پنو یاد آئے۔ صوفیہ اسی شہر میں تھی جہاں میں گیا تھا لیکن میں اسے نہیں دیکھ سکا۔ میں وہ جگہ بھی نہیں دیکھ سکا جہاں پنو کے جسم پر جان لیوا زخم لگا تھا۔ میں حکیم صاحب عالم کی چھوٹی بیٹی کو دیکھنے کی شدید آرزو دل میں لے کر کراچی آیا تھا لیکن اُن تک نہیں پہنچ سکا۔ ان سے ملتا تو انہیں اپنی ماں کی علالت اور ان کی موت کا حال بتاتا۔ میں اپنی ماں کی بہت عزیز سہیلی کی بیٹی شمے کا ٹھکانہ بھی نہیں معلوم کر سکا اور کوئی مجھے یہ بھی نہیں بتا سکا کہ افروز، آصف اور رعنا کی اقامت کراچی میں کہاں ہے۔ چار دن تک آرٹس کاؤنسل میں صبح و شام رہنے کے باوجود میں نہیں جان سکا کہ آصف کی بڑی بہن افروز جنہوں نے مصوری میں بڑا نام پیدا کیا، کراچی میں کہاں مل سکتی ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں رات رات بھر بیٹھ کر فراست کے ساتھ پرانی یادیں تازہ کروں گا، لیکن ایسا نہیں کر سکا:

ع جی کی جی میں رہی کچھ بات نہ ہونے پائی

اور میں نیرّ مسعود کی بیمار بہن برجیس بانو (جون کے مہینے میں ان کا انتقال ہو گیا) کی عیادت کو بھی

نہیں جا سکا۔ میں اپنے مکان کے پہلو میں رہنے والی اپنے زمانے کی مشہور فلمی اداکارہ ریحانہ کا گھر بھی نہیں تلاش کر سکا جو پاکستان بننے کے چند سال بعد ہی کراچی آ گئی تھیں۔ میں ان سب کو دیکھنے، ان سب سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ دہلی ہوائی اڈے پر میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی خاتون نے اپنے شہر کے بارے میں صحیح کہا تھا: ''فاصلے بہت ہیں، بہت بڑا شہر ہے۔'' نہ مل پانے والے لوگ...... مجھے یاد آتے رہے، بہت دیر تک یاد آتے رہے۔ کراچی میں اپنی دن رات کی مصروفیت کی وجہ سے مجھے ان سب تک نہ پہنچ پانے کا ملال تھا۔ میں نے خود سے کہا:

ع ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا

پھر سوچا: یہ سب مجھے کیوں یاد آ رہے ہیں۔ سندھی لڑکا امیش لدھانی، دانش گاہِ کراچی کا طالب علم عون عباس، شعیب کے دفتر والی ادیبہ خان، کرنسی بدلنے والی جگہ کی تیز دست اور شائستہ کلام لڑکی۔ بہت ٹھنڈی اسپرائٹ پیتا ہوا ہانی.... یہ سب میرے حافظے میں کیوں لپک رہے ہیں۔ بڑی مہارت کے ساتھ آٹو رکشا چلانے والا وہ بھولا پٹھان بچہ، جس کے رکشے پر میں تھوڑی ہی دیر کے لیے بیٹھا تھا، میری آنکھوں میں کیوں چمک رہا ہے۔

''خواتین وحضرات! کچھ ہی دیر میں ہمارا جہاز دہلی کے ہوائی اڈے پر اترنے والا ہے۔ دہلی میں اس وقت موسم صاف ہے، درجۂ حرارت اتنا ہے اور وقت یہ ہے۔''

یہ اعلان سن کر بہت دیر سے بند میری آنکھ کھل گئی۔ چند ساعتوں بعد جہاز نے ہوائی پٹی کو چھوا، پھر اس کی رفتار دھیمی ہوئی، پھر وہ ایک مقام پر آ کر ٹھہر گیا۔ میں نے کمر سے کسی ہوئی پیٹی کھولی، کیبن سے اپنا بیگ نکالا اور طیارے کا دروازہ کھلتے ہی مسافروں کے ساتھ نیچے اتر آیا۔

میں نے ڈوبتے ہوئے تاروں میں کراچی کی سرزمین کو چھوڑا تھا اور جب دہلی کی خاک پر قدم رکھا تو سورج میرے سر پر چمک رہا تھا۔ میں ہوائی اڈے سے باہر نکل کر چند گھنٹے دہلی میں رکنے کے بعد اپنے شہر کے لیے روانہ ہو گیا۔ رات بھر کے سفر میں نیند کا ایک بھی جھونکا میری آنکھوں سے ہو کر نہیں گزرا۔ کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ صبح جب سورج پوری طرح نکل چکا تھا، میں اُسی شہرِ افسوس میں آ گیا جہاں سے بیس دن پہلے شہرِ مراد کے سفر پر نکلا تھا۔ اپنے

ٹھکانے پر سامانِ سفر اتارتے وقت میں نے سوچا:

''بہت پہلے ساٹھ کے دہے میں ایک مکان کے سارے لوگ رنگا اماں
کہی جانے والی جس بوڑھی گراں گوش عورت کو اکیلا چھوڑ کر چلے
گئے تھے اگر آج وہ زندہ ہوتی تو مجھ سے پوچھتی:

''کہاں گئے تھے؟''

میں اسے بہت اونچی آواز میں بتاتا: ''وہاں جہاں سے کچھ لوگ برسوں اور سالوں بعد، کبھی کبھی چلے آتے ہیں اور کچھ لوگ.... کبھی نہیں آتے۔''

☆☆☆

مصنف کی دوسری تصنیفات

• اردو غزل میں علامت نگاری			(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
• یگانہ	:	انتخاب	(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
• قائم چاند پوری	:	انتخاب	(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
• ادب کی باتیں	:		تنقیدی مضامین
• کوے اور کالا پانی (ترجمہ)	:		نرمل ورما، بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی
• مسعود حسن رضوی ادیب (مونوگراف)	:		بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
• بحث و تنقید	:		تنقیدی مضامین
• غزل کا نیا علامتی نظام	:		(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
• روحِ انیس	:		مسعود حسن رضوی ادیب
تصحیح و ترتیب و پیش گفتار	:		بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
• خوشبوے خاک	:		رپورتاژ

زیر اشاعت

• کتبے پڑھنے والے	:	افسانے
• شہر عدم رفتگاں	:	شاعری
• جدید مغربی مصنفین		